مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۱۹۳

پرتھی راج راسا

مطالب و تنقید و تبصرہ

از

پروفیسر محمود خان شیرانی

شائع کردہ
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۳ء قیمت مجلد للعہ ۱۲/ بلا جلد عہ ۱۲/

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو نمبر ۱۹۳

پرتھی راج راسا

(مطالب و تنقید و تبصرہ)

از

پروفیسر محمود خان شیرانی

شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو ہند۔ دہلی

پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۴۳ء قیمت مجلد للعہ ۱۲/ بلا جلد ۱۲/

فہرست پرتھی راج راسا

راسا اُن خوش قسمت مگر جعلی کتابوں میں سے ہی جو اپنے بعض گوناگوں مفروضہ اوصاف کی بنا پر دنیا سے عرصے تک خراج تاثیر و تحسین وصول کرتی رہی ہی اور زمانۂ تصنیف سے لے کر اب تک عوام الناس کے دلوں پر اپنے اقتدار کا سکہ جمائے ہوئے ہی۔ اس کے پرستار اس کو ایک صحیفۂ آسمانی سے کم درجہ نہیں دیتے ۔ کوئی اس کی قدامت پر مفتون ہے ۔ کوئی اس کی شاعری پر اور کوئی اس کے تاریخی مواد پر۔ یوں تو ہر قوم اور زبان میں مجہول کتابوں کا کچھ نہ کچھ سرمایہ پایا جاتا ہی۔ مگر ان کا عام اثر نہایت خفیف اور غیر محسوس ہوا کرتا ہی۔ راسا ان میں ایک واحد استثنا پیش کرتی ہی۔ جس نے ایک طرف نقادین کو دوسری طرف مورخین کو اور تیسری طرف ماہران لسانیات کو عرصے تک اپنی فریب کاری کا شکار بنائے رکھا۔ عوام درکنار خواص اور محققین پر بھی

اُس کا جادو چلا۔ ہندو جن کے ہاں اُس نے جنم لیا سدا سے اس کے پرستار رہے۔ گذشتہ صدی سے اہل مغرب اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور بھی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دست و قلم سے اس کی شہرت کو بال پرواز دیے لیکن تعجب ہے کہ مسلمان جن کی بے غیرتی اور بزدلی کی افسانہ خوانی راسا کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس کے مطالب سے ناآشنائی کے باوجود اس کے غائبانہ معتقدین میں شامل ہیں۔

راسا کے لیے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ چند بردائی کی تصنیف ہے جو پرتھی راج کے عہد کا کوی تھا۔ اسی بنا پر دیسی زبانوں میں اس کو سب سے قدیم کتاب کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے راجپوتانے کے اکثر راجپوت خاندانوں کے زمانہ اور نسب کے سلسلے میں وہ ایک نہایت قدیم ماخذ تسلیم کی جاتی ہے۔ بلکہ والیان اُدے پور، جودھ پور، جے پور، بوندی وسروہی اس کے اعتبار پر اپنے اسلاف کا زمانۂ حیات و ممات متعین کرتے ہیں۔ راسا کا موضوعِ خاص اگرچہ پرتھی راج والیٔ اجمیر و دہلی کے سوانح حیات و جنگی کارناموں کا تذکرہ بیان کرنا ہے۔ لیکن شہاب الدین کے ساتھ پرتھی راج کی جنگوں میں ان والیان ریاست کے اسلاف بھی پرتھی راج کے معاون و شریک کار بتائے گئے ہیں مثلاً راول سمر سنگھ والیٔ میواڑ بڑی لڑائی میں جو پرتھی راج اور شہاب الدین کی آخری جنگ کا نام ہے۔ مارا جاتا ہے۔ پجون راؤ والیان آمیر و جے پور کا مورث اعلیٰ بھی پرتھی راج کی جنگوں میں حصہ لیتا ہے

اس لئے جے پور کے مورخین نے اپنی تاریخیں راسا کے بیانات کی روشنی میں تیار کی ہیں یہی حالت جودھ پور، بوندی و سروہی اور جیسلمیر کی تاریخوں کی ہے جن کی بنیاد اسی کتاب کے بیانات پر ڈالی گئی ہے۔ قصہ مختصر پرتھی راج راسا اس طرح راجپوتانے کے والیان ملک کی تاریخ کا عام ماخذ اور سرچشمہ بن جاتا ہے۔

مغربی مصنفین میں اس کتاب کو بے اندازہ وقعت حاصل رہی ہے گزشتہ صدی کے اکثر مورخین ہندوؤں خصوصاً راجپوتوں کی تاریخ کے سلسلے میں اسی کے خرمن سے خوشہ چینی کرتے رہے۔ ٹاڈ نے اسی کے مواد پر اپنی تاریخ راجستان کی بنیاد ڈالی۔ گروز، بیمز اور ہرنلے لسانیات کے سلسلے میں اس کو نہایت اہم ماخذ سمجھتے رہے ورنیکلر ادبیات میں گریرسن اس کے شاعرانہ محاسن کا ثنا خواں ہے اس کی گوناگوں اہمیت کا اندازہ کر کے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کی طباعت شروع کر دی اور ایک تہائی حصہ اپنی سیریز میں شائع بھی کر دیا۔ مسلمانوں نے اس کے ساتھ بہت کم اعتنا کی۔ لیکن مولانا محمد حسین آزاد نے قصص ہند وغیرہ میں سب سے پہلا اس کے بعض مطالب کی اشاعت کی ہے اور اردو زبان کی تاریخ میں سب سے قدیم دستاویز کی حیثیت سے جگہ دی ہے۔

چونکہ یہ کتاب نہایت مقبول رہی اور اس کی داستانوں کے تراجم کثرت کے ساتھ اہل مغرب کے قلم سے علمی رسالوں میں شائع ہوتے رہے حتیٰ کہ بیمز نے اس کے قواعد صرف و نحو بھی شائع کر دیے۔ لیکن اس سال کو براج سشیامل داس نے

ایک محققانہ وعالمانہ مضمون لکھ کر جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالے میں طبع ہوا ہے۔ راسا کے مطالعے کی تاریخ میں ایک تغیر عظیم پیدا کر دیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ راسا ایک جعلی تصنیف ہے جو سترھویں صدی کے وسط میں کسی وقت لکھی گئی۔ اس انقلابی مضمون نے راسا کے معتقدین کی صف میں غم و غصّے کی لہر دوڑا دی۔ اس کا جواب موہن لال وشنو لال پنڈیا نے ایک علیحدہ رسالے میں بزبان ہندی دیا جو ۱۸۸۷ء میں میڈیکل ہال پریس بنارس سے شایع ہوا۔ اسی رسالے کے ضروری مطالب پنڈیا جی نے اپنے مرتبہ پرتھی راج راسا کے ابتدائی حصے میں جو ناگری پرچارنی گرنتھ مالا کے سلسلے میں شایع ہوا ہے شامل کر دیے۔ ۱۸۹۳ء میں ڈاکٹر بیولر نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سکرٹری کے نام ایک خط لکھا جس میں انھوں نے کشمیر سے ایک تازہ دریافت شدہ سنسکرت تالیف پرتھی راج وجے نامی کے مطالب کی بنا پر راسا کی اصلیت سے صریح انکار کر دیا بلکہ مشورہ دیا کہ سوسائٹی کو اس کتاب کی اشاعت بند کر دینی چاہیے۔ اِدھر مسٹر شیام سُندر داس سکرٹری ناگری پرچارنی سبھا نے "تلاش ہندی مخطوطات" کی سالانہ رپورٹ میں (بابت ۱۹۰۰ء) ایک بظاہر مدلل اور پراز معلومات تبصرہ راسا کی حمایت میں لکھا جس سے راسا کے مغربی معتقدین میں حوصلے کے آثار پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ اس مضمون کی صدائے بازگشت رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں (بابت ۱۹۰۶ء) نیز ونسنٹ اسمتھ کی تاریخ ہندستان میں نظر آتی ہے۔ ۱۹۲۸ء کے رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، شاخ بمبئی میں (جلد سوم) ۔۔۔۔ بہادر نائب

کیوریٹر راجپوتانہ میوزیم اجمیر نے اپنے مضمون میں راسا کی تاریخوں کی عالمانہ انداز میں تغلیط ثابت کی۔ اسی سال ناگری پرچارنی پتر کا جلد نہم میں پنڈت رام چندر شکل نے ایک اور مضمون راسا کی مخالفت میں سپرد قلم کیا جو زیادہ تر اس کے لسانی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اسی رسالے میں ایک اور سیر حاصل مضمون رائے بہادر پنڈت گوری شنکر اوجھا کے قلم سے نکلا جس میں ہر پہلو سے راسا کی تغلیط و تردید کی گئی اور اس کی مصنوعی ہستی کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا۔

اب تک جس قدر کام ہوا، ہندو تاریخ و ادب کی رو سے ہوا کیوں کہ مضمون نگار زیادہ تر سنسکرت داں طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اسی لئے اس تمام بحث و مباحثے میں اسلامی تاریخ سے بہت کم اعتنا کی گئی۔ کویراج جی نے البتہ اسلامی تاریخ سے مدد لی بلکہ اسی کی روشنی میں انھوں نے راسا کی تاریخوں کو غلط ثابت کیا باقیوں نے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا بلکہ راسا کے مرتبین نے تو راسا کے بیانات کے استناد پر مسلمان مورخین کو مطعون کیا کہ انھوں نے سلطان شہاب الدین کی زندگی کے ایسے تاریک پہلوؤں کو جو اس کے خلاف جاتے تھے قلم انداز کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہمیں بھی رائے زنی کا حق ہے کیونکہ پرتھی راج کے بعد اس کا حریف سلطان شہاب الدین ہی وہ شخص ہے جس کا مذکور راسا میں بکثرت آتا ہے۔ دوسرے اردو زبان کی تاریخ کے سلسلے میں ہمارے اہل قلم ابھی تک راسا کو سب سے

قدیم دستاویز مان رہے ہیں۔ اس مغالطے کا رفع کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ تیسرے تنقید کے بعض ایسے پہلو ہیں جو اب تک روشنی میں نہیں آئے ہیں اور ان کا منظرِ عام پر لایا جانا بھی مناسب ہے۔ مزید براں اُردو خواں طبقہ اب تک راسا کے مطالب سے بالعموم ناواقف رہا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ان کو بھی اس کے مضامین سے کسی قدر آشنا کیا جائے۔

یہ ادبی تفنن جو ابتدا میں کسی معمولی علمیت کے بھاٹ نے محض ذاتی جلب منفعت کے خیال سے راجپوتانے کے کسی راجہ کو اپنے دام تزویر میں لانے کی امید میں کیا تھا اور انجام کار مغرب کے بڑے بڑے علمار کو جن کے نام تاریخ و لسانیات میں ادب سے لیے جاتے ہیں کامل طور پر گمراہ کرنے میں کامیاب ہوا مضحکہ کا ایسا شاندار پہلو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تالیف کو بحیثیت کتاب تاریخ تسلیم کرنا ایک عظیم الشان غلطی تھی جو ہمیشہ قابل افسوس رہے گی۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ افسانہ کی ایک شاخ وہ بھی ہے جس میں تاریخی اشخاص کے گرد فرضی اور خیالی واقعات کی عظیم الشان تعمیر کھڑی کر دی جاتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے ہاں داستان امیر حمزہ[1] ہے جس میں تاریخی حصہ اسی قدر ہے کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب

---

[1] ہمیں کوئی تعجب نہ ہوگا اگر راسا داستان امیر حمزہ کی تقلید میں لکھا گیا ہو۔ اتحاد مضمون کے علاوہ ان کے داستانوں کی تعداد کا برابر

ہمارے پیشوائے دین کے عم نامدار تھے اور جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

تاریخی واقعات کی اس نازک اساس پر داستان امیر حمزہ تعمیر پائی ہے جو ایک اور پر ستر داستانوں پر شامل ہے۔ اس کے ساتھ بعد کی داستانیں جو انہی کی شاخیں ہیں اور لکھنؤ میں گزشتہ صدی میں وجود میں آئی ہیں شامل کر لی جائیں تو ان کی تعداد ایک سو

ہونا واقعی حیرت انگیز ہے۔ میں نے بعض اصحاب کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اکبر کے عہد میں جب ہندو رانیاں شاہی محل میں پہنچیں۔ مہابھارت کے جواب میں مسلمانوں نے داستان امیر حمزہ تیار کی لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے داستان حمزہ نہ ہندوستان کی تالیف ہے نہ اکبر کے عہد سے تعلق رکھتی ہے بلکہ ایک قدیم تصنیف ہے جو پُرانی روایت کے مطابق سلطان محمود غزنوی کے واسطے لکھی گئی تھی۔ ہم اس روایت کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ داستان بہت قدیم ہے۔ ابتداءً "اسمار حمزہ" کے نام سے موسوم تھی۔ کسی نامعلوم عربی اصل سے الف لیلہ اور دیگر قدیم افسانوں کی طرح وقتاً فوقتاً ایران، ترکی اور ہندوستان میں اس کی مختلف اشاعتیں تیار ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں اس کی ایک قدیم اشاعت جو میری نظر سے گزری ہے یقیناً آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ بحر السعادت (تالیف قرن ہشتم) میں اس قصہ کی صحت سے انکار کیا ہے اور ابوالمعالی کو اس کا مصنف بتایا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی اور واقعات بابری میں داستان حمزہ کا نام لیا گیا ہے۔

جلدوں کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص داستان امیر حمزہ کو صحیح تاریخ سمجھے تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ ٹھیک یہی کیفیت پرتھی راج راسا کی ہے۔ پرتھی راج اور سلطان معزالدین محمد بن سام

اکبر کے عہد میں اس کے بعض مصور اور پُرتکلف نسخے تیار ہوئے ہیں ان میں سے ایک کپڑے پر لکھا گیا تھا۔ آئین اکبری میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس کے دو تین ورق وکٹوریا البرٹ میوزیم لندن میں میری نظر سے گزرے ہیں۔

فان ہیمر کی تاریخ حشیشین صفحہ ۳۱۹، ترجمہ فرانسیسی، طبع ۱۸۳۳ء کی رو سے حمزہ نامہ ایک تقلیدی تالیف ٹھہرتی ہے جو شام کے باطنیوں کے بطل اعظم حمزہ نامی والیٔ قلعۂ شیون کے شجاعانہ کارناموں کے تتبع میں تیار ہوئی ہے۔ قلعۂ شیون کے ذکر میں مؤرخ موصوف لکھتا ہے:۔

"اس آخری زمانے میں قلعۂ شیون ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا جو ایک چٹان پر واقع تھا اور انطاکیہ سے ایک روز کی مسافت پر تھا۔ اس قلعے کی شہرت کی ایک اور وجہ اس کے قلعہ دار حمزہ کے کارناموں کی بنا پر تھی جو شام کے اسمٰعیلیوں کا ایک ہیرو تھا۔ اس حمزہ کو اس کے ہم نام حضرت حمزہ عم رسول کے ساتھ خبط نہ کرنا چاہیے نہ اس کے ساتھ جو دروزی فرقے کا بانی تھا۔ حشیشین کی بے شمار جنگیں اور معرکے اور ان کا شجاعانہ مقابلہ جو انھوں نے صلیبی مجاہدین اور سلطان بیبرس ۶۵۸ھ و ۶۷۶ھ کے لشکر کا کیا نیز دیگر واقعات جو قریباً افسانوی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے ان کی تاریخ بکثرت پُر ہے، راویوں اور داستان گویوں کے واسطے ایک بڑا ماخذ بن گئے ہیں جس سے انھوں نے

تاریخی شخصیتیں ہیں۔ ان میں آپس میں ترائن پر دو جنگیں ہوئیں۔ پہلی میں معزالدین کو شکست اور دوسری میں فتح ہوئی اور پرتھی راج مارا گیا۔ اس قلیل تاریخی سرمائے پر پرتھی راج راسا کی ایک کم ستّر داستانیں تعمیر پاتی ہیں۔ ضرورتاً اس میں اور افراد قدیم و

پورا پورا فایدہ اُٹھایا ہے۔ اسی کے اثر میں حمزہ نامے مرتّب ہوئے جو ایک قسم کی شجاعت کے افسانے ہیں اور عنتر اور ذوالہمت اور بنی ہلال کی داستانوں کے نمونے پر تیار ہوئے۔ جب آل عثمان نے ملک شام فتح کرلیا۔ حمزہ کے کارناموں کی روایت عرب راویوں اور قہوہ خانوں کے داستان گویوں کی معرفت ترکوں میں رواج پاگئی اور متعدد افسانوں کا موضوع بن گئی جس طرح اور زبانوں میں سیدی بطّال کی داستانیں رواج میں آئیں جو ایک عرب ہیرو تھا اور خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں قسطنطنیہ کے محاصرے میں رومیوں سے جنگ کرتا ہوا شہید ہوا تھا۔" (ترجمہ از مرزا محمد سعید آئی۔ ای۔ ایس)

ہم اس قدر اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ عربوں میں ایسے تاریخی و غیر تاریخی افسانوں کا بکثرت رواج رہا ہے حتّٰی کہ مذکورالصدر سلطان بیبرس بھی اسی قسم کی داستانوں کا موضوع بن گیا ہے۔ عم رسول کی تاریخی عظمت اور ان کی درد انگیز شہادت پر نظر رکھتے ہوئے ان کا ایسے افسانوں کا ہیرو بن جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہمارے نزدیک اسمار حمزہ ایک اصلی کارنامہ ہے نہ تقلیدی افسانہ۔ اس تالیف میں جس قدر تاریخی اشخاص مذکور ہوئے ہیں سب کے سب عہد

جدید شامل کر لیے گئے ہیں جن میں بعض تاریخی ہیں ورنہ اکثر فرضی ہیں چونکہ راسا کے مصنف کو پرتھی راج کے زمانے کا صحیح علم نہیں تھا، اس لیے اس نے اپنے قیاس کے مطابق پرتھی راج کو اصلی زمانے سے نوے سال اقدم فرض کر لیا چنانچہ یہ فاحش غلطی ان تمام سنوں میں موجود ہی جو راسا میں دیے گئے ہیں۔

اب ہم اصل مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں اور سہولت کی غرض سے اس کو تین حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصّے میں راسا کے مطالب کا بیان اور بعض داستانوں کا مختصر خاکہ دیا جاتا ہی جس سے ہمارے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کے مضامین کی حامل ہی؟ دوسرے حصّے میں راسا پر تنقید ہی اور تیسرے حصّے میں راسا کے عام مطالعے پر ایک تفصیلی تبصرہ ہی۔ جو مغربی اہل قلم اور ہند و فضلا کی آرا کا خلاصہ ہی۔

ابتدائے اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر باطنیوں کے حمزہ کے واقعات داستان حمزہ میں منتقل کر دیئے جاتے تو صورت حالات بالکل مختلف ہوتی۔

۱۔ مطالب

فہرست مضامین

منتر سکھاتا ہے۔

۷۔ناہر رای کتھا:۔ ناہر راے نے پرتھی راج کو اپنی دختر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وعدہ خلافی پر پرتھی راج اس سے جنگ کرتا ہے۔

۸۔ میواتی مُگل (مغل) کتھا:۔ میواتیوں سے جنگ۔

۹۔حسین کتھا:۔ حسین شہاب الدین کا ایک سردار پرتھی راج کے ہاں پناہ گزیں ہوتا ہے۔ شہاب الدین اس کی طلب میں پرتھی راج سے جنگ کرتا ہے اور گرفتار ہوتا ہے۔ حسین میدان جنگ میں مارا جاتا ہے۔ آخر میں شہاب الدین کی رہائی۔

۱۰۔ اکھیٹک چوک ورنن:۔ پرتھی راج اپنے چند سرداروں کے ساتھ کھٹو بن میں مصروف شکار ہے۔ شہاب الدین اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ مگر شکست کھاتا ہے۔

۱۱۔ چترریکھا سمے:۔ چترریکھا عرب خاں عرب پتی (شاہ عرب) کے پاس تھی۔ شہاب الدین جنگ کی دھمکی دے کر اس نازنین کو اس سے طلب کرتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ بالآخر حسین خاں مذکور الصدر اسے لے بھاگتا ہے۔

۱۲۔ بھولا راے سمے:۔ بھیم دیو کا قاصد شہاب الدین کے دربار میں مارا جاتا ہے۔ بھیم دیو شاہ پر چڑھائی کرتا ہے۔ پرتھی راج مداخلت کرتا ہے اور اپنی فوج کے دو حصے کرکے ایک حصہ شاہ کے خلاف اور دوسرا حصہ بھیم دیو کے خلاف برائے جنگ روانہ کرتا ہے۔ کیماس اس حصہ کا سپہ سالار تھا اس

پر جادو کیا جاتا ہے اور ناگور پر بھیم دیو کا قبضہ ہو جاتا ہے

۱۳- سلکھ جدھ سمے :- یہ گزشتہ داستان کا بقیہ ہے۔ شہاب الدین تین لاکھ لشکر کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔ پرتھی راج مدافعت کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ گرو رام کے منتر سے ملیچھوں کو شکست ہوتی ہے اور سلکھ سلطان کو قید کر لیتا ہے۔

۱۴- اچھنی دیاہ (بیاہ) :- اچھنی سے پرتھی راج کی شادی۔

۱۵- مگل (مغل) جدھ :- مغلوں سے پرتھی راج کی جنگ۔

۱۶- پنڈیر داہمی دیاہ :- داہمی دختر چند سین پنڈیر سے پرتھی راج کا بیاہ۔

۱۷- بھومی سپن :- پرتھی راج شکار میں شیر مار کر ایک درخت کے سایے میں ٹھہرتا ہے۔ خواب میں دیوی آکر اسے خبر دیتی ہے کہ کھٹو بن میں ایک بڑا خزانہ مدفون ہے۔

۱۸- دلی دان پرستاو :- انگ پال تنور اپنے نواسے پرتھی راج کو دان میں دلی عنایت کرتا ہے۔

۱۹- مادھو بھاٹ کتھا :- مادھو بھاٹ دلی سے رخصت ہو کر شہاب الدین کو دلی کے تازہ حالات سے باخبر کرتا ہے۔ شاہ نئی فوج کشی کرتا ہے۔ جنگ میں تتار خاں مارا جاتا ہے اور شاہ کو شکست ہوتی ہے۔ چامنڈ رائے شہاب الدین کو اسیر کر لیتا ہے۔

۲۰- پدماوتی دیاہ :- سمودر شکھر گڈھ کے جادو بنسی راو جے پال کے کنور پدم سین کی دختر پدماوتی ایک طوطے سے پرتھی راج کے حالات سن کر اس پر نادیدہ عاشق ہو جاتی ہے اور طوطے کے

ذریعے سے پرتھی راج کے پاس پیام محبت بھیجتی ہے۔ پرتھی راج اس کو لانے کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ شہاب الدین سدِ راہ ہوتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ پدماوتی سے پرتھی راج کا بیاہ ہو جاتا ہے۔

۲۱- پرتھا بیاہ :- پرتھا ہمشیرہ پرتھی راج کا راول سمر سنگھ والی چتوڑ سے بیاہ۔

۲۲- ہولی کتھا :- ہولی کا بیان۔

۲۳- دیپ مالا کتھا :- دوالی کے تہوار کا بیان۔

۲۴- دھن کتھا :- کھٹو بن میں پرتھی راج کو ایک دفینے کا پتا لگتا ہے۔ جب راجا اسے نکالنا چاہتا ہے سلطان اس پر حملہ کر دیتا ہے، آخر میں شاہ گرفتار ہو کر رہائی پاتا ہے۔

۲۵- ششی ورتا :- پرتھی راج دیوگیری کے راجہ کمدھج کی کنیا کو بھگا لے جاتا ہے۔ آخر میں کمدھج سے جنگ ہوتی ہے۔

۲۶- دیوگیری سمے :- جے چند دیوگیری کا محاصرہ کرتا ہے۔ پرتھی راج کا ایک سردار چامنڈ رائے اس کو شکست دیتا ہے۔

۲۷- ریوا تٹ سمے :- ریوا کے کنارے پر سلطان سے جنگ۔

۲۸- اننگ پال سمے :- اننگ پال اہل دہلی کی شکایت پر پرتھی راج سے دلی واپس مانگتا ہے۔ جنگ ہوتی ہے۔ شہاب الدین امداد کے لیے آتا ہے اور گرفتار ہوتا ہے۔

۲۹- گھگھر کی لڑائی :- دریائے گھگر پر شاہ سے جنگ۔

۳۰- کرناٹی ودھ :- پرتھی راج دکن سے کرناٹا دیس جاتا ہے۔

۳۱- پیپا جدھ :- پیپ پڑھیار جنگ میں سلطان کو قید کرتا ہے۔

۳۲- کرہے رو جدھ :- راول جی کی مدد کو پرتھی راج چتوڑ جاتا ہے چالکیہ سے جنگ۔

۳۳- اندراوتی دیاہ :- اندراوتی سے بیاہ۔ اس داستان کا دوسرا نام سمرسی راجہ ہے۔

۳۴- جیت راو جدھ سمے :- کھٹو بن میں پرتھی راج شکار کھیل رہا ہے۔ سلطان اس پر اچانک حملہ کرتا ہے۔ جیت راؤ اسے گرفتار کرلیتا ہے۔

۳۵- کانگڑا جدھ :- پرتھی راج قلعۂ کانگڑا پر قبضہ کرتا ہے۔

۳۶- ہنساوتی دیاہ :- ہنساوتی سے پرتھی راج کی شادی اور سلطان کی شکست۔

۳۷- پہاڑ رائے سمے :- پرتھی راج اور شہاب الدین میں جنگ۔ پہاڑ رائے سلطان کو قید کرلیتا ہے۔

۳۸- برن کتھا :- چاند گرہن کے وقت سومیشور اور اس کی فوج کا جمنا کے کنارے جل بیروں کو دیکھ کر بیہوش ہوجانا۔

۳۹- سوم ودھ سمے :- گجرات کا راجہ بھولا بھیم پرتھی راج کے باپ سومیشور کو قتل کر ڈالتا ہے۔

۴۰- پجون چھونگا نام پرستاد :- پجون رائے سات کوس سے دوڑا آکر چالکیہ کی بھری فوج میں سے اپنا چابک اٹھالے جاتا ہے۔

۴۱- پجون چالکیہ :- جے چند کے ابھارنے سے بالک رائے سولنکھی اور شہاب الدین دلی پر حملہ کرتے ہیں۔ پجون رائے انھیں شکست دیتا ہے۔

۴۲- چند دوارکا سمے :- چند جاترا کے واسطے دوارکا جاتا ہے۔

۴۳۔ کیماس جدھ ا:۔ پرتھی راج کا وزیر کیماس سلطان کو کھٹو کے جنگل میں گرفتار کرتا ہے۔

۴۴۔ بھیم ودھ سمے :۔ پرتھی راج بھولا بھیم راجۂ گجرات کو اپنے باپ کے قصاص میں قتل کر ڈالتا ہے۔

۴۵۔ سنجوگتا پورو جنم :۔ سنجوگتا کی پیدائش سے قبل کے حالات۔

۴۶۔ ونیا منگل :۔ سنجوگتا دختر جے چند والی قنوج کی ولادت کے حالات۔

۴۷۔ سُک ورنن :۔ پرتھی راج اور سنجوگتا ایک دوسرے کے حالات سُن کر عاشق ہو جاتے ہیں۔

۴۸۔ بالک رائے سمے :۔ پرتھی راج بالک رائے کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کی بیوی جے چند کے ہاں فریادی جاتی ہے۔ جے چند اپنی اور مسلمان فوج پرتھی راج کے خلاف بھیجتا ہے جو شکست کھاتی ہے۔

۴۹۔ یگ جگیہ ودھونس :۔ جے چند کا سنجوگتا کے لیے سویمبر کا ارادہ کرنا۔

۵۰۔ سنجوگتا نام پرستاو :۔ سنجوگتا کا پرتھی راج سے بیاہ کا قول و قرار۔

۵۱۔ ہانسی پرتھم جدھ :۔ ہانسی پر شاہی فوج کا پہلا حملہ۔

۵۲۔ ہانسی دوتیہ جدھ :۔ شہاب الدین بذات خود ہانسی پر حملہ آور ہوتا ہے۔

۵۳۔ پجون ہوبا پرستاو :۔ شاہی فوج کے خلاف پجون ہوبا کی کامیاب مدافعت کرتا ہے۔ مسلمانوں کو شکست ملتی ہے۔

۵۴- پجون پاتساہ جدھ پرستاو:- پجون راے جنگ میں شاہ کو گرفتار کرتا ہے۔

۵۵- سامنت پنگ جدھ:- جے چند کا لشکر دہلی کا محاصرہ کرتا ہے اور ناکام واپس جاتا ہے

۵۶- سمر بنگ جدھ:- جے چند چتوڑ کا محاصرہ کرتا ہے اور راول سمر سنگھ اسے ہزیمت دیتا ہے۔

۵۷- کیماس ودھ:- کیماس کا قتل- کیماس کی کرناٹی رانی سے محبت تھی- ایک رات بھیس بدل کر محل میں گھس گیا اور پرتھی راج نے قتل کر دیا-

۵۸- دُرگا کیدار سمے:- سلطان ایک مرتبہ اور قید کیا جاتا ہے۔

۵۹- دلّی ورنن:- نگمبودھ کے باغ کا ذکر۔

۶۰- جنگم کتھا:- سنجوگتا سوہبر کے وقت پرتھی راج کے سونے کی مورت کو ہار پہنا دیتی ہے اور جے چند ناخوش ہو کر اسے گنگا کے کنارے نکال دیتا ہے۔

۶۱- کنوج سمے:- پرتھی راج کی راجہ جے چند سے جنگ

۶۲- شک چرتر:- رانی اچھنی طوطے کے ذریعے سنجوگتا اور پرتھی راج کے حالات معلوم کرتی ہے۔

۶۳- آکھیٹ چکھ سراپ:- پرتھی راج کو ایک رشی کا سراپ کہ تجھے دشمن اندھا کرے۔

۶۴- دھیر پنڈیر پرستاو:- دھیر پنڈیر پھر سلطان کو اسیر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

۶۵ - ودواہ سمے :- پرتھی راج کی بیویوں کی فہرست۔
۶۶ - بڑی لڑائی روپرستاو :- آخری جنگ جس میں شہاب الدین پرتھی راج کو گرفتار کرتا ہے۔
۶۷ - بان بیدھ :- اندھا پرتھی راج سلطان کو آواز پر تیر سے ہلاک کرتا ہے۔
۶۸ - رین سی نام پرستاو :- نراین سنگھ عرف رین سی خلف پرتھی راج گدی پر بیٹھتا ہے اور بہت جلد بعد مارا جاتا ہے اور دہلی لی جاتی ہے۔
۷۰ - مہوبا سمے :- مرتبین اس داستان کو الحاقی خیال کرتے ہیں اسی لئے انھوں نے اس کو شمار سے خارج کر دیا ہے۔
راسا کی اس فہرست سے جو اوپر درج ہے حسب ذیل داستانیں سلطان شہاب الدین اور مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہیں :-
(۱) میواتی مگل (مغل) کتھا - آٹھویں داستان -
(۲) حسین کتھا - نویں داستان -
(۳) آکھیٹک چوک ورنن - دسویں داستان
(۴) چترریکھا سمے :- گیارھویں داستان
(۵) بھولا راے سمے - بارھویں داستان
(۶) سلکھ جدھ سمے - تیرھویں داستان
(۷) مگل جدھ - پندرھویں داستان -
(۸) مادھو بھاٹ کتھا - انیسویں داستان
(۹) پدماوتی ویاہ - بیسویں داستان -

(۱۰) دھن کتھا ۔ چوبیسویں داستان ۔
(۱۱) ریوانٹ سمے ۔ ستائیسویں داستان ۔
(۱۲) اننگ پال سمے ۔ اٹھائیسویں داستان
(۱۳) گھگھر کی لڑائی ۔ اُنتیسویں داستان
(۱۴) پیپا جدھ ۔ اکتیسویں داستان ۔
(۱۵) جیت راو جدھ سمے چونتیسویں داستان
(۱۶) ہنساوتی دیاہ چھتیسویں داستان ۔
(۱۷) پہاڑ رائے سمے ۔ سینتیسویں داستان ۔
(۱۸) پجّون چالکیہ ۔ اِکتالیسویں داستان ۔
(۱۹) کیماس جدھ ۔ تینتالیسویں داستان ۔
(۲۰) ہانسی پرتھم جدھ ۔ اکاونویں داستان
(۲۱) ہانسی دوتیہ جدھ ۔ باونویں داستان
(۲۲) پجّون مہوبا پرستاو ۔ ترپنویں داستان
(۲۳) پجّون پاتساہ جدھ ۔ چونویں داستان
(۲۴) درگا کیدار سمے ۔ اٹھاونویں داستان ۔
(۲۵) قنوج سمے ۔ اکسٹھویں داستان ۔
(۲۶) دھیر پنڈیر پرستاو ۔ چونسٹھویں داستان
(۲۷) بڑی لڑائی رو پرستاؤ ۔ چھیاسٹھویں داستان ۔
(۲۸) بان بیدھ ۔ سڑسٹھویں داستان
(۲۹) رینسی نام پرستاؤ ۔ اڑسٹھویں داستان
میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ راسا کی تمام داستانوں کا خلاصہ

یہاں درج کروں۔ بلکہ ان میں سے صرف ضروری داستانوں
کی تلخیص جو مرتبین راسا کے بیانات پر مبنی ہے نہایت اختصار کے ساتھ
دی جاتی ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ راسا جہاں تک کہ مسلمانوں
کا تعلق ہے کس قسم کے پوچ و مہمل افسانوں کا حامل ہے۔ ساتھ ہی ناظرین
سے میری یہ استدعا ہے کہ ان افسانوں میں جو آرا دی گئی ہیں
ان کو میری ذاتی رائے نہ سمجھا جائے۔ میرا مقصد ان افسانوں کے
بیان کرنے سے راسا کی غیر تاریخی حیثیت کو طشت از بام کرنا ہے۔

میواتی مگل کتھا

آٹھویں داستان

راجہ سومیشور نے مگل (مغل) رائے کے پاس ایک قاصد بھیجا اور کر (خراج) مانگی چٹھی پڑھ کر مغل راجہ سخت ناراض ہوا اور قاصد کو واپس بھیج دیا۔ اس سلوک پر سومیشور کو طیش آیا اور لشکرکشی کا حکم دیا۔ گھر کی حفاظت کے لیے اپنے فرزند پرتھی راج کو چھوڑ دیا اور خود نے میوات پر چڑھائی کی۔ قاصد دوبارہ اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ یا تو جنگ کرو یا ڈنڈ دو۔ مُغل نے دونوں باپ بیٹوں کے خلاف لڑائی مانگی۔ پرتھی راج یہ خبر پاکر اپنے باپ کے لشکر میں شامل ہونے کی نیت سے روانہ ہوا۔ یہاں آکر اس نے اپنے باپ اور اس کی فوج کو خواب غفلت میں مست پایا۔ بہت برافروختہ ہوا اور اسی عالم میں دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑا۔ کیماس، پٹھان بازید کے مقابل ہُوا۔ تیر۔ تبک اور تلواریں چلنے لگیں۔ پرتھی راج نے غنیم کی فوج میں گھس کر اسے شکست فاش دی۔ بازید پٹھان اور خورسان خاں مارے گئے اور پرتھی راج فتحیاب ہُوا۔

حسین کتھا

نویں داستان

پرتھی راج اور غزنی کے بادشاہ شہاب الدین میں عداوت کی بنا یہ ہوئی کہ شہاب الدین کا ایک بھائی میر حسین شہاب الدین کی پاتر چترریکھا سے محبت رکھتا تھا۔ شہاب الدین کو بھی اس سے محبت تھی مگر چترریکھا میر حسین کو چاہتی تھی جب شاہ کو اس عشق بازی کی اطلاع ہوئی طیش میں آیا اور ان کے تعلقات کو رد کرنے لگا۔ مگر حسین نے شاہ کا حکم نہیں مانا۔ آخر شہاب نے اس سے کہا کہ تم میری عمل داری سے نکل جاؤ۔ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس پر حسین ترک وطن کرکے پرتھی راج کے ہاں پناہ لینے کی نیت سے ناگور چلا آیا۔ پرتھی راج ان دنوں شکار میں تھا حسین نے اپنے ملازم سندر داس کو پرتھی راج کی خدمت میں روانہ کیا اور آپ ایک سایہ دار مقام دیکھ کر خیمہ زن ہوگیا۔ حرم کا خیمہ پیچھے رکھا۔ ادھر سندر داس پرتھی راج کے پاس پہنچا۔ راجہ نے میر حسین کی خیر و عافیت پوچھی سندر نے تمام کیفیت بیان کی۔ راجہ نے کیماس وزیر اور چند پنڈیر سے مشورہ کیا کہ اس حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ دونوں طرح خرابی ہے۔ ادھر بادشاہ کا ڈر ہے۔ ادھر ایک پناہ گزیں کو پناہ نہ دینا دھرم کے خلاف ہے۔ چند نے صلاح دی کہ آپ ضرور پناہ دیں۔

پرتھی راج نے سندر داس سے پوچھا کہ کیا شاہ سے حسین کا جھگڑا ہونے کی بات سچ ہے۔ سُندر داس نے عرض کی کہ ایک حور نژاد پاتر شہاب الدین کے پاس تھی حسین اس کو اپنے ساتھ اُڑا لایا ہے اور آپ کی پناہ میں آیا ہے۔ چند نے پرتھی راج کو بڑھاوے دے کر کہا کہ ارجن جس طرح برہمن بن کر موردھ ج کے ہاں پناہ لینے گیا اور بھگوان نے شیر بن کر گوشت مانگا۔ شرن گتا نے درو پدی کا چیر بڑھایا۔ ویسے ہی تم نے ایک پناہ گزیں کو اپنی پناہ دے کر چھتری دھرم کی حفاظت کی ہے۔ تمھارے ماں باپ کو آفریں ہو۔ حسین پرتھی راج سے ملا۔ راجہ اس کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ ناگور کے جنوب میں اس کو جاگیر دی۔ اس کے علاوہ گھوڑے دیے اور ہاتھی دیے اور دونوں میں محبت بڑھنے لگی۔

شہاب الدین نے خبر لانے کے لیے چار جاسوس اجمیر روانہ کیے۔ ادھر پرتھی راج نے حسین سے خوش ہو کر کیتھل۔ ہانسی اور حصار کے پرگنوں کا پٹہ اس کے نام لکھ دیا۔ جاسوسوں نے یہ واقعہ سُنا اور غزنی لوٹ کر اس کی اطلاع شہاب الدین کو دے دی۔ شاہ سخت ناخوش ہوا۔ اس نے عرب خاں کو سفیر بنا کر اس پیغام کے ساتھ پرتھی راج کے پاس بھیجا کہ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو حسین کو فوراً اپنے ہاں سے نکال دو۔ اس نے عرب خاں کو یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ پہلے حسین کے پاس جانا اور اس سے وہ پاتر طلب کرنا۔ اگر وہ پاتر دے دے گا تو ہم معاف کر دیں گے۔ بصورت انکار تم پرتھی راج کے پاس چلے جانا اور ہمارا پیغام اس کو دے دینا۔ عرب خاں کو تین سو سوار اور رتھ دے کر رخصت کیا۔

عرب خاں حسب الحکم سب سے پہلے حسین کے پاس ناگور پہنچا اور اس کو خوب ہی فہمایش کی مگر جب حسین نے ٹکا سا جواب دے دیا وہ سیدھا پرتھی راج کی خدمت میں حاضر ہوا۔ راجہ نے سلطان کی خیریت مزاج پوچھی۔ عرب خاں نے عرض کی کہ سلطان نے آپ کے علاقے سے حسین کے اخراج کی خواہش کی ہے یہ پیغام سُن کر راجہ کا مُنہ غصے سے سرخ ہوگیا اور بھویں چڑھ گئیں۔ اس پر کیماس نے سفیر کو ڈانٹ کر کہا۔ کیا سلطان آریا قوم کے رسم و اوضاع سے واقف نہیں جو ایسا ذلت آمیز پیام بھیجا ہے۔ حسین ہمارے راجہ کے ہاں پناہ گزین ہے اور چھتری کا یہ دھرم نہیں کہ ایک پناہ میں آئے کو چھوڑ دے۔ پرتھی راج کے ساونتوں کنہ چوہان۔ سور سنگھ۔ گوبند راج اور چند پنڈیر نے اس بیان کی تائید کی اور بولے کہ ہم سب سلطان سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ عرب خاں یہ رنگ دیکھ کر چپکا ہوگیا۔ اور اپنی بے عزتی کے ڈر سے فوراً دربار سے رخصت ہو کر غزنین کا راستہ لیا اور وہاں پہنچ کر ساری رام کہانی شہاب الدین کو سُنادی اس پر شہاب الدین نے دربار عام کیا اور اپنے امرائے لشکر تتار خاں، عرب خان، میر جام۔ کمام۔ خان خورسان۔ خان رہن۔ رہن۔ خان رستم۔ حاجی خاں۔ غازی خاں۔ خان جمن۔ غزنیں خاں۔ محبت خاں، میر خاں وغیرہ کو بلوا بھیجا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ تتار خاں نے پرتھی راج پر فوراً حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ خان خورسان نے کہا۔ اے خان تتار! تم نے اس چوہان کی طاقت کا بھی اندازہ کر لیا ہے۔ جلد بازی نہ کرو۔ شیخ عارب (عرب) نے کہا اس کی طاقت بے اندازہ ہے۔

تم نے ابھی اسے آزمایا نہیں - اسی لیے ایسا مشورہ دیتے ہو۔ اس پر شاہ نے پرتھی راج کی طاقت وشان و شوکت کا حال پوچھا۔ اس نے بیان کیا مگر تتار خاں نے اس کی بات کو مذاق میں اُڑا دیا۔ عرب نے کہا چونکہ تم نے پرتھی راج کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے اس لیے تم ٹھٹول میں اُڑا رہے ہو۔" بادشاہ غضب ناک ہو کر خان تتار کو جنگ کی تیاری کا حکم دیتا ہے۔ اب شاہ کو دن رات چوہان کی فکر رہنے لگی۔ اور فراہمی لشکر میں مصروف ہو گیا۔

روانگی کے وقت بدشگونی دیکھنے میں آئی۔ عرب (خان) نے سلطان سے عرض کی کہ آج کے دن سفر کرنا مناسب نہیں۔ سلطان نے کہا اس کافر چوہان کو مار لینا کون سی بڑی بات ہے۔ تم ناحق تشویش کرتے ہو۔ یہ کہہ کر کوچ کا حکم دیا - جاسوسوں نے یہ اطلاع ناگور میں پہنچا دی پرتھی راج نے اپنے سرداروں کو بلوا بھیجا اور خبر دی کہ شہاب الدین آمادۂ پیکار ہو کر سندھ تک پہنچ گیا ہے۔ سرداروں نے جنگ کی آمادگی ظاہر کی اور تیاری میں لگ گئے - گرو رام برہمن نے آکر اشیرباد دی - دان دیا اور خیر و خیرات کی۔ اور وید منتر سے تلک کیا گیا۔ جیسن اپنے لشکر کے ساتھ آکر پرتھی راج کے شامل ہو گیا۔

متحدہ فوج نے کوچ کر کے دس کوس پر جاکر پڑاؤ کیا - یہ اطلاع جاسوسوں کے ذریعے سے سلطان کو پہنچ گئی۔ سلطان یہ سُن کر بڑے زور شور سے چلا۔ شاہ کے لشکر کی کیفیت کے بیان میں یہ شعر یاد رکھنے کے قابل ہے:-

نمیں نیاج (نماز) سائیں پے پنج بخت سیپارے پڑھیں دن رات

نیں شیخ و حرم سرم (شرم) کریں رہ رہنی قرآن کریم
سلطان نے اچل پور پہنچ کر ڈیرہ جمایا۔ گھڑی رات گئے پرتھی
راج کو یہ خبر کیماس نے پہنچائی۔ پرتھی راج اسی وقت تیار ہوا اور سوار
ہوگیا۔ سیدھا حسین کے خیمے میں آیا۔ حسین نے اپنے ساتھیوں سمیت
راجہ کو سلام کیا۔ خبرداروں نے سلطان کو خبر دی کہ راجپوتوں کی
فوج ایک یوجن (چارکوس) کے فاصلے پر آگئی ہے۔ سلطان نے صف بندی
کا حکم دیا۔ جنوب میں تتار (خاں) بائیں طرف خورسان (خان) حاجی
(خاں) راجی (خاں) غازی خان مقدمے میں۔ میر جام۔ خان کمام
اور محبت عقب میں۔ الغرض سارونڈے کے بائیں طرف سلطان صف
بندی کرکے کھڑا ہوگیا۔ سلطانی فوج کو دیکھ کر پرتھی راج نے حسین
کی طرف دیکھا حسین نے اپنی فوج کو اس طرح جمایا کہ رومی خان تمام
(بیگ) حسین اور خان دلیل دکھن کی طرف اور قاسم خاں کریم
خان خواجہ قاسم کاج شدہ اُتر کی طرف رہے۔ حسین نے راجہ کو
سلام کیا اور کہا کہ آپ نے میرے لیے بڑی زحمت گوارا فرمائی ہے
میں بھی اس کے عوض میں اپنا سر دینے کے لیے تیار ہوں۔ پرتھی راج
نے کہا کون سی بڑی بات ہے۔ میں بھی آج تم کو غزنین کا بادشاہ
بنائے دیتا ہوں۔ میر حسین سلام کرکے فوج کی بائیں طرف چلا گیا اور پرتھی
راج نے اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ تم لوگ حسین کی امداد کرو۔
رائے چامنڈ۔ چندر سین پنڈیر۔ گہلوٹ۔ تنور رائے بڈھیار
راجہ کے جنوب میں اور رائے گوبند۔ دیو رائے۔ کنہ چوہان۔ لکھمی
رائے وغیرہ مقدمے میں تھے۔ بالآخر دونوں فوجیں مقابل ہوئیں

اور نشان بجنے لگے۔ حسین کا تتار کے ساتھ مقابلہ ہوا اور تتار کی فوج کے پانو اُٹھ گئے۔ خان خورسان آگے بڑھ کر لڑنے لگا۔ اِس کی فوج بھاگ کر سُلطانی فوج میں جا ملی۔ اب بائیں طرف سے جام۔ داہنی طرف سے کیماس اور سامنے سے پرتھی راج نے حملہ کیا اور جنگ مغلوبہ شروع ہوگئی۔ پرتھی راج کی فوج آگے بڑھی۔ منڈلیک مارا گیا۔ شہاب الدین کی فوج نے پانو چھوڑ دیے اور چوہانوں کی فوج نے تعاقب شروع کیا مسلمانی فوج ہندو سرداروں کے نرغے میں آگئی اور شہاب الدین گرفتار ہوگیا۔ بیس ہزار مسلمان اور سات ہزار ہاتھی گھوڑے مارے گئے۔ تیرہ سو ہندو قتل ہوئے۔ تین کوس کے اندر لڑائی ہوئی۔ حسین مارا جاچکا تھا۔ پرتھی راج نے اس کی لاش تلاش کرواکر منگوائی جس کو دفنایا گیا اور چتر رکھا پاتر جیتے جی اس کی لاش کے ساتھ قبر میں گڑ گئی۔ راجہ نے شہاب الدین کو پانچ روز تک عزت کے ساتھ رکھا۔ پھر اس سے تین بار سلام کرواکر میر حسین کے بیٹے غازی کو اس کے ساتھ کر دیا اور یہ وعدہ لے لیا کہ وہ آیندہ ہندوؤں پر کبھی حملہ نہیں کرے گا۔ شہاب الدین غازی کو اپنے ساتھ لے کر بخیریت تمام پہنچ گیا۔ اس کے اُمرا نے اس کے جیتے جاگتے لوٹ آنے پر بڑی دھوم کے ساتھ خوشیاں منائیں۔

آکھیٹک چوک برنن

دسویں داستان

پورا برس ختم ہوگیا مگر شہاب الدین کے دل میں پرتھی راج کی عداوت بدستور تازہ رہی۔ حسین (غازی؟) ایک مہینے پانچ دن رہ کر غزنین سے واپس پرتھی راج کے پاس چلا آیا تھا۔ پرتھی راج نے کھٹو کے بن میں شکار کی ٹھانی۔ نیتراؤ کھتری نے یہ خبر شہاب الدین کو پہنچا دی۔ شاہ نے اپنا جاسوس تحقیقات کے لیے روانہ کیا۔ اس نے یہاں پہنچ کر ساری کیفیت تحریر کردی شہاب الدین نے اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ پرتھی راج پر چڑھائی کے لیے خفیہ طور پر تیاری کی جائے۔ مسلمان سرداروں کا اس امر پر اتفاق تھا کہ بغیر فریب اور دھوکا دیے چوہانوں پر فتح نہیں ہو سکتی۔ ادھر پرتھی راج عین بے خبری کے عالم میں مصروف شکار ہے اور ادھر شہاب الدین آٹھ ہزار فوج ساتھ لے کر کھٹوبن میں آپہنچا۔ علی الصباح حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ چند کوی نے پرتھی راج سے کہا کہ میرے پاس خبر آئی ہے کہ شہاب الدین آگیا ہے جب اس امر کی تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ یونی (مسلمانی) فوجیں جنگل کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس وقت راجہ کے ساتھ صرف پانچ سردار تھے۔ انھوں نے راجہ کو اپنے بیچ

میں کرلیا - یونی (مسلمانی) فوج پہلے ہی سے انھیں محصور کیے ہوئے تھی - اب جنگ شروع ہوگئی - راجہ نے کمان سنبھال لی اور چُن چُن کر یونی سرداروں کو گرانا شروع کیا - اس کے بعد تلوار ہاتھ میں لی اور دشمنوں کو کاٹنے لگا - کچھ دیر میں سلطانی فوج کے سات سو پچپن آدمی کام آئے - راجہ کے ہمراہیوں میں سے چالکیہ نہایت بہادری سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا - اس بہادر کی موت کا پرتھی راج کو بہت صدمہ ہوا اور طیش میں آکر تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈالا اور دشمنوں کو کاٹ کاٹ کر گرانے لگا - دو گھڑی تک بڑی گھمسان کی جنگ رہی - آخر جب بڑے بڑے مسلمانی سردار کٹ چکے - مسلمانوں نے غزنیں کا رُخ کرلیا اور شہاب الدین ہارے جواری کی طرح اپنا سا منہ لے کر چل دیا -

---

مگل جدھ (جنگ مغل)

پندرھویں داستان

جب انچھنی کو بیاہ کر پرتھی راج آرہا تھا۔ میوات کا راجہ مدگل رائے اپنے فرزند کے انتقام کے لیے پرتھی راج کو مارنے کے واسطے چھپ کر جمنا کی ایک گھاٹی میں بیٹھ گیا۔ پرتھی راج صبح اُٹھ کر شکار کو نکلا مگل راج نے آکر راستہ روک لیا۔ پرتھی راج نے اس موقعہ پر بڑی جانبازی کے ساتھ جنگ کی۔ آخر مغل گرفتار ہوا اور پرتھی راج اسے قید کرکے اور انچھنی کو ساتھ لے کر بہ خیریت تمام اپنے شہر پہنچ گیا۔

مادھو بھاٹ کتھا

اُنّیسویں داستان

پرتھی راج دلّی آکر رہنے لگا۔ شہاب الدین کا بھاٹ، مادھو بھاٹ جو اکثر علوم و فنون میں باکمال تھا دلّی آگیا اور یہاں ایک مہینے تک رہا یہ شہر اس کو پسند آیا۔ خبریں لینے کے لیے وہ پرتھی راج کے دربار میں بھی جانے لگا۔ اس نے اپنے کمال سے اہل دربار پر خوب سکّہ جمایا۔ دھرمائن کایستھ نے اس کو سلطنت کے راز بتائے اور پرتھی راج نے اتنا انعام دیا کہ اس نے عمر بھر نہیں دیکھا تھا۔ الغرض شاہی راز سے آشنا اور انعام سے مالا مال مادھو بھاٹ اپنے آقا شہاب الدین کی خدمت میں غزنیں لوٹا اور بتایا کہ اب دِلّی پرتھی راج کو مل گئی ہے اور اننگ پال نے بن باس لے لیا ہے۔ یہ خبر سُن کر شہاب الدین کو بڑا حسد ہوا۔ اِسی غصّے میں فوج کشی کی سوجھی۔ پھر تتار خاں وغیرہ سرداروں کو جمع کرکے اِن سے پرتھی راج کا زور توڑنے کی رائے پوچھی۔ تتار خاں کی رائے بھی یہی تھی کہ دلّی پر لشکر کشی کی جائے۔ اس رائے سے باقی سردار بھی متفق تھے۔ رستم خاں نے مشورہ دیا کہ فراہمی افواج کے وقت تک ایک جاسوس دلّی بھیجا جائے جو ہندوؤں کی خبر لے آئے چونکہ مادھو بھاٹ کی اطلاع پر شاہ کو بھروسا نہیں تھا۔ مخبر بھیج کر شاہ لشکر کی تیاری ۔۔

ادھر جاسوس دلی پہنچ گیا۔ یہاں اس کو پرتھی راج کو تخت دیے جانے اور اننگ پال کے بن باس لینے کی خبر کی تصدیق ہوگئی۔ دھرمائن کایستھ نے نئے راجہ کے سرداروں کے حالات وغیرہ بیان کیے اور باقی ضروری امور عرضی میں لکھ کر جاسوس کے حوالے کر دیے جاسوس چھ مہینے میں لوٹا اور اپنے چشم دید حالات شاہ سے عرض کر دیے سمت ۱۱۴۳ بکرمی میں پرتھی راج کو دلی ملی۔ اب شاہ نے اپنے امرا سے پھر مشورت کی انھوں نے وہی جنگ کی صلاح دی۔ الغرض شاہ مع اپنے لشکر کے بڑی دھوم دھام کے ساتھ چلا۔ دو لاکھ فوج ساتھ تھی۔ جب شاہ کے کوچ کی خبر پرتھی راج کو ملی۔ اس نے اپنے سرداروں سے مشورہ لیا کیماس نے کہا کہ ہمیں چاہیے آگے بڑھ کر ہم شاہ کا استقبال کریں۔ اس پر سب سرداروں نے اتفاق کیا۔ علی الصباح پرتھی راج نے کوچ کیا۔ جب میدان جنگ میں پہنچے لڑائی بڑے زور شور کے ساتھ شروع ہوئی اور بہت جلد شاہی فوج کے پانو اکھڑ گئے لشکر بھاگتا دیکھ کر سلطان بہت برہم ہوا اس نے انھیں لعنت ملامت کی۔ بھگوڑے تھم گئے اور لڑائی پھر جمی۔ اس اثنا میں تتار خاں مارا گیا۔ اب فوج تو کیا خود سلطان نے بھی ہمت ہار دی اور راہ گریز اختیار کی۔ پرتھی راج نے تعاقب کیا اور چامنڈ رائے نے سلطان کو گرفتار کر لیا۔ پرتھی راج نے ایک مہینے قید رکھ کر سلطان کو آزاد کر دیا۔ اس داستان میں اسمار ذیل ملتے ہیں:۔ خورسان خان۔ تتار خان نصرت خاں۔ ملتان خان۔ حمزہ خان۔ خان سیرن۔ کالی بلائی صفحہ ۶۰۹ میر فتح جنگ۔ میر حسین۔ غزنین خان۔ محمود میر۔ معروف خان وغیرہ

پدماوتی سمے

بیسویں داستان

پورب کی سمت میں سمودرشِشر گڑھ کے جادو بنسی راجا وجے پال کی حکومت ہے اس کے کنور پدم سین کے پدماوتی نام ایک نہایت حسین مہ جبین لڑکی ہے۔ کھیل میں ایک دن ایک طوطے کو دیکھ کر اس پر لٹو ہوگئی اور اسے پکڑ کر پنجرے میں رکھ لیا۔ اس طوطے کی محبت میں وہ اپنے تمام کھیل اور تفریحیں بھول گئی اور رات دن اس کو پڑھانے لگی۔ پدماوتی کا حُسن گلوسوز دیکھ کر طوطے نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر پدماوتی کو پرتھی راج کا بر ملے تو بہت اچھا ہو۔ پدمنی نے ایک دن طوطے سے اس کا وطن پوچھا اس نے کہا میں دلّی کا رہنے والا ہوں جہاں کا حاکم راجہ پرتھی راج اندر کا اوتار ہے۔ شہزادی پرتھی راج کے حُسن و کمال کا ذکر سُن کر اس پر نادیدہ عاشق ہوگئی۔ جب پدمنی سیانی ہوگئی ماں باپ کو اس کے بر کی فکر ہوئی۔ اس غرض سے راجہ نے پروہت کو دیس دیس بھیجا۔ پروہت پھرتا پھرتا کماؤں کے راجہ کمودمنی کے ہاں پہنچا اور اس کے ساتھ کنیا کے لگن چڑھا دیے۔ کمودمنی بڑی دھوم کے ساتھ برات لے کر بیاہنے نکلا۔ پدماوتی کو بہت صدمہ ہوا۔ اطلاع دینے کے لیے طوطے کو پرتھی راج کے پاس بھیجا اور پیغام دیا کہ رکمنی کی طرح میری سبیل کرو۔ طوطے نے چٹھی پرتھی راج کی خدمت میں پہنچا دی۔ را

چامنڈ رائے کو دلی میں چھوڑ کر اور سرداروں کو ساتھ لے کر روانہ ہوا جس دن برات سمودر شِشر گڑھ پہنچی۔ پرتھی راج بھی پہنچ گیا۔ اسی دن شہاب الدین کو بھی غزنیں میں خبر مل گئی۔ سنتے ہی شاہ اپنے امیروں کے ساتھ پرتھی راج کا راستہ روکنے کے لیے نکلا۔ ادھر یہ خبر جیند نے پرتھی راج کو پہنچا دی۔ طوطے نے لوٹ کر سارا ماجرا پدماوتی کو سنایا وہ بہت خوش ہوئی۔ سنگار کر کے سہیلیوں کے ساتھ شیوجی کی پوجا کو گئی۔ وہاں سے پرتھی راج نے اٹھا کر اسے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اور لے نکلا۔ شہر میں یہ اطلاع راجہ کو پہنچی اس نے تعاقب کیا اور بڑے گھمسان کا معرکہ پڑا۔ پرتھی راج دلی کی طرف بڑھا۔ شہاب الدین بھی آ پہنچا اس دفعہ شاہ کو پورا یقین تھا کہ پرتھی راج کو اسیر کر لے گا۔ فوج بھی زبردست ساتھ لایا تھا۔ اس میں خراسانی۔ ملتانی۔ ککھار۔ رومنگی فرنگی۔ بلخی۔ بلوچ۔ منجاری۔ ہزاری وغیرہ تھے۔ فرنگی لال سقلات (ستقرلات) پہنے تھے اور مروری رجھوری۔ عراقی۔ عربی۔ تازی۔ ترکی مہابان۔ کمان وغیرہ گھوڑے تھے۔ پرتھی راج تلوار سنبھال کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا۔ رات دن گھمسان کی جنگ رہی۔ آخر پرتھی راج نے موقع پاکر کمان[ل] ڈال کر شہاب الدین کو پکڑ لیا اور گنگا پار کر کے دلی چلا آیا اور سادہ لگن پاکر پدمنی کے ساتھ دھوم دھام سے بیاہ کیا۔

ل کمان ان داستانوں میں کئی موقعوں پر استعمال ہوئی ہے۔ کمان سے گرفتار کرنے کا دستور کبھی نہیں سنا گیا۔ غالباً مصنف کی مراد کمند سے ہے۔ بالفاظ دیگر کمان کو بمعنی کمند سمجھ رہا ہے (مقالہ نگار) لیکن شعر ذیل ملاحظہ ہو۔

ما را بس است گوشۂ ابروے التفات ۔۔۔ ہیں صیدِ دام را بکماں می تواں گرفت

(پرنسپل شفیع)

دھن کتھا

(افسانۂ گنج)

چوبیسویں داستان

ایک مرتبہ مرد بھومی (مارواڑ) سے دلی آتے وقت ایسا اتفاق ہُوا کہ راجہ پرتھی راج کھٹو کے جنگل میں خیمہ زن ہُوا اور مجلس خاص میں اپنے فاضل وزیر کیماس کی دانشمندی کی تعریف کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ ای وزیر اس جنگل میں صاف پانی کے تالاب کے کنارے ایک پتھر کی مورت ہی جس پر یہ کتبہ ہی " سر کٹے دھن سنگر ہی سر سنچے دھن جائے " (سر کٹنے خزانہ ملے اور سر رہتے خزانہ جائے) اس کا مطلب معلوم کرنے کے لیے بڑے بڑے دانشمند حیران ہیں اور اصل حقیقت کسی کو بھی معلوم نہ ہوسکی۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تمھارے نزدیک اس نوشتہ کا کیا مفہوم ہی۔ کیماس نے جواب میں کہا سُنا تو یوں جاتا ہی کہ گزشتہ زمانے میں ویر باہن نامی کوئی باقبال راجہ تھا جو بڑا ظالم اور جفا کار تھا۔ اس نے رعیت پر ظلم کر کرکے بڑا خزانہ جمع کیا۔ آخر رعایا نے بھی تنگ آکر اس کے حق میں بد دُعا کی کہ وہ اوت اور بے نام و نشان جائے۔ خدا کی قدرت رعایا کی دُعا قبول ہوئی اور راجہ لاولد مرا۔ مہاراج! یہ سب خزانہ اسی راجہ کا جمع کردہ ہی جس کا نکالنا بھی جائز ہی۔ اگر آپ

اس خزانے کے نکالنے کے خواہشمند ہیں تو سب سے پہلے چتوڑ کے دانشمند راول سمر سنگھ جی کو بلوا لیجیے اور پھر اس مہم میں ہاتھ ڈالیے کیونکہ جے چند شہاب الدین اور بھیم دیو آپ کے دائمی دشمن ہیں۔ ہمیشہ آپ کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہر طرف سے اپنا پورا پورا بندوبست کر کے خزانہ نکالنے کی کوشش کی جائے۔ راجہ نے کیماس کا یہ اخلاص مندانہ مشورہ سن کر اسے اپنے پاس بلایا۔ عزت سے بٹھایا اور سرفراز باعنایت کیا اور بولا کہ ای مشیر با تدبیر میں تیرے اس مشورے سے بہت خوش ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے چند پنڈیر کو بلوایا اور ایک خط دے کر اسے راول سمر سنگھ کو بلانے کے لیے چتوڑ روانہ کیا۔ چند پنڈیر راول جی کے نذرانے کے واسطے پرتھی راج کے دیے ہوئے ہاتھی گھوڑے اور کپڑوں کے تھان وغیرہ لے کر چتوڑ پہنچا اور بڑے ادب کے ساتھ راول جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور راجہ کا خط دے کر اس خزانے کا قصہ سنانے لگا خط پڑھ کر اور باتیں سن کر لوگراج راول سمر سنگھ جی نے ہنس کر جواب دیا کہ ای چند پنڈیر اس دنیا کی رسم و راہ بڑی نرالی ہے۔ ایک گیدڑ گوشت کا لوتھڑا لے کر آتا ہے۔ دوسرا گیدڑ وہ لوتھڑا اس سے چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس چھینا جھپٹی میں کوئی اور ہی اسے لے بھاگتا ہے راول جی کا یہ قول سن کر چند پنڈیر نے عرض کی کہ آپ کا فرمانا بالکل درست ہے۔ تاہم پرتھی راج کو سراسر آپ ہی کا بھروسا ہے۔ وہ صرف آپ ہی کے بھروسے پر اپنے بڑے بڑے دشمنوں کو بھی کچھ مال نہیں سمجھتا اس لیے میری گزارش بس اسی قدر ہے کہ آپ

پرتھی راج کی محنت کو برباد نہ کریں۔ دلّی تشریف لے چلیں اور خزانہ نکالنے میں اس کی مدد کریں۔

چند پنڈیر کا معروضہ سُن کر راول جی ایک بڑی فوج لے کر ناگور کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ منزل بمنزل قطع مسافت کرکے راول جی ناگور پہنچے۔ دھرمائن کایستھ نے ساری اطلاع شہاب الدین کو لکھ بھیجی۔ جب دہلی سے دس کوس پر راول جی آگئے۔ پرتھی راج مع اپنے امیروں، درباریوں اور فوج کے شہر سے نصف کوس باہر آگیا اور استقبال کرکے راول جی کو شہر میں لے گیا۔ اننگ پال جی کے بھون میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ اور ہر طریق سے ان کی خدمت گزاری کی۔ دو دن آرام کیا تیسرے دن پرتھی راج نے ایک مجلس منعقد کی جس میں راول جی اور امراے دربار حاضر ہوے۔ خزانہ نکالنے کی تدبیر پر غور خوض کی گئی۔ داناے روزگار کیماس کی یہ راے منظور ہوئی کہ شہاب الدین کا مقابلہ پرتھی راج جی کریں اور بھیم دیو کا راستہ راول جی روکیں تب خزانہ نکالنے کی صورت کی جائے۔ چنانچہ اس رائے پر کاربند ہونے کے لیے پرتھی راج اور راول سمرسنگھ اپنے اپنے لشکر کے ساتھ ناگور کی طرف چل دیے اور وہاں پہنچ کر ہر ایک نے اپنے اپنے حریف کی روک تھام کے لیے ڈیرے ڈال دیے۔ جب یہ اطلاع شہاب الدین کو پہنچی کہ دلّی کا راجہ دفینہ نکالنے کی غرض سے ناگور پہنچ گیا ہے وہ بھی چیدہ چیدہ مسلمانوں کی زبردست فوج لے کر ناگور کی سمت روانہ ہوگیا اور فوج کا دل بڑھاتا رہا کہ اب کی دفعہ

پرتھی راج ضرور گرفتار کرلیا جائے گا۔ ایسے منصوبے باندھتا وہ ناگور کے قریب آدھمکا۔ شاہ کی آمد کی خبر پاکر راول جی نے نشیب و فراز سمجھاکر کیماس وزیر کو دفینہ کی حفاظت کے واسطے تعین کیا۔ اور خود شاہ پر چڑھائی کے لیے تیار ہوئے۔ صبح ہوتے ہی راول جی شاہ کی طرف بڑھے۔ ان کی فوج کا غبار دیکھ کر شہاب الدین سمجھ گیا اور آمادۂ جنگ ہوکر راول جی کی طرف بڑھا۔ ادھر سے بہادر راجپوت اور ادھر سے جنگجو مسلمان بھوکے شیروں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹے۔ ہاتھی ہاتھی سے، گھوڑا گھوڑے سے اور پیادہ پیادے سے بھڑ گیا۔ سرداروں نے سرداروں کو ٹوکا۔ پرول پرہار نے رستم خاں کے بھائی مور خاں کو ہلاک کرڈالا۔ ادھر رستم خاں نے پرہار رائے پر بھرپور ہاتھ چھوڑا۔ الغرض کثرت کشت وخون سے خون کا دریا بہنے لگا۔ دن بھر لوہا برستا رہا۔ ہندو اور مسلمان دل کھول کر لڑے۔ آدھی گھڑی دن باقی تھا جب سورما راجپوتوں نے میر پیرزادوں کو پسپا کردیا۔ جوں ہی سورج کی روشنی ماند پڑی اور مغرب میں ڈوبنے لگا۔ بزدلوں نے ہمت ہار دی۔ کمودنی چاند کی طرف منہ کرکے جھکنے لگی اور پرندے نرم نرم پتوں کے کواڑ بند کرکے اپنے اپنے گھونسلوں میں چہک چہک کر چپ ہوگئے۔ دونوں فوجیں جنگ سے دست کش ہوکر اپنے اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹیں اور سب سپاہی اور جمعدار وغیرہ اپنے اپنے مقام پر دنیا کے جنجالوں کو خیرباد کہہ کر نیند کے آغوش میں پانو پھیلاکر بے خبری کے خواب میں مست ہوگئے۔ چامنڈ رائے۔ نڈھور رائے۔ اتاتائی۔ جیت رائو۔ رین پرمار اور کنہ

کا بھتیجا پرتھی راج کی چوکی پر تھے اور غنیم کے لشکر میں رستم خاں۔ تتار خاں ، نوری خاں ۔ حجاب خاں ۔ محمد اساکی (عیسیٰ قلی ؟) اور کھوکھر خاں شہاب الدین کے پہرے پر تھے

رات خیریت کے ساتھ گزر گئی ۔ دوسرے دن جب سپیدۂ سحری مشرق سے نمودار ہوا۔ نبرد آزما میدان جنگ میں آ دھمکے ۔ گھڑی دن چڑھے پرتھی راج چھتیسوں بانے اور زرہ بکتر پہنے مست ہاتھی پر سوار اپنی فوج کے قلب میں جلوہ افروز ہوا اور غنیم پر حملے کا حکم دیا۔ حکم پاتے ہی سورما راجپوت دشمن پر اس طرح جھپٹے جس طرح بھیڑیا بھیڑوں کے گلے پر دوڑتا ہے۔ داہنی جانب سے پرتھی راج اور بائیں جانب سے سمر سنگھ جی نے یورش کی ۔ تب مسلمانی فوج بھی اللہ بسم اللہ کرتی ہوئی جنگ میں مصروف ہوئی۔ اس وقت نشانوں کے لہرانے ، نقاروں کی گڑگڑاہٹ ، تیروں کی بوچھاڑ اور گولے گولیوں کی سنسناہٹ سن کر بہادروں کا کلیجہ خوشی کے مارے بلیوں اچھلتا تھا مگر نامرد حواس باختہ ہو رہے تھے ۔

شاہ کی طرف سے عرب خاں سپہ سالار تھا اور عمر خاں اس کا مددگار اور فوج کا نایک تھا ۔ اس نے اپنی ہوشیاری سے گیارہ دن برابر راجپوتی لشکر کا مقابلہ کیا ۔ آخر کار بارھویں دن پانچ گھڑی دن چڑھے مسلمانی لشکر کے پانو اکھڑ گئے ۔ یہ خبر پاکر عقبی فوج کے نایک ختان خاں نے بہت زور مارا اور فوج کا دل بڑھایا ۔ جس سے اس کے پانو تھم گئے اور یونی (مسلمان) پھر جی توڑ کر لڑنے لگے ۔ جب دوپہر ہوگئی اور دو ہزار گھوڑ کام آچکے تب مسلمانوں نے راجپوتوں پر ایک

زور شور کا حملہ کیا۔ الغرض اس طرح چوٹیں ہوتے ہوتے آدھی گھڑی دن باقی رہ گیا۔ تب نصرت خاں، یعقوب خاں اور تتارخاں نے تینوں طرف سے زبردست حملہ کیا اور ایسی ہوشیاری اور بہادری سے کام لیا کہ اس مرتبہ راجپوتوں کے پانو ڈگمگانے لگے۔ یہ دیکھ کر راول سمرسنگھ جی اور پرتھی راج ہاتھیوں سے اتر کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اپنی جانیں ہتیلی پر لے کر غنیم کی فوج میں گھس پڑے اور اس کے بڑے بڑے سورماؤں کو کاٹنے چھانٹنے لگے ان کے پیچھے بہادر راجپوت ہولیے اور غنیم کی فوج کو کائی کی طرح سے پھاڑ دیا۔ ادھر مسلمان پانو پیچھے رکھنا جہنم میں جانے کے برابر جانتے تھے۔ اس لیے دونوں فوجوں میں خوب زدوخورد ہوتی رہی بالآخر مسلمان راول جی کی تیز تلوار کی دھار کے مقابلے میں ٹھہرنے سے عاجز آگئے۔ اس طرف پرتھی راج نے اپنے ہاتھی کو شہاب الدین کی طرف بڑھایا۔ شاہ اس پر تیروں کا مینہ برساتا اپنی فوج سے یوں مخاطب ہوا:-

ای بہادرو! کھانے اور سونے میں تو سارے انسان برابر ہیں، مگر سچا بہادر وہی ہے جو دشمن کے سامنے سینہ کھول کر جا ڈٹے۔ اگرچہ مجھ کو یقین ہے کہ آپ لوگ اپنے نام اور میرے کام پر اپنی جان و مال کو کچھ بھی نہیں سمجھتے مگر پھر بھی کہتا ہوں کہ جس کا جی چاہے بیشک یہاں سے چلا جائے اور جاکر اپنے بال بچوں سے ملے۔ میرا تو عزم جزم یہی ہے کہ یا تو میدان جنگ میں مارا جاؤں یا جس نیت سے میں غزنی سے چلا ہوں اسے پورا کرکے چھوڑوں

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بغیر مطلب کوئی تنکا تک بھی نہیں ہلاتا۔ کیا دیو، کیا جنات کیا انسان سب گُن کے یار ہیں۔ انسان دولت اور آرام چاہتا ہے۔ شہید۔ دیو اور جن پرستش کے خواہشمند ہیں مگر سچا نوکر وہی ہے جو مشکل کے وقت اپنے آقا کے کام آئے۔ سچا دوست وہی ہے جو اپنے دوست کے دل کی بات جانتا ہوا ہمیشہ اس کو خوش و خرم کرنے کی تدبیر کرے اور کوئی بات اس سے نہ چھپائے۔ جو شخص سچے دل سے محبت کرتا ہے وہی دوست ہے۔ سلطان کی یہ تقریر سُن کر تمام مسلمان سردار اپنے بادشاہ کی خوش تدبیری کی تعریف کرتے ہوئے جان پر کھیل کر لڑنے لگے۔ ادھر کنہ نے خورسان خان کے بھائی کا مقابلہ کیا اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس سے مسلمانی فوج گھبرا گئی۔ ادھر پرتھی راج نے تلوار نیام سے کھینچ لی اور شہاب الدین پر حملہ کیا۔ ساتھ ہی چامنڈ رائے۔ بلبھدر۔ پیپ پڑھیار اور نڈھور اے شاہ کے چاروں طرف ہو لیے۔ لیکن شاہ کے پانچ سرداروں نے جو خواصی میں تعین تھے اپنے آقا کی حفاظت کے لیے بڑی پامردی دکھائی۔ ان کے مارے جانے پر شہاب الدین گرفتار ہُوا اس وقت لشکر اسلام نا امید ہو کر بھاگ نکلا اور تمام شاہی سامان۔ رخت بخت، وغیرہ جہاں کا تہاں پڑا رہ گیا اور ہندو فوج نے لوٹ لیا فتح کے بعد گرو رام نے پرتھی راج سے کہا کہ مہاراج! اب آپ دلی کو چلیے اور وہاں فتح کی خوشیاں منا کر اور خزانہ کھودنے کے لیے سبھ مہورت معلوم کر کے آئیے۔ گورو جی کی بات سُن کر راجہ نے کاکا کنہ اور داہم رائے کیماس کی طرف دیکھا انھوں نے بھی گرو جی

کی رائے کی تائید کی۔ تب پرتھی راج۔ راول سمرسنگھ جی۔ کیماس اور باقی لشکر کو کھٹو کے بن میں چھوڑ کر جام دیو۔ بجون رائے۔ بلبھدر۔ جیت پرمار۔ کاکا کنہ رائے اور اری سنگھ جیسے سرداروں اور تھوڑی سی فوج کو ساتھ لے کر بھاگن سدی ۱۴ کو دلی کی طرف روانہ ہوا اور دس روز میں ۔ ستھ ٹکر کرکے دلی جا پہنچا۔ دشمن پر فتح کی خبر سن کر راج کمار تمام لشکر اور شہر والوں کو ساتھ لے کر دلی سے سے آدھ کوس کے فاصلے پر باپ کے درشن کے لیے پا پیادہ آئے۔ پرتھی راج ان سے بڑی محبت سے ملا اور گھوڑے پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ چیت بدی ۲ کو پرتھی راج شہر میں داخل ہوا۔ سب سے ملاقات کی۔ استراحت کے بعد شہاب الدین کو اپنے سامنے بلوا کر ملازموں کو ہدایت کی کہ اسے نہایت آرام سے رکھیں۔

جب شاہ کی گرفتاری کی خبر غزنیں میں پہنچی۔ اس کے وزیر تتار خاں نے ایک نہایت ہوشیار کھتری کو سب کچھ سمجھا کر اور ایک خط دے کر دلی کو روانہ کیا۔ یہ کھتری جس کا نام لورک رائے تھا پانسو سواروں کے ساتھ بارہ بارہ کوس کی منزلیں مارتا شہر دہلی کے دروازے پر آپہنچا۔ دن بھر آرام کیا۔ دو گھڑی دن رہے سے شہر میں داخل ہوا اور ڈیوڑھی پر پہنچ کر اطلاع کرائی کہ غزنیں سے تتار خاں کا ایلچی حضور والا کے سلام کے لیے درگاہ پر حاضر ہے۔ یہ خبر پا کر راجہ نے اسے اپنے سامنے بلوایا۔ لورک رائے نے حاضر ہو کر ادب کے ساتھ سری حضور کو سلام کیا اور حکم پا کر ایک طرف مؤدب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں سری حضور کی منشا پا کر وہ زیرک ایلچی پھر اٹھا اور

تین بار جھک کر کورنش بجالایا۔ تتار خاں کا خط راجہ کے پیشکار مدھوشاہ کے سامنے ادب سے پیش کیا۔ مدھوشاہ نے شہاب الدین کے آخلاص کی عرضی جو تتار خاں کی فرستادہ تھی پڑھ کر سنائی۔ راجہ اسے سن کر ہنس پڑا۔ زیرک مدھوشاہ راجہ کے ہنسنے سے اس کے دلی ارادہ کو تاڑ گیا۔ اس نے اسی وقت لورک رائے کو دربار سے رخصت کردیا۔ دوسرے روز لورک رائے پھر دربار میں حاضر ہوا اور پرتھی راج کی طاقت و شوکت اور حلم و بردباری کی تعریف کرکے شاہ کی رہائی کی بات چھیڑی۔ پرتھی راج نے اس کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس سے دریافت کیا کہ آخر شہاب الدین کا نام گوری (غوری) کیوں مشہور ہوا۔ لورک رائے نے عرض کی:۔

حضور والا! غزنیں میں ایک ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا اس کا نام جلال الدین تھا۔ وہ اس قدر عیاش تھا کہ اس کے محل میں پانسو دس حرمیں تھیں۔ جب اسے کسی حرم کے حاملہ ہونے کی خبر ملتی وہ اس کا سر اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالتا۔ اس خیال سے کہ مبادا فرزند نرینہ پیدا ہو اور بڑا ہوکر اسے قتل کرکے سلطنت کرنے لگے۔ اس قساوت قلب کے باوجود وہ ایک درویش نظام شاہ نامی کی بہت خدمت کیا کرتا تھا۔ اس کی خدمت گزاری سے خوش ہوکر ایک دن درویش نے اسے بشارت دی کہ تمھارے ایک بلند اقبال فرزند پیدا ہوگا۔ درویش کی یہ بشارت بادشاہ پر گراں گزری اور تشویش و سراسیمگی کی حالت میں قصر شاہی کی طرف لوٹا۔ یہاں پہنچ کر سب سے پہلی خبر جو اس نے سنی یہ تھی

کہ بادشاہ کی ایک بیگم حاملہ ہے مگر قبل اس کے کہ شاہ اس کے قتل کا انتظام کرتا۔ بیگم شاہی محل سے نکل کر فرار ہوگئی۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد شاہ جلال الدین کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت مشیرانِ سلطنت کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ وارث مُلک کے بغیر مُلک کا انتظام کیونکر ہوسکے گا۔ اس درمیان میں ایک شیخ نے آکر ان سے کہا کہ ایک بڑے کرّ و فر اور شان و شوکت والا بچہ شہر کے باہر والے قبرستان کی ایک گور میں رہتا ہے تم اس کو اپنا بادشاہ بنالو۔ میرے ساتھ آؤ میں تمھیں وہ بچہ بتا دوں۔ سب درباری اس کے ساتھ ہولیے قبرستان میں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پانچ سال کا ذی شکوہ بچہ بیٹھا ہُوا طفلانہ کھیل میں مصروف ہے۔ سب لوگ اس کی زیرک صورت اور ہونہار قیافہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور عزت کے ساتھ شاہی محل میں لے آئے۔ نجومیوں نے اس کا طالع دیکھ کر بیان دیا کہ وہ بڑا جلیل القدر بادشاہ ہوگا اور ہندستان میں مُسلمانی سلطنت کی بنیاد ڈالے گا اور جو شخص بار بار اسے قید و اسیر کرے گا۔ آخر میں یہ اسے بھی برباد کرکے رہے گا۔

لورک رائے جب اس طرح شہاب الدّین کی طفولیت کی کہانی سُنا چکا۔ پرتھی راج بولا: شاہ کے پاس "سنگار ہار" نامی ایک خوب صورت ہاتھی ہے۔ شاہ وہ ہمیں دے دے۔ اس کے علاوہ تین ہزار گھوڑے جرمانے میں داخل کرے تب ہم تمھارے بادشاہ کو رہا کریں گے۔ لورک رائے نے عرض کی مہاراج! جیسی مرضی ہوگی ویسے ہی عمل میں لایا جائے گا مگر فدوی کی التجا

تو یہ ہے کہ بادشاہ کو پہلے چھوڑ دیا جائے۔ اِدھر لورک رائے نے غزنین خط لکھ کر وہ ہاتھی اور گھوڑے منگوا کر پرتھی راج کی خدمت میں پیش کیے۔ اس وقت شاہ کو رہا کیا گیا۔ شہاب الدین قید سے چھوٹتے ہی غزنین جا پہنچا۔ وہاں اس کے امیروں نے خوب جشن منائے اور اپنے پروردگار کی جناب میں شکرانہ ادا کیا۔

سنگار ہار پرتھی راج کو نہایت عزیز تھا وہ کبھی اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یہ ہاتھی سات ہاتھ اونچا نو ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ موٹا تھا۔ جس وقت پرتھی راج اس عظیم الجثہ ہاتھی پر سونے چاندی کا ساز سجوا کر سوار ہوتا۔ وہ نظارہ بھی قابل سیر تھا۔ ایک روز پرتھی راج اس ہاتھی پر سوار ہو کر شکار کو گئے۔ کنہ بھی ساتھ ہولیے۔ دونوں بہادر گھنے جنگل میں شکار کی تلاش میں پھر رہے تھے، اتنے میں ایک بیڑبان خبر لایا کہ یہاں سے قریب ہی ایک بڑا زبردست سوّر ہے۔ راجا نے اس کے گھیرنے کا حکم دیا اور خود بھی اسی طرف بڑھا۔ جب سوّر نے دیکھا کہ چاروں طرف سے گھر گیا ہے۔ ہنکارتا ہوا ایک طرف کو بڑھا۔ اتنے میں راجہ نے تیر سے اسے گرا لیا۔ اسی وقت ایک شیر کی خبر آئی۔ پرتھی راج نے کہا کہ میں تو اب شیر کو مارے بغیر یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ یہ کہہ کر شیر کی جانب چلا۔ دیکھا کہ ایک ندی کے کنارے ایک خونخوار شیر بیل کا گوشت کھا رہا ہے۔ راجا نے ہاکے کا حکم دیا۔ مہاوت نے سنگار ہار کو اسی کی جانب چلایا۔ شور غل کی آواز سن کر شیر نہایت پھرتی سے راجا کی طرف

جھپٹا۔ راجا نے تیر چلایا۔ لیکن خطا گیا۔ خواصی میں کورنبھ رائے تھا اس نے تلوار سے شیر کے دو ٹکڑے کرکے مار ڈالا۔ کورنبھ رائے کی اس بہادری کی تمام فوج نیز راجا نے بڑی تعریف کی۔ شکار سے فارغ ہوکر جب راجا جی دلی لوٹے کوی چند نے شیر کے شکار کی مبارک باد دی۔

دوسرے دن راجا نے اپنے پردہت گرو رام سے دفینہ نکالنے کی غرض سے کھٹو بن پہنچنے کے لیے مبارک ساعت پوچھی۔ گرو جی نے بیساکھ سدی ۳ ر تبائی۔ پرتھی راج جی اسی تاریخ روانہ ہوگئے اور راستے میں اچھے شگون والی مختلف اشیا کی زیارت کرتے ہوئے کھٹو کے جنگل میں جا وارد ہوئے۔ راول جی نے بڑھ کر استقبال کیا۔ پرتھی راج شہاب الدین کی رہائی اور اپنے شکار کی کیفیت راول جی کو سناتا رہا۔ پھر دانش مند کیماس سے خزانہ نکالنے کی ترکیب پوچھی۔ کیماس نے اس کی حقیقت بیان کی۔ تب راجا راول جی اور چیدہ چیدہ سرداروں اور کسی قدر فوج کو لے کر اس موقعہ خاص پر پہنچا۔ کیماس نے اس کتبے کو پڑھا۔

ریوانٹ سمیو

ستائیسویں داستان

جب چامنڈ رائے دیوگیری کو فتح کر کے واپس لوٹا اس نے پرتھی راج سے ریوانٹ کے جنگل کی بڑی تعریف کی خاص کر کے وہاں کے بلند قد ہاتھیوں کی اور صلاح دی کہ وہاں شکار کو چلیں چند نے بھی اس امر کی تائید کی اور کہا کہ واقعی شکار کا لطف تو وہیں آئے گا۔ پرتھی راج کو یوں تو جے چند سے کاوش تھی ہی جب اعلیٰ شکار کی آس بندھی تو فوراً آمادہ ہوگیا اور بڑی دھوم کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں جو جو راجا ملے ساتھ ہولیے۔ یہ سب تو شکار کو جا رہے ہیں۔ ادھر غزنیں میں معروف خاں اور تتار خاں نے دلی پر حملہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ خبر سن کر شہاب الدین بھی آمادہ ہوگیا۔ تتار خاں نے قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ میں چند پنڈیر کو قتل کر کے دلی پر قبضہ کر لوں گا۔ اس جدید صورت حالات کی اطلاع چند پنڈیر نے فوراً پرتھی راج کو بھیج دی۔ پرتھی راج ابھی راستے ہی میں تھا۔ لوٹا اور چھ کوس پر آکر دم لیا۔ اب راجا نے سیدھا پنجاب کا رُخ کر لیا تاکہ غنیم کا مقابلہ وہیں کیا جائے۔ پرتھی راج شہاب الدین کی آمد کی خبر سن کر بہت محظوظ ہوا اور بولا کہ اب کے تو بڑا مُرغ شکار ہوگا۔ پجّون رائے نے کہا کہ

میں نے بہت سے دشمنوں کو زک دی ہے اور شہاب الدین کو بھی پکڑا ہے۔ میں اس مرتبہ بھی اس کے ساتھ آنکھیں ملاؤں گا۔ جیت راؤ نے کہا کہ شہاب الدین کی فوج سے لاہور کے قریب مقابلہ ہوگا۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ پہلے ہی سے تیار رہیں۔ آیندہ جیسے مہاراج کی مرضی۔ رگھوبنس رام نے کہا۔ ہم صرف جان دینا جانتے ہیں۔ شاہ کو پہلے بھی قید کرلیا تھا۔ اب کے بھی گرفتار کریں گے۔ کوی چند نے کہا گنوارو! کیسی باتیں بناتے ہو۔ اگر تم سب مرگئے تو راجا اکیلا جی کر کیا کرے گا۔ پرتھی راج نے غصے کے لہجے میں کہا: یہ بکواس چھوڑو اور آنے والی جنگ کی تیاری کرو۔ نصف شب کے قریب جاسوس پرتھی راج کے پاس یہ خبر لایا کہ شاہ اٹھارہ ہزار ہاتھی اور اٹھارہ لاکھ فوج لے کر لاہور سے چودہ کوس اُدھر آچکا ہے۔ یہ خبر سُن کر ہندو فوج میں ایک شور مچ گیا۔ دربار کے وقت جاسوس خبر لائے کہ شاہی فوج نے دریا عبور کرلیا ہے اور چند پنڈیر اس کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھا ہے اور ہمیں ادھر بھیجا ہے۔ اس طرف سُلطان صف کشی کی تیاری میں مصروف ہوگیا ہراول شہزادہ خان پیدا محمود کے سپرد کی۔ خان منگول۔ جہانگیر خاں۔ خان ہندو۔ بیچھی خاں پٹھان۔ خان عثمان۔ کیلی خاں۔ خان بھٹی خان خور سانو۔ حبش خاں حجاب۔ عالم وغیرہ امرا فوج کے ساتھ تھے۔ شاہ نے تیس مخبر ادھر مقرر کردیے اور خود نے دریاے چناب پار کرلیا۔ اس خبر سے پرتھی راج بہت بگڑا۔ ساتھ ہی اور خبر آئی کہ پنڈیر نے شاہ کو روک دیا ہے۔ جہاں چناب پایاب تھی پنڈیر

وہیں پہنچا اور ناکہ بندی کردی ۔ بڑی جنگ ہوئی اور پنڈیر معرکہ جنگ میں زخمی ہوگیا اور شاہ نے دریا عبور کر لیا ۔ اس خبر نے پرتھی راج کے تن بدن میں آگ لگا دی اس نے قسم کھائی کہ میں سومیشور کا فرزند نہیں اگر شاہ کو گرفتار نہ کروں ۔ فوراً کوچ کیا ۔ جب دونوں لشکر مقابل ہوئے میواڑ کے راول سمرسنگھ جی میدان میں بڑھے اور جنگ کرنے لگے ۔

دوپہر کے وقت چند پنڈیر نے ترچھا رخ دے کر دشمن کی فوج کو دبانا شروع کیا ۔ اتنے میں پرتھی راج اور شہاب الدین آمنے سامنے ہوئے ۔ شہاب الدین تو گھبرا گیا مگر تتار خاں نے تسلی دی ۔ مادھو رائے سولنکی خلجی خاں سے جنگ آزما ہوا آپس میں خوب تلوار چلی ۔ بدقسمتی سے اس کی تلوار ٹوٹ گئی ۔ کٹار نکال کر لڑنے لگا ۔ ادھر کسی نے موقع پاکر دغا بازی کرکے اسے مار ڈالا ۔ پجون رائے کے بھائی پلہان کا خورسان خاں سے مقابلہ ہوا بالآخر پلہان مارا گیا ۔ گوبند رائے نے تتار خاں کے ہاتھی اور مہاوت کو مار گرایا ۔ ادھر نرسنگھ رائے کے سر میں کاری زخم آیا وہ گرا چامنڈ رائے نے آگے بڑھ کر اس کی حفاظت کی ۔ اتنے میں رات پڑ گئی ۔

دوسرے روز جنگ بڑی شدت کے ساتھ شروع ہوئی ۔ سلطان اسلحہ لگا کر ہندوؤں پر حملہ آور ہوا ۔ لوہانے نے بڑی بہادری دکھائی ۔ چونسٹھ خان مارے گئے اور تیرہ ہندو سردار کھیت رہے ۔ رگھوبنس رائے نے کھنگار گوری کو مارا اور خود بھی مارا گیا ۔ دوسرے دن تتار خاں شاہ کو قلب میں رکھ کر خود جنگ

کے بلے بڑھا۔ ہندو سورما طیش میں آ آکر شاہ کی طرف بڑھے۔ ادھر خورسان خاں نے دشمن کی صفوں میں قیامت کا ہلکہ مچا دیا۔ حسین خاں گھوڑے سے گرا اور یک نماں کھیت رہا۔ معروف خاں اور تتار خاں لڑتے لڑتے تھک گئے۔ دوسرے دن خود سلطان نے تلوار سنبھالی آج ہندوؤں کا اس پر نرغہ تھا۔ اس نے کمان اُٹھائی۔ ایک تیر سے رگھوبنس گوسائیں کو مارا۔ دوسرے تیر سے بھیم بھٹی کو اُڑا دیا۔ تیسرا تیر ہاتھ میں لینے نہیں پایا تھا کہ پرتھی راج نے کمان ڈال کر اس کو گرفتار کر لیا۔ شاہ کی گرفتاری کے بعد پرتھی راج حسین خاں تتار خاں وغیرہ کو شکست دے کر دلی کی طرف لوٹا اور شہاب الدین کو ایک مہینہ اور تین دن قید رکھ کر اور جرمانے میں نو ہزار گھوڑے اور بہت سے موتی وغیرہ لے کر آزاد کر دیا۔

اننگ پال سمے

اٹھائیسویں داستان

اننگ پال دلی کا تخت پرتھی راج کو دے کر عبادت الٰہی کی غرض سے عزلت نشین ہو گیا۔ اب افواہ اڑنے لگی کہ پرتھی راج اپنے عزیز و اقارب کو دلی میں بٹھاتا ہے اور دلی والوں کی حق تلفی کرتا ہے۔ سومیشور نے اجمیر کو سنبھال رکھا ہے اور پرتھی راج دلی پر قابض ہے اس خبر نے مالوے کے راجا بھی پال کو برافروختہ کیا۔ اس نے اطراف کے راجاؤں کو خط لکھ کر جمع کیا۔ گکھڑ۔ گنڈ۔ بھدوڑا اور سورپور کے راجا آئے اور صلاح ٹھہری کہ پہلے اجمیر پر حملہ کیا جائے پھر دلی پر۔ القصہ اتحادی فوجوں نے اجمیر کی طرف پیش قدمی کی۔ سومیشور کو اطلاع ہوئی اس نے اپنے امیروں سے صلاح لی کہ پرتھی راج کو تو اننگ پال نے دلی میں الجھا دیا ہے۔ ہمارا زبردست غنیم سے مقابلہ ہے ایسا نہ ہو کہ زک پہنچے اور جگ ہنسائی ہو۔ درباریوں نے مشورہ دیا کہ غنیم چونکہ طاقتور ہے اس لیے مقابلے کے بجائے شب خون مارا جائے سومیشور نے کہا تم کہتے تو سچ ہو مگر شب خون مارنا تو دھرم کے خلاف ہے۔ درباری بولے کہ ہاں یہ درست ہے مگر جنگ میں ہر قسم کا فریب جائز ہے۔ الغرض لڑائی کی تیاری ہونے لگی۔ پٹن کے راجا جادو راج نے آکر اجمیر کے قریب ڈیرا ڈال دیا جس سے شہر میں بے چینی پھیل

ہوگئی۔ پچھلی رات کو سومیشور نے غنیم پر شب خون ماری اور غنیم کی فوج بھاگ اٹھی۔ جادو راج اس قدر زخمی ہوا کہ منہ سے بات تک نہ کرسکتا تھا۔ سومیشور اسے اپنے گھر اٹھالایا۔ علاج کرایا۔ ایک مہینہ بیس دن میں اچھا ہوا۔ جب پرتھی راج کو ان واقعات کی خبر پہنچی۔ کہنے لگا۔ موقع آنے دو ان سب کو سمجھوں گا۔

ادھر دلی کی رعایا اپنی فریاد لے کر اننگ پال کے پاس پہنچی کہ مہاراج ہمیں پرتھی راج کے ظلم سے بچائیے۔ اننگ پال نے تنگ آکر اپنا وزیر پرتھی راج کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ ہمارا ملک ہمیں واپس دے دو یا ہم سے آکر ملو۔ اس پر پرتھی راج بہت لال پیلا ہوا۔ قاصد نے کہا کہ جس نے آپ کو سلطنت عطا کی ہے اسی پر آپ غصہ کرتے ہیں۔ پرتھی راج نے کہا کہ مفت میں ہاتھ آیا ہوا ملک بزدل کھویا کرتے ہیں۔ میں واپس نہیں دینے کا۔ وزیر یہ جواب سن کر مغموم واپس آیا اور اننگ پال کو سارا ماجرا سنایا۔ اس پر اننگ پال نے لشکر کشی کی اور دلی پر چڑھ آیا۔ پرتھی راج نے کیماس سے صلاح لی۔ اس نے مشورہ دیا کہ اب ملک کسی طرح واپس نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اگر لڑنے کے لیے آئے ہیں تو بے شک مدافعت کیجیے۔ آخر جنگ شروع ہوئی اور کئی روز تک جاری رہی۔ آخرکار اننگ پال کو ہارنا پڑا۔ وہ واپس بدری ناتھ چلا گیا۔

اب اس نے اپنے مشیر کی صلاح سے مادھو بھاٹ کو سلطان شہاب الدین کے پاس غزنین بھیجا اور مدد مانگی۔ سلطان تو ایسا موقع خدا سے چاہتا تھا۔ پرتھی راج کو مغلوب کرنے کی خواہش

سے فوراً چل کھڑا ہوا۔ پرتھی راج کو نیتی راو کھتری نے یہ خبر بھیج دی۔ اس پر پرتھی راج نے اننگ پال کے پاس ایلچی بھیج کر پیغام دیا کہ آپ کو اول تو سلطنت دینی نہیں چاہیے تھی۔ اسی وقت سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیے تھا۔ اب جب آپ نے دے دی ہے اور میں نے ہاتھ پھیلا کے لی ہے تو آپ واپس کیوں مانگتے ہیں۔ بہر حال یہ یاد رکھیے کہ جس طرح ستارہ ٹوٹ کر واپس نہیں جا سکتا اسی طرح آپ کو اس زندگی میں تو سلطنت واپس مل نہیں سکتی۔ خدا را آپ بدری ناتھ جائیے اور عبادت الٰہی میں اپنی زندگی کے باقی ایام بسر کیجیے۔ آپ سلطان غوری کے بھروسے پر نہ رہیے۔ اسے تو ہم نے کئی مرتبہ باندھ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ قاصد نے سردار جا کر یہ پیغام اننگ پال کو دے دیا۔ اس کے تو گویا مرچیں لگ گئیں۔ اچھل پڑا اور فوراً ایک قاصد غزنین بھیجا اور لکھا کہ جلد تشریف لایئے ہم اور آپ مل کر دلی فتح کریں گے۔ شہاب الدین فوج لے کر چلا۔ اس کے ساتھ تتار خاں۔ خان خان۔ خورسان خان۔ معروف خاں۔ کلیم خان: کمام۔ میر ناصر۔ الوخاں عالیل وغیرہ تھے۔ دریائے سندھ پار کر کے اور بیس ہزار فوج دے کر سلطان نے تتار خاں کو اننگ پال کے پاس ہر دوار بھیجا۔ راجہ اننگ پال تتار خاں کے ساتھ بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا۔ ساتھ ہی اس نے بہت سے گھوڑے خرید لیے اور فوج کی بھرتی شروع کر دی۔ تین سو سردار جو اننگ پال کے ساتھ بیراگی ہو گئے تھے انھوں نے بھی ہتھیار سنبھال لیے تتار خاں نے اننگ پال کو لے کر کوچ کیا اور اس کو دو یوجن (آٹھ کوس)

کے فاصلے پر ٹھہرا کر خود آگے بڑھا اور سلطان کو اس کی آمد کی اطلاع دی وہ فی الفور سوار ہوا اور انگ پال کو ہاتھوں ہاتھ لے گیا۔ دونوں آنے والی جنگ کے متعلق بڑی محبت کے ساتھ مشورہ کرنے لگے۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ اگر پرتھی راج خود حاضر ہو جائے تو اس کی جان بخشی کر دی جائے۔ سلطان نے پرتھی راج کو پیغام بھیجا کہ تم بڑی غلطی کرتے ہو جو انگ پال کو سلطنت واپس نہیں دیتے۔ اگر واپس دینا نہیں چاہتے تو آکر ہم سے لڑو۔ اس پیغام کے پہنچتے ہی پرتھی راج نے نقارۂ جنگ بجوایا۔ ادھر سلطان نے بھی تیاری کا حکم دیا اور جاسوسوں نے یہ خبریں اپنے لشکر میں پہنچا دیں۔ پرتھی راج میدان میں آدھمکا۔ سلطان نے تتار خاں کو ہراول میں، معروف خاں کو میسرہ میں اور خورسان خاں کو میمنہ میں جگہ دی اور انگ پال کو قلب میں رکھا اور خود عقب میں رہا۔ پرتھی راج نے اپنی فوج میں کہلا بھیجا کہ انگ پال پر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے۔ فوجیں بڑھیں اور بھڑیں۔ کیماس نے بڑی دلاوری دکھائی۔ عین دارو گیر میں چامنڈ رائے نے شہاب الدین کو پکڑ لیا۔ پرتھی راج نے سلطان کو توقیف میں رکھا مگر انگ پال کا دربار میں بڑے احترام کے ساتھ استقبال کیا اور خود اس کے قدموں میں گر گیا۔ اب شاہ کو دربار میں بلایا گیا۔ اس کے آنے پر پرتھی راج نے انگ پال سے کہا کہ آپ اتنے بڑے دانشمند ہو کر اس شاہ کے فریب میں کیونکر آ گئے۔ گہلوٹ سردار نے کہا کہ اس میں مہاراج انگ پال کا کوئی قصور نہیں۔ یہ فتنہ دیوان نے اُٹھایا تھا۔ چامنڈ

راے نے کہا بُری صحبت کا یہی نتیجہ ہے لوگ ایسی باتیں کہتے رہے اور اننگ پال سر جھکائے سُنتا رہا۔ پرتھی راج نے سُلطان پر بیس ہاتھی، سو باز اور دو لاکھ رُپے جُرمانہ کیا۔ یہ جُرمانہ سُلطان نے قبول کیا اور آزاد کر دیا گیا۔

گگھر کی لڑائی

اُنتیسویں داستان

پرتھی راج دلی کا انتظام کیاس کے سپرد کر کے اور خود سات ہزار فوج ساتھ لے کر شکار کو چل دیا۔ جاسوسوں نے یہ اطلاع غزنین میں شہاب الدین کو پہنچا دی۔ سلطان نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک پرتھی راج پر فتح نہ پالوں گا تسبیح ہاتھ میں نہیں لوں گا یہ موقع غنیمت جان کر مدد کے لیے خورسان۔روم۔حبش۔بلخ وغیرہ کو خطوط لکھے اور جب فوجیں جمع ہوگئیں سلطان پانچ لاکھ فوج کے ساتھ دس دس کوس کی منزلیں طے کرتا ہوا روانہ ہوا۔ مخبروں نے یہ اطلاع پرتھی راج کو پہنچا دی وہ سنتے ہی تیر کی طرح سے روانہ ہوا اور دریائے گگھر پر آپہنچا۔ شہاب الدین کی فوج میں لوہانی۔حبشی ازبک۔ہمیر۔کلیانی۔رومی۔سربانی عراقی مغل اور دوسری ذاتوں کے لوگ تھے۔ ہراول میں تتار خاں قلب میں سلطان۔ دونوں بازوؤں پر خورسان خاں اور نصرتی خاں اور عقب میں رستم خاں تھے۔ اس ترتیب سے غوری بادشاہ نے دریا عبور کیا اور فوجیں باہم مقابل ہوئیں۔ جنگ کے پہلے ہی دن ایک ہزار میردں، (مسلمانوں) نے کیاس کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ تتار خاں زخمی ہوا۔ ادھر کیاس گھائل ہوا۔ جیت

راؤ نے بڑھ کر اسے بچایا۔ چامنڈ راؤ اس زور شور سے لڑا کہ شاہی فوجوں میں تہلکہ مچ گیا۔ لڑائی کا رنگ بگڑتا دیکھ کر سلطان اپنا سر دھننے لگا۔ اتنے میں جیت راؤ اور خورسان خاں کا مقابلہ ہُوا۔ اِدھر نصرتی خاں اپنے ایک لاکھ پایک لے کر آگے بڑھا اور گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ نصرتی خاں مارا گیا۔ اس موقعہ پر بعض اشعار بحر متقارب مثمن سالم میں ملتے ہیں جو بھجنگی کہلاتی ہے۔ شاعر نے سجع کی خاطر سے حشو یات و مہملات تک کو داخل کر لیا ہے:-

مچے کوہ کوہن بہے سارسارن	چکیں چکیں کرارن سو دھارن
بھکیں بھکیں بہے زتر دھارن	سنکیں سنکیں بہے بان بھارن
ہنکیں ہنکیں بہیں پیل بھیلن	ہلکیں ہلکیں مچی کھیل ٹھیلن
بہے ہتھ پر مار سردار سارن	پرے سین گوری بہے زتر دھارن

اتنے میں ایک لاکھ کالنجروں نے دھاوا بول دیا اس چپقلش میں کنہ کی آنکھ کی پٹی اتر گئی۔ کالنجروں کے حملے سے سلطانی فوج کے پانو اکھڑ گئے اور کنہ چوہان نے اپنی کمان ڈال کر سلطان کو کھینچ لیا اور قید کر لیا۔ پجون راؤ نے 'میروں' (مسلمانوں) کو کاٹ چھانٹ کر ڈھیر کر دیا۔ کنہ سلطان کو اپنے گھر لے آیا پھر وہاں سے اجمیر لے گیا جہاں قلعے میں اسے قید رکھا گیا۔ بیشمار مال غنیمت پرتھی راج کے ہاتھ لگا۔ راجہ کو سب سرداروں نے مل کر مشورہ دیا کہ اس مرتبہ سلطان کو قتل کر کے قصہ پاک کر دیا جائے۔ کنہ نے کہا کہ اب کے تو اسے پنجاب دیس لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔ پرتھی راج نے کنہ کی بات مان لی۔ کنہ شاہ کو اجمیر سے دلّی لایا۔

شاہ نے کنہ کو ایک قیمتی جواہر دیا اور پرتھی راج کو اپنی تلوار نذر کی اور قرآن بیچ میں دے کر کہا کہ اب میں نے قسم کھالی ہے کہ آپ کے خلاف کبھی جنگ نہیں کروں گا۔ پرتھی راج نے لوہانا کے ساتھ کچھ فوج دے کر شاہ کو پنجاب بھیج دیا جہاں اس کو آزاد کر دیا گیا۔ جب شاہ ایک بار ملو گیا تتار خاں آ کر شاہ سے ملا۔ غزنی پہنچ کر شاہ نے اپنے فدیہ کے سات ہاتھی اور پچاس گھوڑے لوہانا کے حوالے کر دیے۔ لوہانا غزنیں سے رخصت ہو کر دلی پہنچا۔ پرتھی راج نے ان ہاتھی گھوڑوں میں سے ایک ایک ہاتھی اور ایک ایک گھوڑا ہر سردار کو انعام میں دیا۔

پیپا یدّھ

اکتیسویں داستان

سبھا میں پرتھی راج اور اس کے سامنت بیٹھے ہیں۔ کبھی اُجین، کبھی دھار اور کبھی دیواس پر چڑھائی کا منصوبہ باندھا جا رہا ہے۔ آخر یہ ٹھہری کہ جے چند پر چڑھائی کی جائے، بیساکھ سدی ۸ حملے کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مقررہ پر فوج روانہ ہوئی، ادھر شہاب الدین نے یکایک آکر راستہ روک دیا اور ڈٹ کر جم گیا راجہ کی اجازت کے بغیر بعض سردار یعنی چامنڈ رائے، چیت سی، لوہانا آجان باہو جنگ کے جوش میں پانچ کوس آگے بڑھ گئے اور خورسان خاں پر حملہ آور ہوئے۔ پرتھی راج اُجین کی جاترا کے لیے بڑھا۔ شہاب الدین نے جے چند سے مدد لے کر اس کا راستہ روکا۔ بہادر راجپوتوں نے خوب داد شجاعت دی۔ ہاسب خاں (آصف خاں ؟) اور خورسان خاں عین معرکے میں قتل ہوئے۔ مسلمانی فوج کے پانوُ اکھڑ گئے پیپ پڈھیار نے سلطان کو قید کر لیا اور شہاب الدین کا بھائی حجاب خاں مارا گیا۔

جیت راو یدّھ

چونتیسویں داستان

پرتھی راج اطمینان کے ساتھ دلی میں راج کر رہا ہے۔ ڈھائی سال کے بعد کھٹوبن میں شکار کھیلنے کے لیے جاتا ہے اور نیتی راو یہ خبر شہاب الدین کو پہنچا دیتا ہے۔ پرتھی راج کھٹوبن پہنچا۔ شاہ کا قاصد بھی وہیں پہنچا اور پیام دیا کہ حسین کو شاہ کے حوالے کر دو۔ پرتھی راج نے کہا اے ڈھیٹ بسیٹھ تو جلدی بھولا کہ تھوڑے دنوں پہلے کون ہارا اور کون جیتا تھا۔ کہاں دلی اور کہاں غزنین بھلا سوچ تو میں نے کئ دفعہ تیرے آقا کو قید کیا۔ اب پھر وہ حسین کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ آخر جنگ کی نوبت آئی اور دونوں فوجیں ایک دوسرے کی طرف بڑھیں شہاب الدین دریائے سندھ تک آگیا اور پرتھی راج اس کی طرف بڑھا۔ شہاب الدین نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ اب کے پرتھی راج کو ضرور گرفتار کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بھاگ جائے۔ عین وقت پر جمسوز خاں اور نوروز خاں نے فوجیں تیار کرلیں۔ جب دونوں لشکر مقابل ہوئے اور جنگ کے نقارے بجنے لگے۔ بہادر لوگ ان کی آواز پر ناچنے لگے۔ لڑائی نیزے کے ساتھ شروع ہوئی۔ سپہر کو مقابل سے نکل کر شہاب الدین نے پرتھی راج پر حملہ کر دیا۔ لیکن پرتھی راج نے اپنی دلاوری سے دشمن کی فوج کے چھکے چھڑا دیے

شام کو لڑائی موقوف ہوئی۔ دوسرے دن بھر رات رہے سے جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آج لڑائی بڑی سخت رہی۔ بدقسمتی سے شہاب الدین اپنے ہاتھی سے گر پڑا۔ چوہانوں کے لشکر نے اس پر زور باندھا اور سلکھ راج نے شاہ کو مقید کرنے کی غرض سے حملہ کیا۔ مسلمانی فوج نے بڑھ کر شاہ کی حفاظت کی اتنے میں جیت راو پرمار کو موقع مل گیا۔ اس نے شاہ کو قید کر لیا اور سیدھا پرتھی راج کے سامنے لے گیا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ مسلمانوں نے بھاگ کر جان بچائی اور ہندو فوج میں نقارۂ فتح بجنے لگا۔

ہنساوتی وواہ

چھتیسویں داستان

پرتھی راج شکار کے لیے کٹھوپور گیا۔ رن تھنب میں راجہ بھان راج کرتا تھا۔ اس کے ہنساوتی نامی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ چندیری میں ششوپال بنسی پنچائن نامی راجہ کا راج تھا۔ چندیری کے راجہ نے ہنساوتی کے حسن و جمال پر شیفتہ ہوکر رن تھنب کو ایک ایلچی بھیجا اور بر مانگا۔ قاصد نے خط راجہ کے حوالے کیا اور جواب مانگا۔ رن تھنب کے راجا بھانو رائے نے اس پیغام پر خفا ہوکر جواب دیا کہ میں تمھارے راجا کے رُعب میں نہیں آتا۔ میں اس سے جنگ کروں گا۔ چندیری کے راجا نے ایک اور قاصد اس کی فہمائش کے لیے روانہ کیا اور دوسرا قاصد شہاب الدین کی خدمت میں مدد طلب کرنے کے لیے بھیجا۔ بھانو رائے نے قاصد کی بات نہ مانی۔ اِدھر غزنیں سے راجہ پنچائن کی امداد کے لیے شہاب الدین نے نوری حجاب اور کیلی خاں کو روانہ کر دیا۔ چندیری کا راجا دونوں فوجیں ساتھ لے کر رن تھنب کی طرف چلا۔ بھان نے پرتھی راج سے مدد طلب کی۔ خط پڑھ کر پرتھی راج نے سمر سنگھ جی کے پاس کنہ کو روانہ کیا اور کنہ نے سمر سنگھ جی سے ساری کیفیت من وعن بیان کر دی۔ راول جی نے فوج کی تیاری

شروع کردی اور کنہ سے کہا کہ ہم وقت پر آملیں گے۔ یہاں سے رن تھنبھ صرف ۶۶ کوس ہے۔ کنہ نے عرض کی کہ پرتھی راج مہاراج دلی سے اس ماہ کی تیرس کو چلے ہیں اور راجا بھان پر تو ان دنوں آفت کا پہاڑ ٹوٹتا ہوا ہے۔ راول جی نے فرمایا۔ ہماری قوم کا یہ دستور نہیں کہ کہی ہوئی بات سے ٹل جائیں۔ کنہ نے چلتے وقت ان سے کہہ دیا کہ ۱۳ر کو جنگ ہے۔ سوموار کی دسویں کو سمر سنگھ جی کی جاترا کی مہورت آئی۔ جاترا سے فراغت پاکر سمر سنگھ جی رزم گاہ کی طرف چلے۔ پرتھی راج مشرق میں اور راول جی مغرب میں تھے۔ لڑائی شروع ہوئی اور راول جی چندیری اور رستم خاں کی فوجوں کے درمیان گھر گئے۔ پرتھی راج راول جی کی مدد کو آیا۔ اب راول جی اور چندیری کے راجا کا مقابلہ ہوا۔ راجہ مارا گیا۔ ادھر حسین خاں اور کنہ رائے زخمی ہوئے۔ جنگ ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہنسا وتی کا بیاہ پرتھی راج کے ساتھ رچایا گیا۔ اتنے میں خبر آئی کہ دلی پر مسلمان فوج نے حملہ کر دیا۔ صرف ساٹھ ساونتوں نے اس فوج کا مقابلہ کیا۔ دوسرے روز خان سرطان نے حملہ کیا۔ لیکن اس وقت تک پرتھی راج بھی جنگ کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس کے شامل ہوتے ہی ہوا کا رخ بدل گیا۔ مسلمانوں نے جی چھوڑ دیا۔ فیروز خاں مارا گیا اور فاتحین کے ہاتھ ایک لاکھ کا سامان آیا اور پرتھی راج اپنی نئی رانی کی محبت میں سرشار رہنے لگا۔

پہاڑ رائے سے

سینتیسویں داستان

ایک روز شہاب الدین نے تتار خاں سے پوچھا کہ پرتھی راج کی کوئی تازہ خبر بھی آئی، اس نے کہا اس کی حالت بدستور ہے۔ شاہ نے کہا اب تو اس پر چڑھائی کرنی چاہیے۔ حکم کی دیر تھی۔ دوسرے دن شاہ کے محل کے آگے فوجیں جمع ہو گئیں۔ شاہ نے کوچ کرکے دس کوس پر جاکر پڑاؤ کیا۔ اس وقت اس کے ساتھ یہ سردار تھے۔ تتار خاں۔ خورسان (خاں) رستم خاں۔ بازید میر۔ منصور۔ سیرن حجاب۔ ہمند۔ خان جہان۔ نصرت۔ اعظم۔ ممریز (خاں)، ملتان خاں۔ بھارتھ خاں۔ میر آتش وغیرہ۔ دیوان خانے میں تمام امراء جمع ہوئے۔ مشورہ ہونے لگا۔ میر خاں۔ تتار خاں اور خورسان خاں نے اپنی اپنی رائیں دیں۔ شاہ نے لورک رائے کھتری کو کاغذ دے کر دھرماین کے پاس دلّی بھیجا۔ وہ جاکر دھرمائن سے ملا۔ اس کایستھ نے کاغذ پڑھ کر بڑا افسوس کیا۔ سیدھا دربار میں گیا اور کیماس کو وہ خط دے دیا تین بار سلام کیا اور کہا کہ اب جو کچھ کرنا ہو کرلو۔ شیر اتر کر آرہا ہے۔ جب پرتھی راج نے خط سنا اس نے مشورہ کے واسطے اپنے ساونتوں کو بلایا اور جنگ کی رائے قرار پائی راجا نے پاؤ لاکھ فوج اکٹھی کی اور

لڑائی کے لیے بڑھا اور حریف کے مقابل ہوتے ہی حملہ کر دیا۔ دونوں فوجیں آپس میں مل گئیں اور سپاہی جان توڑ کر لڑے۔ شام کو لڑائی بند ہوئی۔ دوسرے دن پھر تلاقی فریقین ہوئی، دونوں طرف کے بہادروں نے داد جوانمردی دی۔ ویرم دیو زخمی ہوا اور فیروز خاں مارا گیا۔ دن بھر جنگ جاری رہی۔ آخر پہاڑ رائے کو ایک موقعہ مل گیا اس نے شاہ کے ہاتھی کے تلوار کا ایک ہاتھ مارا۔ ہاتھی لہرا کر گرا۔ شاہی فوج بے دل ہو کر بھاگ نکلی۔ شاہ اپنی فوج کو بھاگتا دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور پہاڑ رائے نے جا کر اسے پکڑ لیا اور لا کر پرتھی راج کے سامنے پیش کیا۔ راجہ نے حسب دستور قدیم جرمانہ وصول کر کے چھوڑ دیا۔

کیماس جدّھ

تینتالیسویں داستان

ایک مرتبہ شہاب الدین تتار خاں سے پرتھی راج کا تذکرہ چھیڑتا ہے۔ تتار خاں اثنار گفتگو میں کیماس کی شجاعت کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ شاہ لشکرکشی کرتا ہے۔ دریاے سندھ پار کرکے پارس پور میں خیمہ زن ہوتا ہے۔ دلی سے جاسوس آتا ہے۔ اور پرتھی راج شکار کھیلنے جاتا ہے۔ چیت بدی دوج سمت ۱۱۴۰ کو شاہ آگے بڑھتا ہے اس کے ساتھ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی تھے۔ جب شاہ کے حملے کی خبر پرتھی راج کو پہنچتی ہے۔ وہ اپنے سامنتوں اور کیماس سے مشورہ لیتا ہے۔ مسلمانی فوجوں کے سرداروں کے یہ نام ہیں:۔ تتار خاں خورسان خاں۔ رستم خاں۔ خان دریا۔ منار خاں تاج خاں۔ فتح خاں۔ پہاڑ خاں۔ آلو خاں۔ عالم خاں۔ گکھڑ خاں۔ کمال خاں۔ معروف خاں۔ حبیب خاں حبشی۔ شمس الدین خاں۔ غیاث خاں۔ چتر خاں وغیرہ شہاب الدین کی فوج نے کھٹّربن کا رخ کیا۔ جب شاہ سارونڈے آچکا۔ پرتھی راج نے چامنڈ راے کے مشورے سے فراہمی افواج کا حکم دیا۔ شاہ نے لاڈنون میں مقام کیا اور پرتھی راج نے پنچوسر میں ڈیرہ ڈالا۔ کیماس کو خبر لگی۔ کنہ کو ہراول میں مقرر کیا۔ راجہ نے اپنی فوج کو پانچ حصوں میں منقسم کردیا۔ شاہ نے

بھی ایسا ہی کیا۔ دونوں فوجیں میدان جنگ میں ایک دوسرے سے
دو کوس کے فاصلے پر ٹھہریں۔ پرتھی راج کو یونون، (مسلمانوں) نے
تنہا پاکر گھیر لیا۔ چامنڈ رائے نے اپنی غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیا
اتنے میں لال خاں۔ معروف خاں۔ حسن خاں اور آکوب (یعقوب) خاں
نے چامنڈ رائے کو گھیر لیا۔ کیماس چامنڈ کی مدد کو آیا۔ اور چامنڈ نے
چاروں "یونی" سرداروں کو ہلاک کر ڈالا۔ اب لال خاں آگے بڑھا
وہ بھی مارا گیا۔ دوپہر کے بعد دونوں فوجوں میں سخت معرکہ ہوا۔
اپنی فوج کو مغلوب ہوتا دیکھ کر شہاب الدین کے تیر باراں نے کئی
ہندو سورماؤں کو زخمی کیا۔ کیماس اور چامنڈ رائے نے شاہ پر حملہ
کیا۔ یونی سردار اس کی حفاظت کے لیے بڑھے۔ حسین مارا گیا۔
اب چامنڈ رائے اور کیماس نے دو طرف سے شاہ کو گھیر لیا۔
اور اس کے ہاتھی کو مار گرایا۔ دونوں بھائی شاہ کو گرفتار کر کے
پرتھی راج کے سامنے لے گئے۔ آخر پرتھی راج نے دلی پہنچ کر اور
ڈنڈ لے کر شاہ کو چھوڑ دیا۔ ڈنڈ میں بارہ ہاتھی اور ایک ہزار
باز تھے۔ شہاب الدین جرمانہ ادا کر کے غجن پور (غزنی) چل دیا۔

ہانسی پور پرتھم جدھ

اکانویں داستان

دلی کے راج کی سرحد میں قنوج کی فوجوں نے آکر زیادتی کرنی شروع کردی۔ پرتھی راج نے ہانسی پور کی حفاظت کے لیے کئی سرداروں کو روانہ کردیا۔ اس سے فارغ ہوکر راجہ شکار کو چل دیا۔ ادھر بلوچ پہاڑی نے شہاب الدین کو لکھا کہ اگر شاہ حکم دے اور میری مدد کرے تو میں ہانسی چھین لوں۔ پرتھی راج پورے ایک سال اجمیر میں رہا۔ جب بلوچ کا خط شاہ کو ملا بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنی بیگموں کو حج کی غرض سے مکے بھیج دیا اور بلوچ پہاڑی ان کی حفاظت کے لیے مقرر ہوا۔ بلوچ نے راستہ دینے کے لیے بجون رائے سے کہا۔ رگھوبنس رام نے راستہ دینے سے انکار کردیا۔ بیگم مکے کے ارادے سے بڑے مال و متاع اور ساز و سامان کے ساتھ چلی تھیں۔ چامنڈ رائے نے بیگم کو لوٹنے کا ارادہ کیا۔ بلوچ پہاڑی سامنتوں کے پاس خود گیا مگر انھوں نے اس کی ایک نہ سُنی اور رات کے وقت حملہ کرکے بیگم کو لوٹ لیا۔ بیگم کے تمام ہمراہی بھاگ گئے اور بیگم نے سامنتوں سے بڑی التجائیں کیں۔ چامنڈ رائے بیگموں کو لوٹ کر ہانسی پور چلا گیا اور بیگمیں اپنی فریاد لے کر شہاب الدین کے پاس گئیں۔ شہاب الدین اپنی ماں کی فریاد

سُن کر نہایت مغموم اور برہم ہوا۔ اُس نے اپنے درباریوں سے سب حال کہا اور والدہ کی رام کہانی سنا کر دلی پر چڑھائی کا حکم دیا۔ تتار خاں نے شاہی حکم سے مدد کے لیے خط بھیجے۔ شہاب الدین نے وزیر سے چوہان پر فتح پانے کی تدبیر پوچھی۔ تتار خاں نے کہا آسی پور (ہانسی) پر حملہ ہونا چاہیے۔ یہ رائے سب نے پسند کی۔ دربار میں بلوچ پہاڑی کو بلایا گیا۔ شاہی جاسوس سندھ پار کر آئے ان کے بعد شاہی فوج چلی۔ تتار خاں اور خورسان خاں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ تتار خاں دس کوس آگے تھا آخر شاہی فوجیں آسی پور کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوئیں۔ شاہی فوج میں یہ اقوام تھیں۔ خندھاری۔ حبشی۔ رومی۔ خلجی۔ اچی خرلیش (قریش)، بخاری۔ سید۔ سیلانی۔ شیخ۔ بھٹی۔ میدانی۔ چوگتا (چغتا)، پیرزادہ۔ لوہانی۔ ترکام۔ بلوچ وغیرہ۔ شاہی فوج نے ہانسی کو چاروں طرف سے محصور کر لیا اور زور کر کے قلعے کے دروازے کو توڑ دیا مگر چامنڈ رائے اور دیگر ساونت دلیرانہ مدافعت کرتے رہے۔ شام پڑے لڑائی بند کر دی گئی۔ صبح پھر جنگ شروع ہوئی اور ترک اور ہندو ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ جنگ کا بیان بحرِ متقارب میں آتا ہے جس کا آخری شعر ہے ؎

کٹھن سرت اُبھر سرن لوک لیتا پھری فوج تاتار کی کھائی گستی

جلیل خاں نے ہندوؤں پر دھاوا کیا۔ لڑائی بڑے زور شور کے ساتھ جاری رہی۔ آتشیں اسلحہ کا استعمال عمل میں آیا۔ آخر شاہی فوج کو ہزیمت ہوئی اور مسلمان بھاگ نکلے۔

دوتیہ ہانسی جدھ

باونویں داستان

جب سلطان نے سنا کہ تتار کی فوج کو شکست ہوگئی نہایت برہم ہوا اس نے بذات خود ہانسی پر دوبارہ حملے کا عزم کیا اور فرمان بھیج کر روم۔ ہریو (ہرات) بھنبر۔ بھکر۔ سمرقند۔ کسقند۔ بلخ۔ مکران قندل داس۔ ازبک۔ خونکار۔ عراق۔ قندھار سے فوجیں طلب کیں اور ہانسی کی طرف کوچ کیا۔ یہاں پہنچ کر شہاب الدین نے ساونتوں کو کہلا بھیجا کہ قلعہ خالی کر دیں ساونتوں نے آپس میں مشورہ کیا بعض کی رائے تھی کہ قلعہ چھوڑ دیا جائے مگر بعض مخالف تھے تتار خاں کے ساتوں بھائی تلواریں سونت کر قلعے پر حملہ آور ہوئے قلعے کی ایک ہزار سپاہ قتل ہوگئی لیکن ساونت پھر بھی قلعہ چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ اس موقع پر پرتھی راج نے خواب دیکھا جس میں اس کو ہانسی پور کی اس زار حالت کا نقشہ نظر آیا اس نے گھبرا کر کیماس سے مشورہ کیا اس نے کہا کہ راول سمر سنگھ جی کو بلایئے انھیں بلایا گیا اور وہ ہانسی کی طرف روانہ ہوئے اتنے میں ساونت قلعہ چھوڑ کر پرتھی راج کے پاس چلے آئے۔ راجہ نے ان کو تسلی دی اور خود ان کی حمایت میں ہانسی پور کی طرف روانہ ہوا۔ راول جی چونکہ ان سے پہلے ہانسی پور پہنچ چکے تھے راول جی کے آتے

ہی 'یونی' (مسلمانی) لشکر نے ان کے ساتھ جنگ شروع کر دی
رادل جی مردانہ وار لڑتے رہے۔ اب مسلمانوں کی طرف سے
تتار خاں نے حملہ کیا اور گھمسان کا رن پڑا۔ عین اس وقت
پرتھی راج پہنچ گئے۔ راجا کے آتے ہی شاہی فوج کا بل
آخر تتار خاں مایوس ہو کر فرار ہوا اور رادل جی اور پرتھی رار
مہم سر کر کے واپس چلے گئے۔

پجّون ھوبا نام پرستاؤ

ترپنویں داستان

ایک دن چند کی بیوی نے اپنے شوہر سے دریافت کیا کہ ھوبا کی رزم کس طرح ہوئی تھی؛ اس نے جواب میں کہا کہ خورسان خاں نے ایک مرتبہ ہوبے پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ سوار اور بے تعداد پیادے تھے اور امرا میں سے یہ لوگ اس کے شریک تھے۔ نصرت خاں۔ خورسان خاں۔ قریش خاں اور اس فوج نے ہوبے کا رُخ کیا۔ نڈھور نے قاصد پرتھی راج کے پاس بھیجا اور غنیم کی آمد کی کیفیت عرض کردی۔ پرتھی راج نے دربار میں پوچھا کہ ہوبے کی مدافعت کے لیے کس سردار کو بھیجا جائے۔ سب نے یہ رائے دی کہ پجّون رائے کو بھیجنا چاہیے اور ہر شخص نے اس کی ثنا خوانی کی۔ پرتھی راج نے اس رائے سے اتفاق کیا اور پجّون کو جاگیر اور سروپا دے کر اس مہم پر روانہ کیا۔ یہ دلاور جاتے ہی شہاب الدین کی فوج سے گتھ گیا اور نہایت جوانمردی سے لڑا۔ آخر کار خورسان خاں۔ فیروز خاں اور خوب خاں کو بھاگ کر ہی جان بچانی پڑی اور پجّون جی فتح کے شادیانے بجاتے واپس لوٹے اور شاہ ہزیمت کھا کر واپس غزنیں لوٹ گیا۔ دلی پہنچنے پر پجّون جی کی خوب آؤبھگت ہوئی۔

پجّون پاتساہ جدّھ

چوّنویں داستان

ہوبے کی فتح کے بعد پجّون جی کنہ چوہان سلکھ۔ بڑگوجر اور نڈھور کو ہوبے میں چھوڑکر خود ناگور گئے۔ بادشاہ شکست کھاکر غزنین لوٹ گیا اور پجّون جی کو مغلوب کرنے کی فکر میں پڑگیا۔ ادھر دھرمائن کایستھ نے بادشاہ کو خط لکھا جس میں یہاں کے تازہ حالات درج تھے۔ شہاب الدین نے وزیر کو پجّون رائے کے پاس قاصد بھیجنے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی تین لاکھ فوج کے تیار ہوجانے کا فرمان بھیج دیا۔ یونی قاصد ناگور پہنچا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں فوج لے کر آتا ہوں تم جنگ کے لیے تیار رہو پجّون جی شاہ کا فرمان پڑھ کر خوب ہنسے اور دو ٹوک دلیرانہ جواب بھیج دیا۔ قاصد نے جواب غزنین پہنچایا اور ناگور میں قلعہ بندی ہونے لگی۔ ادھر مسلمان فوجوں نے آکر ناگور کو گھیرلیا۔ اس سے راجپوتی فوج میں بد دلی پھیل گئی۔ مگر پجّون جی نے ڈھارس دی۔ پجّون جی نے رات کے وقت مسلمانوں پر شبخون مارا۔ پہرے دار بیدار تھے۔ انھوں نے شور مچایا اور مسلمانی فوج ہوشیار ہوگئی اور جنگ ہونے لگی۔ پجّون کے فرزندوں نے خوب داد شجاعت دی۔ اور پجّون رائے نے

سلطان کو قید کرلیا اور اسے لے کر قلعے میں چلا گیا۔ اس پر یونی فوج کے پانو اٹھ گئے۔ پرتھی راج نے پندرہ ہزار باز جرمانے میں وصول کرکے شاہ کو آزاد کیا اور کہا سنو سلطان! تم بڑے بہادر کہلاتے ہو۔ بار بار جرمانہ ادا کرکے اپنی جان بچاتے ہو مگر باز نہیں آتے۔

درگا کیدار سمیو

اٹھاونویں داستان

پرتھی راج کیماس کی وفات پر بے حد غمگین ہے۔ ساونتوں نے انکے دل بہلاؤ کے لیے یہ صورت نکالی کہ اسے شکار لے جایا جائے اس پر راجہ بھی رضامند ہوگیا اور سامان کرکے چل دیا۔ شہاب الدین نے اپنا جاسوس دلی بھیجا۔ دھرمائن کایستھ نے مفصل کیفیت لکھ دی جاسوسوں نے یہ خط غزنین بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ درگا بھاٹ نے جو شہاب الدین کا بھاٹ ہے۔ علم و فضیلت میں کوئی چند پر غالب آنے کی دیوی سے مراد مانگی۔ دیوی نے جواب دیا کہ تو اوروں پر فائق آسکتا ہے۔ مگر چند پر غلبہ نہیں پاسکتا۔ اس پر درگا نے خواہش کی کہ خیر میں پرتھی راج سے ملنا چاہتا ہوں۔ دیوی نے اس کی یہ آرزو قبول کرلی دوسرے دن علی الصباح درگا بھاٹ شاہ کے دربار میں گیا اور بادشاہ سے رخصت مانگی ؎

کہی باعبانی بہانی سو علی ۔۔۔ دیو ساہ سیکھن چلے بھٹ دتی

تتار خاں نے بھاٹ سے کہا کہ دشمن کے گھر مانگنے جانا مناسب نہیں۔ اس موقعہ پر بادشاہ نے کوی چند کی تعریف کی اور کہا کہ دیکھو وہ تو کبھی غزنین نہیں آیا۔ بھاٹ اس پر لاجواب ہوگیا۔ مگر شاہ نے اس کو رخصت دے دی۔ بھاٹ دربار سے آکر دلی کے سفر کی تیاری میں مشغول ہوگیا اور غزنین سے چل کر ڈھائی مہینے کے بعد پانی پت پہنچ گیا۔ جہاں پرتھی راج شکار کے لیے مقیم تھا۔ راج کنور رینسی نے تلوار سے شیر مارا تھا اور پانی پت کے میدان میں ڈیرے کھڑے تھے وہیں گوٹ منائی جانے لگی۔ ٹھیک اس وقت درگا کیدار پہنچتا ہے اور پرتھی راج کو سلام کرکے اس کی مدح سرائی کرتا ہے۔ راجا اس کو عزت کی جگہ بٹھاتا ہے۔ اب دونوں شاعروں میں سحر و طلسم میں مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ درگا اپنے عمل سے مٹی کے برتن سے آگ کا شعلہ نکالتا ہے۔ کوی چند اس کے جواب میں گھوڑے سے اسیر باد کہلواتا ہے۔ جواب میں درگا پتھر کی چٹان کو اپنے سحر سے متحرک کرتا ہے اور اس میں انگوٹھی بٹھا دیتا ہے۔ کوی چند اپنے علم سے چٹان کو پانی بناکر بہا دیتا ہے اور انگوٹھی نکال لیتا ہے۔ درگا اور اور انوکھے عجائبات دکھاتا ہے اور چند ان سب کے توڑ کرتا ہے۔ آخرالامر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ کوی چند ان امور میں اپنے حریف پر غالب ہے۔ درگا بھی اس فیصلے کو قبول کرتا ہے اور راجہ کی خدمت میں آداب بجالاتا ہے راجا اور اس کے سادنت درگا کی تعریف کرتے ہیں۔

پرتھی راج درگا کیدار کو پانچ دن اپنے ہاں مہمان رکھتا ہے اور بہت کچھ انعام و اکرام دے کر رخصت کرتا ہے۔ غزنین کے جاسوس

دھرمائن کا خط شہاب الدین کو لاکر دیتے ہیں۔ شہاب الدین اس خط
کی بنا پر پرتھی راج پر چڑھائی کرتا ہے اور تتار خاں فوج کو شاہی
حکم سناتا ہے۔ شاہ کو لشکر کا معائنہ کرایا جاتا ہے اور شہاب الدین
کوچ کرتا ہے۔ ع چڑ چلیو ساہ عالم اسنبھ ۔ سونگ پور میں پڑاو
ہوتا ہے۔ یہاں درگا کیدار اور دیگر جاسوس شاہ سے آکر ملتے ہیں۔

دی دواہ (دعا) تن چرج دس اکایم ساہ سہاب

شاہ نے شاعر سے پرتھی راج کا حال پوچھا۔ اس نے مفصل کیفیت
کہہ سنائی۔ سلطان نے مصاحبوں سے مشورہ کرکے مع فوج آگے
کا رخ کیا۔ درگا کیدار کے باپ نے درگا کو لعنت ملامت کی کہ تو
پرتھی راج کی خبریں لاکر شاہ کو دیتا ہے۔ اس بدنامی کے ازالے کے
لیے درگا کا بھائی پرتھی راج کو مسلمانی لشکر کی آمد کی اطلاع دینے
کے لیے روانہ ہوا۔ کوی داس نے پانی پت پہنچ کر بج میں اس کو
اطلاع دی راجہ نے اسی وقت اپنے ساونتوں کو بلاکر شاہ کی آمد
سے سب کو مطلع کر دیا اور کنہ اسی وقت جنگ کے لیے تیار ہوگیا
اس اثنا میں شہاب الدین بھی آپہنچا اور سہ

خان مصطفےٰ دیل پٹھ رکھے گر یوانن (گریباں)

تتار خاں آدھی فوج لے کر آگے بڑھا اور شاہ باقی لشکر کے ساتھ
عقب میں رہا۔ دونوں لشکر مقابل ہوئے اور گھمسان کا معرکہ
ہونے لگا۔ لوہانا اور پہاڑ راے نے مل کر شاہ پر حملہ کیا۔ شاہی فوج
نے انھیں روکا۔ ان کی امداد کے واسطے ساونت آپہنچے۔ آخر
مسلمانی فوج بے دل ہوکر بھاگی اور ساونتوں نے شاہ کو گھیر لیا۔ لوہانا

نے شاہ کے ہاتھی کو مار دیا اور شاہ پکڑا گیا۔ اس کا تمام سامان لوٹ لیا گیا۔ لوہانا کی بڑی تعریف ہوئی۔ پرتھی راج دلی گیا۔ اور شہاب الدین کو تیس دن قید رکھ کر اور جرمانہ لے کر چھوڑ دیا۔

دھیر پنڈیر پرستاو

چونسٹھویں داستان

۱۰۱۷۴۴

پرتھی راج قنوج سے لوٹ چکا ہے۔ چند سین پنڈیر کے مارے جانے کے بعد اس کا فرزند دھیر پنڈیر سترہ سال کی عمر میں اپنے باپ کا جانشین تسلیم کیا جاتا ہے۔ دھیر جالپا یا جالندھری دیوی کی خاص طور پر پرستش کرتا رہا۔ دیوی نے اسے اپنا جمال دکھایا اور کہا تو کیا مانگتا ہے۔ اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میرا سانگ (نیزہ جو تیس سیر کا تھا) اژدھاتی جیت کھمب میں سوراخ کر دے اور راجا کی نگاہ میں میری سرخروئی ہو۔ دیوی نے کہا جا تیری آرزو قبول ہوئی تو اس کھمب کو ضرور بیدھ دے گا اور راجا تجھ سے بہت خوش ہوگا۔ ہاتھی گھوڑے اور خلعت انعام میں دے گا۔ اور ہم تو تجھ سے اس قدر خوش ہیں کہ آیندہ بھی جب کبھی کوئی مشکل تجھے پیش آئے گی ہم تیری حفاظت کریں گے مگر تو ہماری سمرن ضرور کرتا رہنا۔ دوسرے دن دسہرے کی پوجا کے وقت دھیر پنڈیر موقع پر پہنچا۔ جہاں پرتھی راج اپنے سرداروں کے

فرزندوں کی طاقت کا امتحان کر رہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی تلوار یا سانگ کو اس کھمب پر آزماتا تھا مگر کوئی اس کو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ دھیر نے جاکر ادب سے اپنا سانگ پرتھی راج کی خدمت میں پیش کیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ راجا نے مسکرا کر اس کو کھمب بیدھنے کی اجازت دی۔ اس پہ دھیر نے اپنا گھوڑا اُڑایا اور پورے زور سے سانگ کا ایک ہاتھ اس کھمب پر چھوڑا کہ سانگ کھمب کے پار ہو گیا۔ تماشائیوں نے نعرۂ تحسین و آفرین بلند کیا۔ راجہ نے اسی وقت پانچ ہزار گانْو کی جاگیر کا پٹہ لکھ دیا بسرپا عنایت کیا۔ بیرق والا جھنڈا اور ہاتھی کا نشان دیا۔ دھیر نے انعام و خلعت سے مالا مال ہوکر راجہ سے عرض کی کہ اس قدر مہربانی کے بعد مجھے کوئی خدمت بھی دی جائے تاکہ میں اس کی بجا آوری میں اپنی کوشش صرف کروں۔ پرتھی راج نے کہا ہم چھتریوں کا کام مرنا اور مارنا ہے مگر میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ اور شہاب الدین کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ اس پر دھیر نے عرض کی کہ میں ارشاد عالی کی بجا آوری میں جان سے بھی دریغ نہیں کروں گا اور شہاب الدین کو زندہ گرفتار کر کے آپ کے قدموں میں لا ڈالوں گا۔ دھیر پر راجا کے انعام و اکرام کی بارش اور انتہائی مہربانی نے جیت راو اور چامنڈ راو کو جو پرتھی راج کے درباری امرا تھے آتش حسد میں جلا ڈالا۔ جیت راو نے چامنڈ راو کی طرف آنکھ ماری۔ چامنڈ راو سمجھ گیا اس نے دھیر سے کہا بیٹا دھیر! تمھیں لاف مارنی مناسب نہ تھی

جس بادشاہ کو ہاتھیوں کی سات سات صفیں گھیرے رہتی ہوں اس کو زندہ گرفتار کرنا کوئی مذاق نہیں۔ تم اپنی استعداد کے مطابق بات کرو اور چلو بھر پانی میں اُچھلنے نہ لگو اور یہ ہاتھی اور شیر کو ترازو میں تولنے کا دعویٰ ترک کرو۔ دھیر نے کہا میں چند پنڈیر کا فرزند ہوں۔ جو بات مُنہ سے نکلی ہے اسے پوری کر کے دکھاؤں گا۔ ہوا چلتے دیر لگتی ہے مگر افواہ پھیلتے دیر نہیں لگا کرتی۔ شہر بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ آج دھیر پنڈیر نے بادشاہ کے زندہ گرفتار کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ رات بسے کی بات سو کوس کی خبر لیتی ہے۔ شدہ شدہ یہ بات شہاب الدین کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔

ادھر دلی میں بلبھدر رائے۔ جام رائے جادو۔ پرسنگ رائے کھیچی۔ دیوراد بگری۔ لوہانا آجان واہ اور رام رائے گوجر وغیرہ سرداروں نے ایک خفیہ جلسہ کیا اور اپنی اپنی خدمات کا ذکر کر کے کہنے لگے کہ ہم لوگوں کو لڑتے مرتے اور جان جوکھوں میں ڈالتے عمریں گزر گئیں۔ اس کا یہ صلہ ملا کہ کل کے چھوکرے نے کھمب کو بیدھ دیا اور راجہ نے اسے ہمارے سر پہ لا بٹھایا۔ کسی نے کہا کرنے دو۔ ہم کوئی اس کی حکم برداری کرتے ہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ دھیر کو گرفتار کرا دیا جائے۔ جامنڈرائے نے ارداس کایستھ سے ایک خط شہاب الدین کے نام لکھوایا کہ یہاں چند پنڈیر کے بیٹے دھیر نے تمھیں زندہ گرفتار کرنے کی سوگند کھائی ہے وہ اپنی قسم نباہ سکے گا یا نہیں اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے لیکن یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات خوب نہیں۔ شہر شہر میں چرچا تو ہو گیا۔ دھیر بھادوں کی آٹھ کو

جالندھری دیوی کی پوجا کے لیے کانگڑے جائے گا۔ آپ سے جو کچھ بن سکے کیجیے۔

الغرض بھادوں آیا اور دھیر دیوی کے درشن کرنے چلا۔ چامنڈ راو کا خط پڑھ کر شہاب الدین دل ہی دل میں ہنسا اور اپنے درباریوں سے بولا کہ ایسا کون سورما ہے جو دھیر کو میرے پاس پکڑ لائے۔ یہ سن کر آرائش خاں آگے بڑھا اور اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ساٹھ ہزار گکھڑوں کو ساتھ لے کر کانگڑے کی طرف چل پڑا۔ دھیر ساتویں کو کانگڑے پہنچا اور آٹھویں کو دیوی کے درشنوں کی غرض سے آدھی رات کے وقت مندر میں بیٹھا ہوا تھا کہ گکھڑ آدھمکے اور مندر کو گھیر لیا۔ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر جب دھیر مندر سے نکلا گکھڑوں کے نرغے میں آگیا۔ وہ اسے لے کر چلتے بنے اور دریائے سندھ پر آکر دم لیا۔ کشتیوں کے ذریعے سے دریا سے پار ہوے۔ آگے ہاتھیوں کی ڈاک بیٹھی تھی۔ اس سلسلے میں کانگڑے کے راجا ہولی راو ہاڑا ہمیر نے بھی گکھڑوں کی امداد کی تھی۔ دھیر ساٹھ ہزار گکھڑوں میں گھرا اور نشان کا ہاتھی بنا غزنین پہنچ گیا۔ شہر کے لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے آئے۔ آخر شہاب الدین کے دربار میں پہنچا دیا گیا۔ شاہ نے اسے خطاب کرکے کہا:-

شاہ: چند پنڈیر کے فرزند! دیکھ تو زندہ میرے سامنے اسیر لایا گیا ہے۔ تبا تیری وہ قسم کہاں گئی۔ اس کے بعد بادشاہ میں اور قیدی میں دیر تک سوال وجواب ہوتے رہے۔ جن میں شاہ کا

رویہ دوستانہ اور قیدی کا رویہ بیباکانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ایک دن اپنا دعویٰ ثابت کر دکھاؤں گا اور آپ کو جیتا جاگتا آپ کی فوج میں سے پکڑ کر پرتھی راج کے قدموں پر لے جاکر ڈالوں گا پادشاہ نرم لہجے میں اسے سمجھاتا ہے اور جھٹلاتا ہے۔ لیکن دھیر نہایت آزادانہ اور تلخ تلخ جواب دیتا ہے۔ آخر بڑی تکرار کے بعد تتار خاں کو جو وزیر ہے طیش آتا ہے وہ سیل ہاتھ میں لے کر چاہتا ہے کہ قیدی پر وار کرے۔ لیکن پادشاہ اسے روکتا ہے۔ اس پر تتار خاں بھی قیدی کو سمجھاتا ہے کہ یہ شاہی دربار ہے ادب سے بات کرو۔ واہی تباہی نہ بکو۔ قیدی بیباکانہ لہجے میں کہتا ہے کہ میں اس شان و شوکت اور جاہ وحشم سے مرعوب نہیں ہوں اور صاف صاف کہتا ہوں کہ میں تمھاری آنکھوں کے سامنے تمھارے پادشاہ کو زندہ گرفتار کرکے پرتھی راج کے قدموں میں جا ڈالوں گا۔ یہ سُن کر تتار خاں لال پیلا ہوا۔ تیر کمان میں جوڑ لیا اور چاہتا تھا کہ چھوڑے لیکن پادشاہ نے اس کے ہاتھ سے کمان چھین لی اور کہا کہ قیدی کی جان لینا نامردی ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو اب آزاد کر دیا جائے۔ ہم دشمن پر فوج کشی کرتے ہیں دیکھیں وہاں یہ کیا بہادری دکھاتا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے سرو پا منگاکر اس کو دیا۔ اپنی سواری کا خاص گھوڑا عنایت کیا اور رخصت کر دیا اور کہا کہ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ ہوشیار ہو جاؤ میں آتا ہوں۔
ادھر دھیر رخصت ہوا اُدھر شاہ نے تتار خاں کو دلی

پر چڑھائی کے لیے فراہمی فوج کا حکم دیا۔ دوسرے دن سے فوجیں آنا شروع ہوگئیں اور شاہی دروازے پر اس قدر ہجوم لگ گیا کہ رائی پھینکنا بھی مشکل ہوگیا۔ ان میں رومی۔ بلخی (بلجی) گکھر۔ ترک۔ بلول وغیرہ مختلف ذاتوں کے مسلمان شامل تھے۔ جب فوج جمع ہوچکی۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہوے۔ یہ ہاتھی سُرخ رنگ سے رنگا گیا تھا۔ شاہ نے بھی سُرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ چلتے وقت بُرے شگون نظر آئے۔ تتار خاں نے کہا کہ آج کا کوچ ملتوی کر دیا جائے تو اچھا ہی۔ یہ سُن کر شہاب الدین نے کہا۔ سُنو تتار خاں! ہوگا تو وہی جو خدا کو منظور ہی گر جو جواں مرد اسلام کے لیے شہید ہوئے۔ کیا تم انھیں مردہ سمجھتے ہو۔ ساری زمین خدا کی ہی اور ہم اس کے بندے ہیں۔ بس ایک نماز پڑھ لو اور پھر بسم اللہ کرو۔ دیکھو دنیا کے پردے پر کیا کوئی ایسی جگہ بھی ہی جہاں قاضی نماز نہ پڑھتے ہوں۔ ملّا بانگ نہ دیتے ہوں۔ گاے کی قربانی نہ کی جاتی ہو۔ اور مسلمان کی قبر موجود نہ ہو۔ پیدایش اور موت تو قوانین الٰہی ہیں۔ ان کے خلاف کوئی شخص بھی مداخلت نہیں کرسکتا۔ لہذا ایسی موت بہتر ہی جس میں بقائے نام ہو۔

تتار خاں نے جواب دیا کہ "ارشاد عالی فی الحقیقت قابل غور ہی۔ دیکھیے جس وقت فقیر روشن علی نے دلی میں جاکر دہی جھوٹا کر دیا اور اس قصور میں وہاں کے راجہ نے اس کی انگلی کٹوا دی۔ تب اس نے مکہ شریف میں جاکر فریاد کی۔ درگاہ رسالت

میں اس کی فریاد قبول ہوئی اور نادان راجا کی سزا دہی کا حکم ملا
خواجہ میراں شاہ سوداگروں کے لباس میں روانہ ہوئے۔
میراں صاحب کے پاس بہت سے قیمتی گھوڑے تھے۔ان کی
آمد کی خبر پاکر دلی کے راجا نے سارے گھوڑوں میں انتخاب
ایک گھوڑا خرید لیا اور حضرت میراں شاہ نے جو قیمت مانگی
وہی قیمت دی۔ اس لیے حضرت میراں شاہ کا اس وقت تو
کچھ بس نہ چل سکا۔ وہاں سے چل کر انھوں نے اجمیر کے دیوتا
اجے پال کے مقام پر نماز پڑھی اور اذان دی جس سے وہاں
کے سب ہندو دیوتا بھاگ گئے۔ اس وقت اس کافر سردار
نے طیش میں آکر فوج کشی کردی۔ اُدھر تو ہندو سپاہی لڑتے
تھے۔ ادھر صرف آپ کے چالیس یار مقابلہ کرتے تھے۔جنگ
کے اختتام پر اور تو سب بچ گئے مگر حضرت صاحب نے
شہادت پائی۔ اس کا آپ کے ساتھیوں کو بے حد غم ہوا۔ مگر اسی
شب ان کے ایک ساتھی نے خواب میں دیکھا کہ ایک پیر مرد
اس سے کہتا ہے کہ تم لوگ بالکل رنج مت کرو۔ میراں صاحب
اجمیر کے ولی مانے جاکر پوجے جائیں گے۔ چند روز میں وہ وقت
آنے والا ہے کہ ہندو خوار ہوں گے اور اسلام کا بول بالا ہوگا
کوئی تعجب نہیں اگر اسے خداوند نعمت یہ وہی وقت آگیا ہو اور
دین کے پھیلانے کی عزت آپ ہی کے نام نامی پر ہو۔ اس
لیے فوج کشی کرکے کافروں کا قتل کرنا مناسب ہے"۔
دھیر مع لشکر دہلی پہنچ گیا۔ پرتھی راج نے متحیر ہوکر دھیر

سے پوچھا کہ تم جیسے بہادر کو مسلمانوں نے کس طرح گرفتار کر لیا۔ اس پر
چامنڈ رائے بولا اژدہات کی لاٹ چھیدنا آسان ہے مگر بات کا
نباہنا دشوار ہے جس کے باندھنے کا انھوں نے بیڑا اٹھایا تھا۔
اسی کے سامنے بکری کی طرح بندھے ہوئے لے جائے گئے۔ وہی
مثل بڑے بول کا سر نیچا۔ دھیر نے کہا اب میں کیا زبان کھولوں مگر
اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وقت آ رہا ہے جب میں اپنا قول پورا
کر کے دکھاؤں گا اور ملیچھوں کی فوج کو پامال کر کے شہاب الدین
کو باندھ لاؤں گا۔ چامنڈ رائے۔ پھر وہی بات جس بادشاہ کی
فوج میں تین لاکھ گھوڑے اور ساٹھ ہزار ہاتھی ہوں اسے تو کس طرح
جیتا پکڑ لائے گا۔ فرزند! بڑا بول نہیں بولا کرتے۔ مگر جب بات منہ
سے نکل گئی تو جان جائے مگر آن نہ جائے۔ الغرض ایسی باتوں
میں دربار برخاست ہوا۔ دھیر اپنے گھر لوٹا وہاں اس کے ہم قوم
پنڈیر راجپوت جمع تھے۔ انھوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور
اس کی گرفتاری پر افسوس کرتے رہے۔ یہاں دھیر نے صاف صاف کہا کہ
میری گرفتاری درحقیقت جیت راو اور چامنڈ رائے کی شرارت سے
ہوئی۔ خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ شاہ نے مجھے دیکھ لیا اور میں نے بھی
وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیا۔ جب میں پہلے پہل وہاں پہنچا شاہ
کے وزیر تتار خاں اور اس کے امرا نے مجھ پر رعب بٹھانے کی کوشش
کی مگر میں نہیں دبا۔ بار بار کہتا رہا کہ اب تو قول کر لیا ہے اس کو پورا
کر کے ہی دکھاؤں گا۔ بہر حال شاہ نے بڑی عزت کے ساتھ مجھے
رخصت کیا اور کہا کہ تجھ سے جو کچھ ہو سکے کر دکھانا۔ اب آپ لوگوں

سے میری درخواست ہے کہ معاملہ یہاں تک طول پکڑ چکا ہے۔ آپ صاحبان کو میری قسم کی پاس داری ضرور ہے۔ اس میں میری ہی عزت نہیں ہے بلکہ آپ لوگوں کی بھی ناموری ہے۔ یہ سن کر رندھیر راؤ نے ہری راو سے کہا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ اس نے جواب دیا ہمیں چاہیے کہ پنڈیر بنسیوں کا ایک علیحدہ دستہ رکھیں اور سب سے اول موقع تاک لیں۔ اور جیسے ہی شاہ کی فوج پہنچے ہم سب سے پہلے حملہ کردیں۔

تین مہینے گزر گئے۔ اس وقت ایسپ میاں (یوسف میاں) نام گھوڑوں کا ایک تاجر عراقی گھوڑے لیے دلی آیا۔ پنڈیر نے اس سے پانسو گھوڑے خریدے۔ اور قیمت کا یہ فیصلہ ٹھہرا کہ دو تہائی نقد ادا کردی گئی اور ایک تہائی باقی رکھی۔ ایک دن موقع پاکر جیت راؤ اور چامنڈ رائے نے ایسپ میاں سے کہا کہ تم کس خواب خرگوش میں ہو۔ تمہیں روپے کے لالچ میں اپنی جان نہ کھو بیٹھنا۔ سوداگر یہ سن کر ایک سناٹے میں آگیا۔ اس نے پوچھا اب میں کیا کروں۔ چامنڈ رائے نے کہا کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلا کرتا۔ تم اسے دق کرو۔ یہ بات سوداگر کے دل میں بیٹھ گئی۔ وہ اپنے پڑاو پر گیا اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ ایک جلسہ کیا جائے اور اس میں دھیر کو مدعو کیا جائے۔ جب آدھی رات گزر جائے اس وقت سب نرغہ کرکے اس کو قتل کر ڈالیں۔ یہ صلاح منظور ہوئی اور جلسے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ زردوزی اور کار چوبی کام کے کپڑے بچھائے گئے۔ مشعلوں کی روشنی کا

انتظام ہوا۔ میر معروف کا گماشتہ مالن خاں پنڈیر کے پاس گیا اور بولا کہ آج ہمارے ہاں بڑے تکلف کا جلسہ ہے۔ مہربانی کرکے آپ بھی اس میں شریک ہو جیے۔ دھیر نے میر کی دعوت قبول کی کھانا کھایا۔ پان چبایا۔ کپڑے پہنے اور جلسے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اتنے میں خبر آئی کہ شہاب الدین دریائے سندھ پار کر چکا ہے اور منزلیں طے کرتا برابر چلا آرہا ہے۔ یہ خبر سن کر دھیر نے جلسے میں جانا ملتوی کر دیا اور تین ہزار پنڈیر بنبیوں کی فوج لے کر شاہی سپاہ سے مورچہ لینے کے خیال سے روانہ ہو گیا جیت براو اور چامنڈ رائے بھی ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ تیار ہو کر آگئے۔

اس دفع شہاب الدین کے ساتھ اپنی معمولی فوج کے علاوہ بارہ اور بیرونی سردار بھی تھے جو اس کی اعانت کے لیے آئے تھے۔ ان کے ہاتھیوں کے گلوں میں گنگا جمنی ہیل پڑے تھے۔ ان کے سر ول پر چتر لہرا رہے تھے اور نقیب آگے آگے بولتے جاتے تھے۔ ان کے جھرمٹ میں شہاب الدین کا ہاتھی تھا۔ مسلمانی فوج کی یہ ترتیب تھی ہراول میں ہاتھیوں کا حلقہ۔ ان کے پیچھے سوار تھے اور پیدل سب کے پیچھے تھے۔ راجپوتی فوج میں چامنڈ رائے کے ساتھ سب سے پہلے ہاتھیوں کی قطار۔ ان کے پیچھے پیدل اور سوار برابر۔ ان کے بعد خالص سواروں کی فوج اور سب کے پیچھے ہاتھیوں کی قطاریں تھیں۔ جونہی دونوں فوجیں مقابل ہوئیں۔ مسلمانی فوج کی طرف سے زنبورے چھوٹنے لگے۔ لیکن ہندو فوجیں ایسے پاؤں گاڑ کر کھڑی ہوئی تھیں کہ اس آتش فشانی کا ان پر کوئی اثر نہیں

ہُوا۔ چامنڈ راے اس ہوشیاری کے ساتھ اپنے لشکر کی کمان کر
تھا کہ اس کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا تھا۔ اس وقت پنڈیر بنسیوں
ایسی زبردست یورش کی کہ شاہی ہراول ٹوٹ گیا۔ ہاتھی چک
اُلٹے بھاگے اور اپنی ہی فوج کو روندنے لگے۔ تتار خاں نے بڑ
فوج کو سنبھالا۔ اتنے میں کڑمبہ بنسی راجپوتوں نے بائیں
النگ سے زور ڈالا۔ یہ سب گھڑ چڑھے تھے۔ ان کی اچانک ایلغا
سے شاہی فوج کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا اور آتشیں ہتیار
کی آتش فشانی بند ہو گئی۔ اب تلواروں اور نیزوں کی باری تھی
دونوں طرف کے بہادر دل کھول کر لڑے۔ پنڈیر بنسیوں نے غنیم
کی فوج میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ چار گھڑی دن باقی رہ گیا تھا۔ یکایک مسلما
فوج نے کچھ ہمت دکھائی مگر چامنڈ راے ہراول میں تھا وہ ڈ
رہا۔ اب مُسلمانوں نے دوبارہ آتش فشانی شروع کر دی تھی لہٰ
میں دھیر سین نے عقب میں پہنچ کر ہلّا بول دیا اور پیدلوں کو کاٹ
چھانٹتا شہاب الدین کے ہاتھی تک جا پہنچا۔ گھڑی بھر کے رن میں
کے تین سو ساتھی کام آئے۔ ان بارہ سرداروں نے شہاب الدّ
کے گرد حلقہ باندھ لیا اور کسی کو شہاب الدّین تک نہ آنے دیا
اتنے میں شام ہو گئی۔ یہ منگل کا دن اور مہینے کی آٹھویں
تاریخ تھی۔ اس جنگ میں کوہی چند کا لڑکا۔ دھیر پنڈیر کا بھائی
اور کوئی پانسو دوسرے راجپوت کام آئے اور مسلمانی
سپاہ کے آٹھ سو سپاہی کھیت رہے۔

دوسرے دن پھر جنگ شروع ہوئی۔ پرتھی راج تازہ دم

فوج لیے علیحدہ تیار کھڑا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ گھمسان کا رن ہو رہا ہے۔ وہ یکایک شہاب الدین پر ٹوٹ پڑا۔ مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی مگر وہ دین کی دہائی دیتے ہوئے بادشاہ کے ہاتھی کے گرد جمع ہو گئے۔ اس موقع پر دھیر اور بادشاہ کی آنکھیں چار ہوئیں۔ بادشاہ فوراً گھوڑے سے اُتر کر ہاتھی پر بیٹھ گیا اور مہاوت کو حکم دیا کہ ہاتھی کو دھیر پر چلا دے۔ ہاتھی نے دھیر پر حملہ کیا مگر اس نے گھوڑے کو ایڑ دے کر وار خالی دیا۔ اتنے میں ان بارہ سرداروں نے شاہی ہاتھی کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ راجپوت دھیر کی امداد کو بڑھے۔ بادشاہ کو دیکھ کر دھیر بولا " ہوشیار ہو جانا میں آیا" جالندھری دیوی اس وقت اس کے ساتھ تھی اور اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ بہادر دھیر نے بڑھ کر شاہی ہاتھی کی کونچ میں تلوار کا وار کیا۔ ہاتھی بیٹھ گیا۔ اب ایک طرف سے ہاڑا ہمیر نے اور دوسری طرف سے دھیر نے لپک کر شاہ کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ اس وقت بادشاہ نے تو آنکھیں نیچی کر لیں مگر اس کے ساتھیوں نے بہت زور دکھایا۔ ادھر دھیر کے ساتھ میں میر حسین کا فرزند تھا وہ ان مسلمانوں سے خوب لڑا۔ یہ دیکھ کر شاہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور میر حسین کے فرزند کے ایک تیر ایسا مارا کہ وہ ہلاک ہو گیا دوسرا تیر اس نے دھیر پر چھوڑا۔ تیسرا تیر چھوڑنے والا تھا کہ کمان اس کے ہاتھ سے چھین لی گئی۔ اس نے تلوار سونت لی مگر دھیر نے تلوار چھین کر اس کی مشکیں کس لیں اور گھوڑے پر ڈال کر اپنے لشکر کی طرف لوٹ گیا۔ مسلمانوں نے بہتیری کوشش کی لیکن کچھ پیش

نہ گئی - آخر کار مایوس ہوکر بھاگ چھوٹے - واہ رے دھیر تیرے کیا کہنے جہاں نوسو ہاتھیوں کا حلقہ تھا اور ایک لاکھ امیرزادے ننگی تلواریں لیے مرنے مارنے کو تیار تھے اور ساری فوج ملاکر جہاں چار لاکھ ہتیار پانی کے رنگ برس رہا تھا - ان کے بیچ میں شاہ کو پکڑلانا تیرا ہی کام تھا -

شہاب الدین کی گرفتاری پر مسلمانوں کے پانو اکھڑ گئے اور بھاگ نکلے - شاہی سامان راجپوتوں نے لوٹ لیا - اس لڑائی میں بادشاہ کے ساتھ سیرن نامی ایک خواص تھا - شاہ کی گرفتاری کے وقت خواصی میں بیٹھا تھا - جب راجپوتوں نے شاہی ہاتھی کو گھیر لیا - سیرن بادشاہ کو اکیلا چھوڑکر بھاگ نکلا اور اپنی چہیتی بیوی کے پاس غزنیں پہنچا - جب اس نیک بندی کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا خاوند اپنے مالک کو تنہا چھوڑکر بھاگ آیا ہے تو وہ بہت خفیف ہوکر بولی کہ اگر تو وہاں کٹ مرتا اور میں تیری مٹی کے ساتھ زندہ دفن ہوتی تیری اس بزدلانہ گریز سے ہزار درجے بہتر ہوتا - وہ بولا کہ نیک بخت ! میں تو تیری ہی خاطر اپنی جان بچاکر آیا ہوں - خیر اگر زندگی ہے تو اپنے مالک کو چھڑاکر لاتا ہوں - یہ کہہ کر سیرن اپنی بیوی سے رخصت ہوا اور رات دن قطع منازل کرتا دلی آ پہنچا -

شاہ کو گرفتار کرنے والے دھیر کا رتبہ بہت بڑھایا گیا اور پرتھی راج نے بیشمار انعام دیا - دھیر بھی اپنا قول پورا کرکے خوشی کے مارے جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا - سیرن غزنیں سے چل کر دھیر کے خواص بیجلا کے پاس پہنچا اور اسے اس امر پر آمادہ

کیا کہ دھیر سے کہہ سن کر پادشاہ کی رہائی کی تدبیر کی جائے۔ بیجلا
نے موقع پاکر دھیر سے عرض کی کہ اب تو آپ کی قسم بھی پوری
ہوگئی۔ پادشاہ اگر یہاں سے جیتا جاگتا چھوٹ نکلے تو بڑا نام ہو۔
دھیر نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ دس پانچ دن کی ڈھیل دے کر
اور مہاراجہ سے عرض معروض کرکے شاہ کو چھڑا دوں گا۔ بیجلا
بظاہر اس جواب پر مطمئن ہوگیا۔ مگر جب دھیر کے ساتھ دربار میں گیا
تو موقعہ پاکر بول اٹھا کہ جس شاہ نے میرے لال دھیر کو پکڑ کر
چھوڑ دیا ہے۔ مہاراج اس کی زندگی کا دان دیں تو بڑا کام ہو
بیجلا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر دھیر کے ایک آگ سی لگ گئی اور
وہ تلوار کھینچ کر بیجلا پر جھپٹا۔ پرتھی راج نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ
دھیر! کیا لڑکپن کرتے ہو اتنی بڑی جنگ ہوئی۔ ہزاروں آدمی
مارے گئے اور ہزاروں ہاتھی گھوڑے اور اونٹ کٹ گئے۔ لیکن
تمہاری تلوار کو اب تک خون سے سیری نہیں ہوئی جو اس ۸۰ برس
کے بڈھے کو قتل کرنے اٹھے ہو۔ بیٹھ جاؤ ایک طرف۔ دھیر خاموش
ہوگیا مگر عرض کی کہ میں نے جس بات کے لیے منع کردیا تھا اس نے
وہی بات یہاں آکر بھرے دربار میں کہہ دی۔ میں نے شاہ کو پکڑ کر
اپنی قسم پوری کردی اب حضور کو اختیار ہے چھوڑیں یا ماریں۔
مگر اس کے طرفدار آپ کی خدمت میں عرض کریں گے۔ میں نے
اسی لیے اس مورکھ سے کہا تھا کہ دس پانچ دن صبر کر۔ پرتھی راج
ایک دانشمند انسان تھا۔ وہ فوراً بات کی تہہ کو پاگیا۔ اسی
وقت شہاب الدین کی طلبی کا فرمان دیا۔ جب وہ دربار میں حاضر

ہُوا۔ اس کی آنکھ شرم سے اونچی نہیں اُٹھتی تھی۔ پرتھی راج نے اس کی بانہہ پکڑ کر گدّی کے برابر بٹھالیا۔ تیس ہاتھی اور بانسو گھوڑے فدیے میں لیے جانے اور شاہ کے رہا کیے جانے کا حکم دیا۔ یہ سُن کر شہاب الدین تین مرتبہ کورنش بجا لایا۔ پرتھی راج نے پھر شاہ سے خطاب کر کے کہا۔ شہاب الدین! تم ایک والیِ ملک ہو مگر بڑے دشٹ اور بے شرم ہو۔ تم بار بار یہاں سے رہا کیے جاتے ہو۔ مگر بار بار چڑھائی کر کے آتے ہو۔ اب میں تمھیں فہمایش کرتا ہوں کہ تمھارا اسی میں بھلا ہے کہ تم دلی کی حدود میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرو۔ یہ کہہ کر پرتھی راج نے شاہ کو سکھ پال میں بٹھا کر غزنین کی طرف رخصت کیا اور فدیہ وصول کرنے کے لیے لوہانا آجانواہ کو اس کے ساتھ مقرر کر دیا۔ راہ میں ہزیمت خوردہ فوج کے سپاہی شاہ کے ساتھ ہو لیے اور سب کے سب مع الخیر غزنیں پہنچ گئے۔ فدیے کے ہاتھی گھوڑے حوالے کر کے لوہانا کو رخصت کر دیا گیا۔

جب لوہانا فدیہ لے کر دلی پہنچا۔ پرتھی راج نے یہ تمام فدیہ دھیر کو عنایت کر دیا۔ اس کے علاوہ چار دیہات کا پٹہ اور لکھ دیا۔ دھیر کا دماغ اور بھی چل نکلا۔ اسے اس بات کا بڑا غرور تھا کہ میں نے شاہ کو پکڑ کر چھڑا بھی دیا۔ بلکہ ایک دو مرتبہ یہ بھی کہتا سُنا گیا کہ یہ راج آج کل پنڈیر بنیوں کے بل بوتے پر چل رہا ہے۔ جیت راو اور چامنڈ رائے اس کے قدیمی دشمن تاک میں لگے ہوئے تھے کہ کب موقع ملے اور ہم اسے اکھاڑیں۔ یہ بات انھوں نے راجہ کے کان میں ڈال دی۔ بلکہ اور بھی لگائی بجھائی کی۔

پرتھی راج نے برافروختہ ہوکر حکم دیا کہ کوئی پنڈیر بنسی دلی میں نہ رہنے پائے۔ یہ حکم سُن کر دھیر کے سارے متعلقین دلی چھوڑکر لاہور چلے گئے۔ لاہور ان ایام میں سلطنت دہلی کا ایک حصّہ تھا۔ دھیر ان دنوں کانگڑے میں تھا۔ جب اس نے یہ خبر وحشت اثر سُنی بہت رنجیدہ ہوا اور دریائے سندھ عبور کرکے سیدھا غزنین پہنچ گیا۔ شہاب الدین نے اس کی بڑی عزّت کی اور ساٹھ گانوں کا پروانہ دے کر اسے اپنے دربار کے اُمرا میں جگہ دے دی مگر دھیر نے کہا کہ میں مہاراجا پرتھی راج کے ہوتے کسی دوسرے کا ملازم نہیں بنتا۔ میں صرف آپ سے اپنی عزلت کے لیے ایک گوشہ چاہتا ہوں اور بس۔ اس پر شاہ نے اسے جھاٹک کے کنارے ڈھلا پہاڑ کی جگہ دے دی۔ دھیر غزنین سے ڈھلا پہاڑ اُٹھ آیا اور بنے فرزند پادس پنڈیر کو لکھ بھیجا کہ تم لوگ یہاں چلے آؤ۔ اس خط کے پہنچتے ہی پنڈیروں نے لاہور میں لوٹ مار مچا دی اور خزانہ لوٹ کر دھیر کے پاس چلے آئے۔ اس لوٹ مار کی خبر سُن کر دھیر اپنے بھائی بیٹوں سے بہت خفا ہُوا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونہار تھا سو پیش آیا۔ پرتھی راج نے جب لاہور کی لوٹ کا حال سُنا فوراً دھیر کو لکھا کہ تم گزشتہ واقعات کی کوئی پروا نہ کرو اور میرے پاس چلے آؤ۔ یہ خط پاکر دھیر بہت خوش ہوا اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا۔ دل میں سوچا کہ بات شدنی تھی ہو چکی۔ اب چل کر اپنے آقا سے مل لوں اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگوں۔ یہ سوچ کر اُس نے کانگڑہ ہوکر دلی جانے کی تیاری

کی۔ کوچ میں دو ایک دن باقی تھے کہ گھوڑوں کے بعض سوداگر آ پہنچے۔ دھیر نے کہا یہ بھی اچھا ہوا۔ بلا سے مہاراج کی نذر کے لیے کچھ گھوڑے تو خرید لوں۔ الغرض اُس نے دو ہزار گھوڑے انتخاب کیے اور نقد قیمت دے دی۔ سوداگر رخصت ہو گئے۔ در اصل یہ گھوڑے شاہ کی فرمایش سے آئے تھے جب تاجر غزنیں پہنچے شاہ نے باقیماندہ گھوڑوں کو ناپسند کیا۔ عین اس موقع پر کسی نے شاہ سے لگا دی کہ اپنے اچھے گھوڑے تو وہ دھیر کو فروخت کر آئے ہیں۔ یہ سن کر شاہ غضبناک ہوا ان کے گھوڑے چھین لیے اور انھیں قید کر دیا۔ بعض جو بچ گئے سیدھے دھیر کے پاس آئے اور بولے کہ آپ کی وجہ سے ہماری یہ دُرگت ہوئی۔ دھیر نے ان کو تسلی دی اور اپنے پاس رکھا۔ شاہ کو خط لکھا کہ اگر آپ کی خواہش ہو تو وہ گھوڑے میں آپ کی خدمت میں بھیج دوں غریب سوداگروں پر تعدی کرنا تو مناسب نہیں۔ یہ خط پا کر شہاب الدین نے سوداگروں کو چھوڑ دیا اور ان کا روپیہ بھی کوڑی پائی سے ادا کر دیا۔ سوداگر دھیر کے اس قدر ممنون ہوے کہ سب کے سب اس کے پاس چلے آئے اور وہیں قیام کیا۔ ان میں اس قدر رسم راہ بڑھ گئی کہ ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے اور ایک دوسرے کا اعتبار کرنے لگے۔ لیکن اس آمد و رفت کا انجام نہایت دردناک ہوا۔ شہاب الدین کو اس بات کا پتہ لگ گیا کہ دھیر دلی کو جانے والا ہے اس لیے وہ اس کی جان کا لاگو ہو گیا۔ ظاہر میں تو اس کے خلاف کارروائی کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لیے اس نے ان سوداگروں کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ اپنے معتمد بھیج کر

شاہ نے سوداگروں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ پنڈیر کو ہلاک کر ڈالیں۔ پہلے تو وہ اس اقدام پر راضی نہیں ہوئے مگر جب دین کا واسطہ دیا گیا تیار ہوگئے ان کی مدد کے لیے شاہ نے چار ہزار پٹھان بھیج دیے دھیر کے توابعین تو پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ وہ سوداگروں کی معیت میں کانگڑے کی سمت روانہ ہوا دریائے اٹک پار کر کے ابھی ایک ہی پڑاؤ کیا تھا کہ سوداگروں نے کسی بہانے سے اسے اپنے ڈیروں میں بلایا اور باتوں میں لگایا۔ عقب سے پٹھانوں کے سردار کالن خاں نے آکر دھیر کی گردن پر تلوار کا ایک ہاتھ ایسا مارا کہ سر بھٹا سا اُڑ گیا۔ مگر دھڑ نے تلوار سونت کر بہت مخالفین کا کام تمام کر دیا۔ آخر میں وہ بھی گرا۔ پنڈیر کی لاش غزنیں روانہ کی گئی جسے دیکھ کر شاہ دنگ رہ گیا۔ پرتھی راج نے جب یہ خبر سُنی آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور اپنی حماقت اور جلد بازی پر افسوس کرنے لگا۔ پرتھی راج کے پاس یہ خبر بھادوں سدھ نیدرہ کو آئی گھڑی بھر افسوس کر کے وہ پھر اپنی چہیتی سنجوگتا کے ساتھ برسات کا لطف اُٹھانے میں مصروف ہو گیا۔

ہم یہ کہنا بھول گئے کہ جب دھیر کے بھائی بندوں نے یہ خبر سُنی وہ فوراً پٹھانوں پر چڑھ دوڑے اور ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا۔

بڑی لڑائی روپ پرستاو

چھیاسٹھویں داستان

راول سمر سنگھ نے خواب میں ایک حسین عورت کو دیکھا اس سے پوچھا کہ تو کون ہے اس نے کہا کہ میں دلی کی حکومت کا اقبال ہوں۔ یہ خواب دیکھ کر راول جی نے اپنی رانی پرتھا بائی سے کہا کہ اب پرتھی راج پکڑا جائے گا اور دلی پر مسلمانی حکومت قائم کی جائے گی۔ راول جی نے اپنے فرزند رتن سنگھ کو حکومت دے دی اور خود نگبودھ کی جاترا کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ماتحت راوتوں کو جمع کیا۔ دیو راج کو قلعے کی حفاظت پر مقرر کیا اور پرتھا کو ساتھ لے کر نگبودھ کی طرف کوچ کیا۔ ہاتھی گھوڑے ساتھ تھے۔ گھوڑوں کی یہ قسمیں تھیں :۔ ترکی۔ عراقی۔ کچھی بنگال۔ جبشی۔ تازی وغیرہ۔ راول جی نے آمیر کے قریب خیمہ لگایا۔ جوّن گڈھ کے راوت رندھیر نے راول جی کے لشکر پر لوٹنے کے ارادے سے دھاوا کیا اور ان کے لشکر کو گھیر لیا۔ جنگ ہوئی اور رندھیر مارا گیا۔ سنجوگتا کا پردھان راول جی کی پیشوائی کے لیے دس کوس آگے آیا اور راول جی بخیریت نگبودھ پہنچ گئے۔ مگر پرتھی راج کو ان کی آمد کی خبر نہ ہوئی۔ سنجوگتا کی داسیاں (کنیزیں) ان کے لیے کھانا پان وغیرہ لے کر آئیں اور راول جی

سے سنجوگتا کا سلام عرض کیا۔ راول جی نے پرتھی راج کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے تاریخ وار قنوج کی تمام کیفیت بیان کی۔ اس پر راول جی بڑے غمگین ہوئے۔ پرتھا بائی رانی اچھنی کے ساتھ رہنے لگیں اور جیت راو۔ راول جی کی خاطر مدارات کرتا رہا۔ کنور رینسی نے سازشوں کے ساتھ راول جی کی گوٹ کی۔ اکیس روز تک راول جی نگمبودھ میں رہے۔ پرتھی راج نے خواب میں ایک حسینہ کو دیکھا اس سے پوچھا تو کیا چاہتی ہے۔ اس نے کہا۔ میں ایک بہادر انسان کی قربانی چاہتی ہوں۔ اس کی آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا خواب سنجوگتا کو سنایا۔ رانی نے کہا کوئی تشویش کی بات نہیں۔ فکر مت کرو۔

پرتھی راج کی اس حالت کی خبر پاکر شہاب الدین نے اپنے سرداروں سے صلاح لی اور یہ رائے قایم ہوئی کہ دلی کو جاسوس روانہ کیا جائے اور مفصل حالات معلوم کیے جائیں۔ مخبر دلی آئے اور دھرمائن کایستھ سے تمام حال دریافت کرکے واپس غزنین کو لوٹے۔ جتنے عرصے وہ نہیں پہنچے سلطان دلی کی خبروں کے لیے بڑا بیتاب تھا۔ اور تتار خاں سے پوچھتا رہتا وہ کہتا کہ ابھی خبر آئے گی۔ نیتی راو کٹوار نے مفصل کیفیت شاہ کی خدمت میں لکھ دی۔ چاروں جاسوس خبریں لے کر علیحدہ علیحدہ پہنچے۔ سلطان ان خبروں سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے پیر کے چادر چڑھائی اور دعا مانگی۔

شہاب الدین نے سات ہزار کاغذ لکھ کر دیس دیس بھیجے جن میں

یہ قابل ذکر ہیں :-

کدلواس (قزلباش)- کیلاس (کیلاشی) . دیس - روہ - خندھار (قندھار) - گکھڑ - گردان - خوراسان - ملتان - بھٹیر - بھکردان وغیرہ۔

دہلی میں سلطان کے حملے کی خبر پہنچی - شہر کے مہاجن نگر سیٹھ کے پاس آئے سیٹھ کا نام سری منت تھا ۔ وہ مہاجنوں کو لے کر گرو رام کے پاس پہنچا اور شاہ کے آنے والے حملے کا ذکر کیا۔ گرو رام پروہت نے کہا کہ میں تو برہمن ہوں پوتھی پاٹ جانتا ہوں راج کاج کی باتیں کیا سمجھوں - سری منت نے کہا کہ آپ راج گرو ہوکر ایسی باتیں کرتے ہو تو پھر ہم کس کے پاس جائیں - پروہت جی سب کو لے کر چند کوی کے پاس آئے - کوی سب کو لے کر راجا کی ڈیوڑھی پر پہنچا - کنیزوں نے کوی جی سے کہا کہو کیا حکم ہے ہم اطلاع کریں - اس نے ایک پرچہ لکھا جس میں یہ اطلاع درج تھی کہ شاہ غزنیں سے حملے کے ارادے سے آرہا ہے - پرتھی راج نے پرچہ پڑھ کر چاک کر دیا - سنجوگتا نے دریافت کیا خیر تو ہے - راجا نے کہا مجھے رات کے خواب کی تعبیر معلوم ہوگئی - اس کے بعد راجا محل سے نکل کر کوی کے پاس آیا اور اپنا رات والا خواب سنایا۔ اس وقت راجا کو راول جی کی آمد کی خبر معلوم ہوئی - اس نے اپنے سامنتوں سے کہا کہ جس طرح ہوسکے راول جی کو یہاں لانے کی تدبیر کرو - ادھر سنجوگتا نے لونڈی بھیج کر راجا کو اندر بلوایا اور بولی کہ میں نے راول جی کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے - اس کے بعد پرتھی راج لباس بدل کر مع ارکین

دربار راول جی سے ملنے نگبودھ جاتا ہے۔ مزاج پرسی کے بعد پرتھی راج راول جی سے اپنی سرگزشت سناتا ہے۔ راول جی نے ملامت کے لہجے میں کہا کہ عورتوں کی صحبت سے کسی کو بھی راحت نصیب نہیں ہوئی۔ کوی چند نئے ساونتوں کا راول جی سے تعارف کراتا ہے۔ اس کے بعد راول جی محل میں آتے ہیں۔ سنجوگتا کے ہاں مع سرداروں کے کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد دربار لگتا ہے اور پرتھی راج کوی چند اور گرو رام سے کہتے ہیں کہ کوئی ایسی صورت نکالو جس سے راول جی واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ دوسرے روز علی الصباح دربار لگتا ہے اور پرتھی راج راول جی کو رخصت کرنے کی فکر میں لگتا ہے۔ راول جی واپس چتوڑ جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ پرتھی راج منت کرتا ہے مگر وہ نہیں سنتے۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ آپ ہمارے ہاں مہمان آئے تھے اب ہم آپ کو رخصت کرتے ہیں۔ آپ تشریف لے جایئے اور اپنے ملک کا انتظام کیجیے۔ راول جی جواب دیتے ہیں کہ میں سلطان سے ملنے آیا ہوں۔ پرتھی راج ہار مان کر کہتا ہے کہ جیسے دل میں آئے کیجیے آپ مختار ہیں۔ راول جی شکایتاً کہتے ہیں کہ آپ نے اور کام تو خیر جیسے کیے ویسے کیے مگر چامنڈ رائے کو بیڑیوں میں کیوں ڈالا۔ راجہ نے کہا اس نے میرا چہیتا ہاتھی مار ڈالا تھا۔ آخر راول جی کے کہنے سننے پر پرتھی راج خود چامنڈ کے گھر اس کی بیڑیاں اُتروانے جاتا ہے۔ راجا چند اور گورو رام کو اس کی بیڑیاں نکالنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ بھلا اس وقت

میری بیڑیاں کھولے جانے کا کیا موقع ہی۔ چند اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہی مگر وہ کہتا ہی کہ پرتھی راج مہاراج کی پہنائی بیڑیاں کیسے اُتار دوں۔ پرتھی راج اپنی تلوار اسے انعام میں دیتا ہی۔ وہ بیڑیاں اُتروا لیتا ہی۔ چند کہتا ہی کہ لوہے کی بیڑیوں کے کھلوا دینے سے کیا ہوتا ہی۔ راجا کے نمک کی بیڑی تمھارے پانو میں اور اس کی روٹی کا طوق تمھارے گلے میں بدستور پڑا ہی۔ راجا نے چامنڈ رائے کو گھوڑے بھی انعام میں دیے۔

اب تمام ساونت اور پرتھی راج جنگ کی صلاح کے لیے راول جی کے پاس گمبودہ جاتے ہیں۔ یہاں کیا دیکھتے ہیں کہ پتھر کی ایک سِل گھومنے لگی۔ سب کو اچنبھا ہوا۔ اتنے میں سِل کے نیچے سے ایک بیر نکلا۔ کوی چند نے اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ میں شیوجی کی جٹاؤں سے نکلا ہوں اور میرا نام بیربھدر ہی۔ پوچھنے لگا کہ یہ کیا ہنگامہ ہو رہا ہی۔ کوی نے کہا کہ جنگ کے لیے چامنڈ رائے کی بیڑیاں کھولی گئی ہیں۔ اس کی مبارکباد کا شور ہو رہا ہی۔ بیربھدر کہنے لگا کہ میں نے تو اپنی آنکھوں سے بڑی بڑی جنگیں دیکھی ہیں یہ جنگ بھلا کیسی ہوگی۔ کوی نے کہا کہ آپ نے دیوتاؤں کی جنگیں دیکھی ہیں، مگر اس لڑائی کو بھی دیکھ کر آپ خوش ضرور ہوں گے۔ بیربھدر نے کہا کہ مجھے جنگ کا لطف دکھانے والا صرف دریودھن تھا۔ میں مہابھارت کی جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک سوتا رہا ہوں۔ شاعر نے کہا کہ آپ ہمارے راجا کی سبھا میں چل کر صلاح و مشورے میں حصہ لیجیے۔ اس لیے کہ آپ ماضی حال اور مستقبل تینوں

زبانوں سے واقف ہیں۔ بیر نے ایک جمائی لی اور اٹھ کر پرتھی راج کی سبھا میں آیا اور ساونتوں کے نام دریافت کیے۔ چند نے ایک ایک کا نام بتایا۔ جام رائے جادو نے کہا کہ کیماس کے مرنے سے مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہوگئے ہیں۔ چامنڈ رائے نے کہا کہ گزشتہ کا افسوس کیسا مستقبل کی تدبیر کرو۔ جام رائے نے کہا تمھاری عقل تو چرخ ہوگئی ہی۔ ورنہ کیا سوجھتا نہیں کہ سو میں سے سات باقی رہ گئے ہیں۔ اس پر دونوں میں بات بڑھی۔ چامنڈ رائے نے جام رائے پر لنگڑے کی پھبتی کسی۔ اس پر سب کے سب ہنس پڑے اور بلبھدر نے سب کو ڈانٹا۔ اب جنگ کی صلاح ہونے لگی اور ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ جو راول جی کہیں وہ منظور کیا جائے۔ راول جی نے کہا۔ کنور رینسی کو گدی پر بٹھا کر جنگ کا سامان کیا جائے۔ پرتھی راج نے یہ رائے منظور کر لی اور جیت راؤ پر کنور کی ذمہ داری ڈال دی۔ مگر جیت راؤ نے اس ذمہ داری کو نامنظور کیا۔ اب یہ عہدہ پرسنگ رائے کھیچی اور دوسرے ساونتوں کو پیش کیا گیا۔ مگر سب نے دلی میں رہنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار بدرجۂ مجبوری راول جی نے اپنے بھتیجے برسنگھ کو اس کام پر مامور کیا۔ ادھر کنور رینسی لڑائی میں شامل ہونے کے لیے بضد ہوئے۔ پرتھی راج نے انھیں سمجھایا کہ فرزند کے لیے اپنے والد کے احکام کی اطاعت کرنا سب سے بڑا فرض ہی۔ وہ اس پر بھی جنگ کی شمولیت کے لیے اصرار کرتے رہے آخر میں سب کے سمجھانے سے خاموش ہو گئے۔ اس وقت بھیانک

بھیانک بدشگونیاں دیکھنے میں آئیں۔ راجہ نے جوتشی کو بلوایا۔ اس نے بد فالی اور گرہ چال کا پھل بتایا۔ راجہ سُن کر ملول اور افسردہ خاطر ہُوا۔ دلّی کی گدی رینسی کے حوالے ہوئی۔ دربار برخاست ہُوا۔ پرتھی راج راول جی کو ان کی اقامت گاہ تک پہنچانے گیا۔

آدھی رات کے وقت پرتھی راج کو شاہ کی آمد کی اطلاع پہنچی وہ تمام رنگ رلیاں چھوڑ کر جنگ کے لیے تیار ہوگیا۔ کوی چند نے بیر بھدر سے جنگ کا انجام پوچھا۔ اس نے کہا کہ پرتھی راج گرفتار ہوگا۔ کوچ کے وقت سنجوگتا نہایت غمگین تھی۔ اب نئی نئی بدفالیاں نظر دں میں آئیں۔ غزنین کے جاسوسوں نے شاہ کو پرتھی راج کے کوچ کی خبر پہنچا دی۔ راجپوتی لشکر کا پہلا پڑاؤ پانی پت پر ہُوا۔ دلّی سے سو (کذا) کوس آگے سندھ ندی ہے اور دلّی سے دو سو کوس شہر لاہور ہے۔ لاہور سے اسّی کوس پرے بیہٹ ندی ہے۔ شہاب الدین نے دریائے سندھ عبور کیا اور بیہٹ پر آگیا۔ اور سات آٹھ دن میں چنہاب (چناب) پہنچا تھا۔ چناب لاہور سے صرف ۴۰ کوس ہے۔ جنگ

پاوس پنڈیر حصار کا مالک پرتھی راج کے پاس آیا اور معافی مانگی راجا نے اس کے قبیلے کے لاہور لوٹنے کی شکایت تو کی مگر قصور بھی معاف کر دیا۔ شاہی فوج کی رفتار اور ناکہ بندی کا حال سن کر پرتھی راج نے چند کوی کو ہمیر کو منانے کے واسطے جالندھر گڈھ بھیجا۔ شاعر نے جا کر ہمیر کو سمجھایا اور کہا کہ پرتھی راج کا ساتھ دو۔ ان میں بہت سوال و جواب ہوئے۔ آخر یہ ٹھہری کہ جالندھری دیوی کے استھان جائیں۔ وہاں کوی نے دیوی کی پوجا کی اور

مندر میں بند ہوگیا ۔ ہمیر شاہ کی مدد کے لیے چلا گیا ۔ اس خبر سے پرتھی
راج سخت منغّص ہُوا ۔ چامنڈ رائے نے کہا اگر کوئی کسی سے جا ملا
تو پروا نہیں ہمیں چاہیے کہ چار چار تلواریں باندھیں ۔ پرتھی راج
نے دھیر کے فرزند پاوس پنڈیر کو ہمیر کے روکنے کے لیے بیڑا دیا
پاوس اس مہم کے لیے تیار ہُوا ۔ جام رائے جادو نے مسلمانی فوج
کے نکاس کا راستہ روکا ۔ اور پاوس اور ہمیر میں آگے پیچھے چھیڑ
چھاڑ ہوتی گئی ۔ آخر پاوس نے بڑھ کر ندی کا گھاٹ روک دیا ۔
جب ہمیر دریا سے پار ہونے لگا ۔ پاوس پنڈیر نے اس پر حملہ کر دیا
لڑائی ہوئی ۔ ہمیر کے دو بھائی اور پانچ پنڈیر سردار مارے گئے ۔
مگر ہمیر بھاگ نکلا اور پاوس کی فتح ہوئی یہ سُن کر پرتھی راج بہت
خوش ہُوا اور حکم دیا کہ آیندہ سے پنڈیر لوگ چار چار تلواریں باندھا
کریں ۔ ادھر ہمیر سلطان کے پاس پہنچا ۔ نذر دی اور اپنی سرگزشت
سُنائی ۔ شہاب الدین نے چار تلواریں باندھے جانے کا قصّہ سُن کر کہا
کہ ہاتھ میں ایک مضبوط پکڑی ہوئی تلوار چار تلواروں پر بھاری ہوتی
ہے ۔ پھر شاہ نے قاضی سے مآلِ جنگ پوچھا ۔

پرتھی راج کی فوج سب ملا کر ستر ہزار تھی ۔ اس نے پاوس
پنڈیر کو شاہ کی گرفتاری کے لیے مقرر کیا ۔ یہ سُن کر شاہ نے
اپنے امرا سے قسمیں لیں اور خورسان خاں ۔ رستم خاں تازی تتار
خاں ۔ فیروز خاں ۔ عثمان خاں ۔ خان نوری حجاب ۔ خان خاناں خورسان
حبش خاں حبشی ۔ سبحان خاں ۔ بیرم وغیرہ نے وفاداری کی
قسمیں کھائیں ۔ شاہ نے دریائے سندھ عبور کیا ۔ میر محمود روہیلہ

شاہ سے عہد کرتا ہے۔ سلطان چناب کے کنارے آپہنچتا ہے اور پرتھی راج کے پاس خریطہ بھیجتا ہے۔ خریطہ لانے والوں کے یہ نام ہیں :۔ خان خان تتار۔ خان رستم۔ خان حاجی۔ خان فیروز کوساب (قصاب) جادو جوان اور بلبھدر نے کہا کہ تم ہمیں نمک حرام کے بھروسے پر نہ بھولنا شاہ نے دریائے ستلج عبور کیا اور آگے بڑھا۔ دلی سے آنے والے ایلچی اسے یہاں ملے اور شاہ چوہانوں کی فوج اور اس کی تیاری کا حال سن کر متفکر ہوا۔ سرداروں نے تسلی دی کہ اب کے تو چوہان کو ضرور گرفتار کرلیں گے اور قاضی نے شاہ سے کہا کہ آپ میرے قول پر یقین کیجیے کہ چوہان اس مرتبہ ضرور گرفتار ہوگا۔ مسلمان سرداروں نے پھر قول دیا اور شاہ آگے روانہ ہوا۔ راجپوت فوج تیار ہوئی۔ جام رائے جادو نے پرتھی راج سے کہا کہ سارا معاملہ خیریت سے گزرے گا۔ راول جی ہمارے ساتھ ہیں۔ پرتھی راج نے راول جی سے کہا کہ آپ عقبی فوج کی خبر رکھیں۔ راجپوتی فوج احتیاط کے ساتھ شاہی فوج کی طرف بڑھی۔ شاہی لشکر ستتول پور کے پاس آگیا۔ اس میں سرداران ذیل شامل تھے :۔

میمنہ میں؛ تتار خاں۔ خورسان خاں۔ خان رومی۔ خانخان۔ محمود خاں۔ رستم خاں۔ گردع خاں۔ خوریش (قریش) خاں۔ جیہان (جہاں) خاں۔ ہمیام خان۔ میران منذر۔ قاضی کمال۔ حبشی حسین۔ شادی ہمیر۔

میسرہ میں :۔ خورسان خاں۔ ایسپھ (یوسف) خاں۔ عالی اکوب (آل یعقوب؟) غازی خاں جوب۔ عالیل خاں۔ ساریر خاں فیروز خاں۔ پہاڑ پیر۔ علی اسد خاں۔ عُمّاد میر۔ محمود خاں۔ سارنگ میر

تاجن خاں ۔ ترکام تام ۔ کمال خاں ۔ روچن (روشن) خاں ۔ سلیم خاں ۔ محمود سید ۔ فیتن ۔ سوب ۔ عبدالمیر ۔ ملتان ادب ۔ معروف خاں ماسوف میر ۔ فیروز خاں فستیح نصیر ۔ پیرن میر ۔ سیرن سادی ۔ غازی مراد ۔ آماد (عماد) خاں ۔ فتح فرید ۔ نبکٹ راو ۔ وامن برید ۔ سارنگ دیو ۔ ہرچیتر سین ۔ ملک غالب ۔ باجنت خاں غوری ۔ منگدھ راو مرہٹہ ۔

مقابل میں :- معروف خاں ۔ محمود میر ۔ میر تاجن خاں ۔ عالیل سید خاں ۔ سادیپ خاں ۔ حبشی سلیم ۔ آیوب خاں رومی ۔ ھدی سہدی سلیم خاں ۔ جمن میران ۔ سلیم سید ۔ موسم میر ۔ حاجی خاں نیازی احمد خاں ۔

آتشی اسلحہ کا ذکر شعر ذیل میں آتا ہے :-

زنبور بھور ہتھ ناری بھار آتس چرت ادبھوت پار

جنگ شروع ہوئی ۔ راول جی نے کنہ سے کہا کہ تم عقبی فوج کی دیکھ بھال کرو ۔ اُس نے کہا کہ میں تو آگے جاکر جنگ کروں گا ۔ مُسلمانی فوج نے ہمیر کو بیچ میں لے کر لڑنا شروع کیا ۔ پرتھی راج نے پاوس پنڈیر سے کہا کہ نمک حرام ہمیر کا سر کاٹا جائے ۔ پنڈیر بنسیوں نے دھاوا کیا ۔ ہمیر کی حفاظت کے واسطے کئی یون (مسلمان) سردار اور تین ہزار گکھڑ مقرر کیے گئے ۔ ہمیر پر پنڈیروں کا زغہ زیادہ ہونے لگا ۔ ہمیر کا ایک بھائی ۔ پنڈیروں کے بارہ سردار اور بیجلا خواص مارے گئے ۔ اس حملے کے ہوتے ہی ایک لاکھ یون فوج نے آکر ہمیر کو اپنے حلقے میں لے لیا ۔ لیکن بہادر پاوس

بازنہ آیا۔ اس نے ہمیر کے پاس پہنچ کر اس کا سر کاٹ لیا اور سر لے کر
سیدھا پرتھی راج کے پاس پہنچا۔ راجہ نے اس کو شاباش دی۔
پاوس کا بھائی بھی مارا گیا۔ دوپہر کے وقت راول سمر سنگھ اور
تتار خاں کا مقابلہ ہوا۔ معرکہ بڑے زور شور سے رہا۔ آخر میں تتار
خاں کام آیا۔ نصرت خاں آگے بڑھا۔ اس نے سمر سنگھ کا مقابلہ کیا
جب اس کے ایک ہزار آدمی مارے گئے۔ شاہ نے اسے تازہ
مدد بھیجی۔ اب نصرت خاں اور کنہ رائے کا مقابلہ ہوا اور دونوں
مارے گئے۔ میاں مصطفیٰ نے دھاوا کیا۔ راول جی کی فوج سے
اس کو پالا پڑا اور میران مصطفیٰ دونوں بھائی مارے گئے۔ اس وقت
شاہی فوج سے گیارہ میروں نے یورش کی۔ دونوں فوجیں مل گئیں
اور خوب چپقلش رہی۔ آخر میں وہ گیارہ میر اور راول جی کھیت رہے
جام رائے ہراول میں آیا۔ شاہی فوج سے سبحان خاں نے حملہ
کیا۔ دونوں سرداروں میں خوب ہتھیار چلے اور جام رائے قتل
ہوا۔ بیجون کے فرزند بلبھدر نے دھاوا کیا۔ اس کی مدد پر لو اور
سردار بڑھے۔ بل بھدر سے جلال جلوس مقابلہ پر آیا اور دونوں
لڑتے لڑتے مارے گئے۔ غازی خاں سے پاوس پنڈیر کا معرکہ ہوا
اور پاوس قتل ہوا۔ اتوار اور پیر کو جنگ رہی۔ آخری دن چانڈ
رائے کے مقابلے میں غازی خاں آیا اور چانڈ بڑے جوش کے
ساتھ لڑا۔ جیت راؤ نے ہراول سنبھالی۔ میاں منصور روہیلہ
اور چانڈ رائے میں رزم کی ٹھنی اور دونوں بہادری کے ساتھ
لڑتے لڑتے ہلاک ہوئے۔ جیت راؤ کے مقابلے کے لیے شاہ کا

بھانجا گیارہ ہزار فوج کے ساتھ آیا۔ اس بہادر کے قتل پر پرتھی راج نے بڑا رنج کیا۔ پرسنگ رائے کچھی شاہی فوج پر حملہ کرتے ہوئے کام آیا۔ بگڑی رائے نے بڑی مردانگی سے پانچ مسلمان سرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور خود بھی لقمۂ اجل ہوا۔ اب شاہی فوج نے پرتھی راج کے گرد گھیرا ڈالا۔ سنگھ پر مار نے اس وقت غیر معمولی دلاوری دکھائی اور پندرہ مسلمان سرداروں کو کھیت رکھ کر راہی عدم ہوا۔ شاہی فوج کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ لوہانا نے بڑھ کر اس بڑھتے سیلاب کو روکا۔ اگرچہ مارا گیا مگر مرتے مرتے بھی اپنے قاتل کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ کمدھج رائے کی باری آئی۔ آرج سنگھ داد شجاعت دے رہا تھا کہ کسی مسلمان سردار نے پیچھے سے آکر ایک ہی وار میں کام تمام کر دیا۔ پرتھی راج کے محافظ سرداروں کی غیر معمولی بہادری سے یون فوج نے گھونگٹ کھایا۔ خان ساٹھی۔ خان فیروز۔ عالم۔ سالم فتیح۔ اکوب (یعقوب) پیرن۔ محبت۔ میرن۔ راجن۔ تاجن۔ ہاجن۔ پیرن۔ توگن۔ کالن (کلن) حاجی غازی سیرن خاں۔ غنی خاں نیازی۔ حاسن (حسن) خاں۔ برہم (بیرم) خاں غزنی خاں۔ داؤد خاں۔ مصطفےٰ خاں۔ عمر خاں۔ کوجک (کوچک) خاں۔ جلال۔ بیرن۔ میرن۔ دگین۔ دوسن۔ غالب خاں۔ میر ایلچی خاں۔ علی خاں۔ سکت خاں۔ جلو خاں۔ قایم خاں۔ میرزا جھدی جوسن (جوشن) خاں وغیرہ سردار بھاگے۔ شاہی فوج سے شاہ کا بھانجا آگے بڑھا۔ خان خاناں کے سوائے ۱۴ میروں کو مار کر سمر سنگھ جی کام آئے۔ ملیچھ لشکر نے پرتھی راج کو زیادہ سختی

کے ساتھ گھیرا۔ اس نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے محصور دیکھ کر گرو رام کو کنڈل دان کیا۔ گرو رام کنڈل لے کر چلا۔ مگر مسلمانی لشکر نے اسے گھیر لیا۔ اور بھول خاں نے اس کا سر اڑا دیا۔ مگر گرو کے دھڑ نے گرتے گرتے بھی شاہ کے بھانجے کو قتل کر ڈالا۔ راجا نے گرو کے قتل پر بڑا رنج کیا۔ مسلمانی لشکر کا حلقہ راجہ کے گرد اور بھی تنگ ہوتا گیا۔ گرو رام کے کنڈلے نے راجہ کی خوب حفاظت کی۔ عرب خاں اوزبک نے پرتھی راج پر حملہ کیا۔ مگر اس کے تیر باراں سے ساری فوج تتر بتر ہوگئی۔ اب محمود خاں راجا کے مقابلے پر آیا۔ راجا نے اسے بلا تامل ہلاک کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اکتیس میر سرداروں نے مل کر پرتھی راج پر یورش کی اور بولے کہ کمان ہاتھ سے پھینک دے۔ راجہ نے نہیں مانا اور تیر چلایا مگر تیر خطا گیا۔ راجہ نے اب کٹار نکالی۔ مگر فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے پکڑنے والوں کے یہ نام ہیں:-

محمد۔ عالیل۔ آکھوب (یعقوب) خاں۔ ساریر خاں سلطان۔ فیروز خاں۔ غازی خاں۔ الیپ (یوسف) خاں۔ الو خان۔ قاسم قایم خانی۔ محمود۔ ہیام خاں۔ عالم۔ آکوب (یعقوب) عالم خاں۔ فیروز۔ نوروز۔

پرتھی راج کی گرفتاری کی خبر سن کر سنجوگتا نے اپنی جان دے دی اور شاہ پرتھی راج کو لے کر غزنیں چلا گیا۔

بان بیدھ پرستاو

سرسٹھویں داستان

جالپا دیوی کے مندر کا دروازہ کھلنے پر کوی چند رخصت ہوتا ہے اور دلی پہنچتا ہے۔ شہر کی ابتر حالت سے شاعر بہت پریشان ہوتا ہے اور بیوی سے راجا کی گرفتاری کا حال سُن کر اور بھی غم زدہ ہوتا ہے اور جوگ لے لیتا ہے۔ بھوانی دیوی کا دھیان کرتا ہے۔ دیوی اسے درشن دیتی ہے۔ شاعر اپنے فرزند جلہ کو راسو پڑھاتا ہے اور بیوی کو الوداع کہتا ہے۔ چلتے وقت کہتا ہے کہ ناموری دنیا میں اعلیٰ ترین وصف ہے۔ وہ اپنی دھن میں غزنین کی طرف روانہ ہوجاتا ہے اور صعوبت راہ سے دوچار ہوتا ہے۔ بھگوتی دیوی کی سمرن کرتا ہے۔ دیوی اپنا درشن دیتی ہے۔ وہ اس سے امداد کا جویا ہوتا ہے۔ دیوی خوش ہوکر اپنے آنچل کا ٹکڑا اسے عنایت کرتی ہے اور شاعر دیوی کی مہربانی سے بخیریت تمام غزنین پہنچ جاتا ہے۔ دربار شاہی کا رُخ کرتا ہے اور ڈیوڑھی پر پہنچ کر دربان سے اپنا تعارُف کراتا ہے اور اپنے فضل وکمال کا تذکرہ کرتا ہے۔ دربان اسے عزت کی جگہ بٹھاتا ہے اور کہتا ہے۔ کوی چند! میں تجھے پہچانتا ہوں۔ کوی یہ دیکھ کر کہ وہ پہچان گیا گیا ہے وہاں سے چل دیتا ہے۔ سہ پہر کو شاہ ہدف کھیلنے کی خواہش کرتا ہے۔

ہدف ساہ کھلن چڑھن دیو آپ فرمان

شاہ کی سواری نکلی ۔ شاعر نے ہاتھ اُٹھاکر اسیر باد دی اور ثناخوانی شروع کی ۔ شاہ اس کی طرف ملتفت ہوا اور پاس بُلاکر سب حال پوچھا ۔ کوی نے ہر بات کا معقول جواب دیا ۔ پادشاہ فیروز خاں حبشی کو شاعر کی خاطر مدارات کے لیے حکم دیتا ہی ۔ شاعر بھیم کھتری کے گھر ٹھہرتا ہی اور اس سے ایک علیحدہ مقام مانگتا ہی ۔ بھیم اس کو علیحدہ مکان دے دیتا ہی ۔ کوی ودیج منتر کا جاپ شروع کرتا ہی ۔ دیوی نمودار ہوتی ہی اور کہتی ہی کہ شاہ کی ۔ پرتھی راج کی اور تیری موت بیک وقت واقع ہوگی ۔ بھیم پوچھتا ہی کہ یہ کیسے ممکن ہی کہ تینوں ایک ہی وقت میں فوت ہوں ۔ شاعر اس کو بھی دیوی کے درشن کرا دیتا ہی ۔ اس رات مسلمانوں کے جنتر منتر نہ چل سکے اور مُلّا لوگ بڑے حیران رہے ۔ صبح ہوتے ہی شاہ نے کوی کو بلانے کا ارادہ کیا اور ' حجاب ' کو شاعر کے لانے کا حکم دیا ۔ مگر تتار نے اسے روکا ۔ شاہ نے کہا دیکھیں تو سہی اس میں کیا بھید ہی ۔ باتوں باتوں ہی میں بڑے بڑے بھید افشا ہوجاتے ہیں ۔ تتار نے عرض کی کہ دشمن اور سانپ پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے ۔ اگر ایسا ہی منظور ہی تو پہلے آپ اپنی قبر کھدوالیں اور پھر چند کو بلوانے کا خیال کریں ۔ شاہ نے کہا وہ بڑا باکمال انسان ہی ۔ میں تو اس سے ضرور ملوں گا ۔ تو نادان کیا سمجھے ۔ کوی دروازے پر آگیا مگر تتار خاں کے اشارے سے دربان اسے اندر جانے سے مانع ہوا ۔ شاعر نے فوراً دیوی کی سمرن شروع کردی ۔ آخر شاہی حکم کی

تعمیل میں حجاب، شاعر کو پادشاہ کے سامنے لا کھڑا کرتا ہی اور سوال و
جواب ہونے لگتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر پرتھی راج کے پاس جاتا ہی
اور سلام کرتا ہی مگر غمزدہ پرتھی راج مطلق توجہ نہیں کرتا۔ شاعر اس کی
برداولی (وصف خوانی) شروع کر دیتا ہی۔ راجا اس کو پھٹکارتا ہی
کوی کہتا ہی کہ ہونہار سے تو میں لاچار ہوں اور راجہ کو سمجھانے کی کوشش
کرتا ہی مگر راجا نہیں مانتا آخر وہ راجا سے کہتا ہی کہ تو وہ بردان دے
جس کا تونے وعدہ کیا تھا۔ راجہ جواب دیتا ہی کہ میں اب نابینا ہوں
نشانا کیسے بیدھ سکتا ہوں۔ شاعر نے کہا کہ آپ وعدہ کیجیے میں شاہ
کو بلالوں گا۔ اس کے بعد دونوں میں سوال و جواب ہوے۔ حجاب
شاعر کو لے کر شاہ کے پاس آیا۔ کوی نے شاہ سے کہا کہ اگر آپ
اجازت دیں تو راجا دان دینے کے لیے تیار ہی۔ تتار نے خفا ہوکر
کوی کو ڈانٹا۔ کوی نے پھر شاہ سے عرض کی کہ اگر بادشاہ قول دیں
تو اپنی آنکھوں سے تماشا دیکھ لیں۔ شاہ حکم دینے پر راضی ہوگیا۔ گھڑیال
منگوا کر سجایا گیا اور تماشا دیکھنے کے لیے تماشائیوں کی بھیڑ لگ گئی۔
تتار خاں نے کہا کہ آج جمعرات ہی۔ اس کو ملتوی رکھیے اور شاہ
سے اپنا خواب بیان کیا اور پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ نے
کہا میں قول دے چکا ہوں۔ اپنے وعدے سے نہیں پھروں گا۔
تتار دق ہوکر دربار سے اُٹھ آیا۔ شاہ نے کوی کو پان دیا اور کہا
کہ ہم نے تو قول دے دیا تم راجہ سے دان مانگو۔ شاعر راجا کو لے کر
دربار میں آیا۔ حجاب نے راجا کے ہاتھ میں کمان دی۔ راجہ نے چلّا
چڑھانے میں کئی کمانیں توڑ ڈالیں۔ سب کے بعد راجا کو میرا کی کمان

دی گئی۔ راجا اسے چڑھاتا ہے۔ میرا کہنا ہے کہ اگر تم نے گھڑیال کو اڑا دیا تو شاہ تم کو آزاد کردے گا۔ بلکہ اور انعام بھی دے گا۔ کوی نے کہا راجہ کو اس کی اپنی کمان دی جائے۔ حجاب راجا کی کمان لے کر آیا تو اس نے کہا یہ تماشہ مت دیکھو۔ اس میں مارے جاؤگے۔ راجا اپنی کمان پاکر بہت مسرور ہوا۔ نصرت خاں نے اس کے ہاتھ میں ترکش دیا۔ چند نے راجہ کو سمجھا بجھا کر اس کو اپنے ارادے میں پکا کر دیا۔ راجا نے شاعر سے کہا۔ میرے دوست! مجھ میں اب وہ ہمت نہیں رہی۔ کیا کروں۔ کوی نے کہا تم کمان تو سنبھالو۔ اگر میں ویسا ہی نہ کردوں تو کوی نہیں۔ اس پر پرتھی راج جوش میں آکر بولا۔ میں ضرور دشمن کو مار گراؤں گا۔ کوی نے راجا کو اور جوش دلایا۔ راجا بولا۔ میں سات دشمنوں کو ایک ہی تیر میں چھید دوں گا۔ کوی نے کہا۔ سات نہیں ایک کو چھید یے۔ راجا نے شاعر کے اشارے پر شاہ کی طرف رخ کیا اور کمان لے کر شاہ کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ کوی نے ڈگڈگی بجاکر شاہ سے حکم دینے کی درخواست کی اور ادھر راجا کو حوصلہ دیا۔ شاہ کے ہاں کہنے پر راجا نے اس کے تالو کا نشانا باندھا۔ پہلے حکم پر تیر سنبھالا۔ دوسرے پر چلہ چڑھایا اور تیسرے حکم پر شاہ کا تالو چھید ڈالا۔ بادشاہ فی الفور گر گیا۔ اب شاعر نے راجا کو خودکشی کے اقدام پر آمادہ کرنا چاہا۔ وہ بولا یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ شاہ کے ہلاک ہونے پر کھلبلی مچ جاتی ہے۔ اتنے میں کوی چند چھری سے اپنا سر کاٹ ڈالتا ہے اور وہی چھری راجا کو دے دیتا ہے اور پرتھی راج اس چھری سے اپنا کام تمام کر ڈالتا ہے۔

۲- تنقید

سطور ذیل میں ایسی تنقید ہدیۂ خدمت ناظرین کی جاتی ہی جو مسلمانی نقطۂ نظر سے راسا کے خلاف پیش کی جاسکتی ہی اور جس کی طرف دیگر اہل قلم نے بہت کم توجہ دی ہی۔ سہولت کے خیال سے میں اپنے خیالات کو مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔

سُلطان معزالدّین محمد بن سام

راسا میں سُلطان معزالدین محمد بن سام کو جن مختلف ناموں اور نسبتوں سے یاد کیا گیا ہی۔ حسب ذیل ہیں:-

(۱) ساہاب دین سرتان (شہاب الدین سُلطان)
(۲) ساہ ساہاب (شاہ شہاب)
(۳) ساہاب (شہاب)
(۴) ساہاب شاہ (شہاب شاہ)
(۵) سرتان دین ساہاب (سُلطان دین شہاب)
(۶) سہبت (شہاب)
(۷) ساہاب دین (شہاب الدّین)
(۸) کھورسان ساہاب (خراسان شہاب
(۹) ساہب دین سُلطان (شہاب الدّ
(۱۰) ساہب دین (شہاب الدّین
(۱۱) سہاب گوری (شہاب غوری
(۱۲) گوری سہاب (غوری شہاب
(۱۳) گوری ساہ (غوری شاہ) سرتان گوری (شاہ سُلطان غوری

(۱۴) سرتان گوری (سلطان غوری) (۲۰) تپی ساہ (بادشاہ)
(۱۵) گجنین گوری (غزنین غوری (۲۱) سرتان (سلطان)
(۱۶) ساہ گوری (شاہ غوری (۲۲) شاہ سرتان (شاہ سلطان)
(۱۷) گوری (غوری) (۲۳) ساہ سہب (شاہ شہاب)
(۱۸) گوری سرتان (غوری سلطان) (۲۴) ساہ کھورسان (شاہ خورسان)
(۱۹) پاتساہ (بادشاہ) (۲۵) کھندھار تپی (شاہ قندھار)

مذکورۂ بالا ناموں میں ایسے نام بھی پائے جاتے ہیں۔ جو غوری کے ساتھ ترکیب پاتے ہیں۔ اس لیے بے موقع نہ ہوگا اگر وہ قصہ جو سلطان کے "گوری" کہلائے جانے کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور راسا میں مذکور ہے۔ میں اپنے ناظرین کی دلچسپی کے خیال سے یہاں نقل کردوں۔

دھن کتھا چوبیسویں داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ پرتھی راج نے سلطان کے وزیر تتار خاں کے ایلچی سے جو سلطان کی رہائی کے لیے غزنین سے چل کر دہلی آیا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک روز دریافت کیا کہ ہمیں تم یہ تو بتاؤ کہ تمھارا بادشا شہاب الدین "گوری" کیوں کہلاتا ہے۔ ایلچی نے جس کا نام لورک رائے کھتری تھا۔ عرض کی کہ شہاب الدین سے پہلے غزنین کے تخت پر مسلمانوں کا بادشاہ شاہ جلال تھا۔

بیٹھے پاٹ اسورن ۱ ساہ جلال پرمان ۱۱ چھند ۳۹۴ صفحہ ۲۴۵
اس کی حرم میں پانسو دس عورتیں تھیں۔ جب اسے کسی حرم کے حاملہ ہونے کی اطلاع ملتی اس اندیشے سے کہ مبادا فرزند

فرزند پیدا ہو اور بالغ ہوکر اسے قتل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لے وہ
فوراً اس بیگم کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالتا۔ اس قدر ظالم ہونے
کے باوجود وہ ایک درویش شیخ نظام نامی سے بہت عقیدت رکھتا
اور اس کی خدمت گزاری میں مصروف رہتا۔ اس کی خدمات سے
خوش ہوکر ایک دن درویش نے یہ بشارت دی کہ تمھارے ایک
بلند اقبال وارث تخت پیدا ہوگا۔ جو مسلمانوں (اسوروں) کی
سلطنت کو چار دانگ عالم میں پھیلا دے گا۔ شاہ کو یہ بشارت گراں
گزری اور تشویش کے عالم میں قصر شاہی کی طرف لوٹا۔ یہاں پہنچ کر
سب سے پہلی خبر جو اس نے سُنی یہ تھی کہ اس کی ایک حرم حاملہ
ہے۔ شاہ جلال نے حسب معمول اسے موت کے گھاٹ اتارنا چاہا
لیکن قبل اس کے کہ یہ ارادہ عمل میں آتا۔ بیگم اپنی پیاری جان لے کر
محل سے غایب ہوگئی۔ اس واقعے سے پانچ سال بعد شاہ جلال نے
وفات پائی۔ اس وقت امرائے سلطنت کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ بغیر
وارث ملک کے سلطنت کا انتظام کیوں کر کیا جائے؟ اس غرض
کے لیے ایک مجلس مشورت منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ایک شیخ
نے جو شہر کے باہر ایک گورستان میں رہتا تھا آکر کہا کہ اے امرا
دولت میں تمھیں قدرتِ باری کا ایک سچا واقعہ سناتا ہوں اگر تم نے
جھٹلا تو مجھے سزا دینا اور اگر سچ ثابت ہو تو انعام دینا۔ امرائے
شاہی کے استفسار پر شیخ نے کہا۔ آپ خداوندِ پاک کی قدرت
ملاحظہ کیجیے۔ فتح بی بی نے جو بادشاہ کی حرم تھی شاہی محل سے فرار
ہوکر ایک گور کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اسی گور میں اس کے ایک

لڑکا پیدا ہوا جو شکل و صورت میں چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہے اور درحقیقت یہی بچہ وارث ملک ہے۔ یہ قصہ سن کر عمائدین ملک خوش ہوئے اور اسی وقت شیخ کے ہمراہ ہولیے۔ شیخ نے گورستان میں پہنچ کر دور سے انھیں بچے کو انگلی سے بتایا۔

جھوٹی ہوے تو سجا لیجے	سچی ہوے ز اجب کیجے
بے خان ل پوچھے تمن	کہوے سیکھ سو کیا کدرتن
بی بی فتے شاہ کی گھرنی	کدرت گور مڈتی اک دھرنی
گور مڈتی اک چیلک واہن	دیکھ سروپ کوٹی ردی بھان
بے کھان مدھی گور سدعا	کر انگری تہی سیکھ دکھائے

چھند ۳۲۰ تا ۳۲۲ صفحہ ۲۹

امرائے ملک اس بچے کی رعب دار صورت اور ہونہار قیافہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور عزت و احترام کے ساتھ اسے شاہی محل میں لے آئے۔ خان جہان نے فوراً نجومیوں کو بلایا انھوں نے بچے کا زائچہ دیکھا اور بولے کہ یہ بچہ ایک اولوالعزم اور جلیل القدر بادشاہ ہوگا۔ اور ہندوستان میں مسلمانی سلطنت کی بنیاد ڈالے گا۔ اور جو شخص اسے بار بار قید و اسیر کرے گا۔ انجام میں یہ اس کو بھی تباہی کے گھاٹ پہنچا کر رہے گا۔

گویا شہاب الدین کے گوری (غوری) کہلائے جانے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک گور میں ولادت اور پرورش پائی تھی نہ وہ وجہ جو مسلمان مورخین بیان کرتے ہیں کہ ملک غور اس کا وطن تھا۔ ایسی نکتہ سنجیاں راسا کے مصنف کی جہالت اور تاریخ سے

اس کی بے خبری کا پردہ فاش کرتی ہیں اور ہماری سنجیدہ توجہ کی مستحق نہیں ہیں۔
مذکورہ بالا قصہ جو سلطان کے باپ کو اپنی بیویوں کا قاتل بیان کرتا ہے۔ انگریزی کے اس قصے سے جو بلو بیرڈ (نیلی ڈاڑھی والے) کے نام سے مشہور ہے ملتا جلتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ بلو بیرڈ کو تصاویر میں مسلمانی لباس میں دکھایا گیا ہے اور اس کی بیوی کا نام فاطمہ بتایا ہے۔ ہمیں چند کوی کے اس قصے کو بلو بیرڈ کی کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دینا چاہیے۔ مگر ان بزرگوں کی بدگمانی رفع کرنے کے لیے جو پنڈت موہن لال وشنولال پنڈیا کی طرح ہر ایسے قصے میں جو مسلمانوں کے خلاف جاتا ہو صداقت کا عنصر نمایاں دیکھتے ہیں اور مسلمان مورخین کو ان کی قومی تاریخ کے تاریک پہلوؤں سے پردہ دارانہ اغماض کا مجرم بیان کرتے ہیں۔ اس قدر کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند کوی نے بسم اللہ ہی غلط کر دی جب اس نے شہاب الدین کے باپ کا نام شاہ جلال بتایا۔ یہاں وہ شاہ جلال بیان کرتا ہے لیکن بڑی لڑائی رو پرستاو میں سلطان جلال سکندر بتایا ہے:۔

سلتان سہاب دین الہ آیایا سلتان جلال سکندر جایا

چھند ۱۴۰ صحہ $\frac{۲۱۲۶}{۱۸}$ چھیاسٹھویں داستان

جس سے مقصد جلال الدین سکندر بلکہ جلال بن سکندر ہے۔
مگر باجتماع مورخین اسلام شہاب الدین کے باپ کا نام سلطان بہاء الدین سام بن ملک اعز الدین حسین ہے۔ ملک اعز الدین حسین کو سلطان مسعود ثالث بن ابراہیم غزنوی ۴۹۳ھ میں ایالت

غور پر سرا فراز کرتا ہے۔ اس کے سات فرزند تھے۔ ۱۔ ملک فخرالدین مسعود امیر بامیان و طخارستان۔ ۲۔ سلطان بہاءُالدین سام امیر غور و فیروز کوہ جو شہاب الدین کا باپ ہے۔ ۳۔ ملکُ الجبال قطبُ الدین محمد جو فیروز کوہ کو آباد کرتا ہے۔ ۴۔ سلطان سیفُ الدین سوری شاہ غور۔ ۵۔ سلطان علاء الدین حسین بادشاہ غور و غزنین و بامیان۔ ۶۔ ملک شہابُ الدین محمد خرنک ملک مادین۔ ۷۔ ملک شجاع الدین علی امیر جرماس غور۔

باپ کی وفات پر بھائیوں نے تمام علاقے کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ لیکن قطب الدین محمد ملک الجبال کسی بنا پر بھائیوں سے خفا ہو کر غزنین چلا گیا۔ بہرام شاہ غزنوی نے اپنے دربار میں اسے عزت کی جگہ دی اور شرف دامادی بخشا۔ کچھ عرصے کے بعد ایسے اسباب پیدا ہو گئے۔ کہ بہرام ملک الجبال سے بدظن ہو گیا اور کہتے ہیں کہ زہر دلوا دیا۔ اس پر غوریوں اور غزنویوں میں عداوت قایم ہو گئی اور سیفُ الدین نے بھائی کا انتقام لینے کے لیے غزنین پر چڑھائی کر دی۔ اور بہرام شاہ کو شکست دے کر غزنین پر قبضہ کر لیا۔ بہرام شاہ بھاگ کر کرمان[۱] چلا گیا۔ اہل غزنین نے بظاہر نئے بادشاہ کو قبول تو کر لیا۔ لیکن جب موسم سرما آیا۔ برف باری شروع ہوئی اور غور اور غزنین کا راستہ بند ہو گیا۔ اہل غزنین کے اشارے سے بہرام نے یکایک شہر پر حملہ کر دیا۔ سیفُ الدین آسانی کے ساتھ

---

[۱] یہ کرمان ایران کے صوبہ کرمان سے بالکل مختلف ہے اور افغانستان کے جنوب میں غزنین اور لاہور کے راستے پر واقع ہے۔ یہ ایک بڑا علاقہ ہے جو مختلف دروں پر شامل ہے کرمہ اور اس کی پانچ گزار ندیاں اس کو سیراب کرتی ہیں۔

گرفتار ہوگیا اور بڑی ذلت اور تشہیر کے بعد قتل کر دیا گیا۔ غزنین پر دوبارہ بہرام شاہ کا قبضہ ہوگیا۔ بھائی کا بدلا لینے کے لیے بہاءُالدین سام نے غور، جروم اور غرجستان سے ایک لشکرِ عظیم جمع کرکے غزنین کا رُخ کیا۔ لیکن بھائی کا صدمہ اس پر اس قدر غالب آچکا تھا کہ جب وہ کیدان پہنچا بیمار پڑا اور چند روز کے بعد انتقال کر گیا۔ باقی مہم کو علاءُ الدین حسین جو غزنین کو تباہ کرکے جہانسوز کے خطاب سے شہرت پاتا ہی انجام کو پہنچاتا ہی جس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔

کوی نے سُلطان کی ماں کا نام بی بی فتح بیان کیا ہی۔ لیکن جو شخص کہ خود سُلطان اور سُلطان کے باپ کے نام سے ناواقف ہو وہ بدرجۂ اولیٰ اس [illegible] کے نام سے بے خبر مانا جا سکتا ہی۔ دوسرے مسلمانوں میں مستورات کے ذکر سے عام طور پر احتراز بھی کیا جاتا [illegible] شاہی بیگمات کے ناموں سے۔ بی بی فتح، ہندی طرز کا نام ہی۔ چنانچہ فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ) کی ماں کا نام اس کے میکے میں بی بی نائلہ اور سسرال میں بی بی کد بانو تھا۔ شمس سراج عفیف اپنی تاریخ میں لکھتا ہی کہ: "مادرِ سُلطان فیروز را نام اصل بی بی نائلہ (نائلہ) نام داشتہ بود۔ چوں در خانۂ سپہسالار رجب آمد سُلطان تغلق بی بی کد بانو نام کرد"۔ اسی طرح بی بی راجی سُلطان حسین شرقی والی جونپور (۸۶۲-۹۰۵ھ) کی ماں کا نام تھا۔

سلطان معز الدین محمد بن سام کی ماں کا اصلی نام تو شاید کسی کو بھی معلوم نہیں۔ وہ اپنے سسرال میں اپنے وطن کی نسبت سے 'ملکۂ کیدان' کہلاتی تھی۔ چنانچہ طبقات ناصری میں وہ اسی

عرف سے یاد کی گئی ہے۔ ملکۂ کیدان، ملک بدرالدین والی کیدان کی دختر تھی۔ یہ خاندان بھی ملوک غور کی طرح شنسبی ہے۔ بہاؤالدین سام اور ملکۂ کیدان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) سلطان غیاث الدین محمد بادشاہ غور (۲) سلطان معزالدین محمد بادشاہ غزنین و فاتح ہندوستان پرتھی راج کا حریف جس کا ایام شہزادگی میں شہاب الدین نام تھا۔ (۳) ملکۂ جہاں، ملک تاج الدین زنگی کی ماں۔ (۴) حرۂ جلالی، جو سلطان شمس الدین محمد ابن ملک فخرالدین مسعود والی بامیان سے بیاہی گئی۔ (۵) ملکۂ خراسان، جو سلطان سنجر کے بھتیجے ملک قزل ارسلان سے بیاہی گئی۔

مختصر یہ ہے کہ چند کوی جس طرح سلطان معزالدین کے صحیح نام سے بے خبر ہے اسی طرح سلطان کے باپ اس کی ماں اور اس کے وزیر کے اصلی ناموں سے بھی ناواقف ہے اور جو مؤرخ اپنی تاریخ کے اہم افراد اور اشخاص کے ناموں سے اپنی جہالت کا اس قدر ثبوت دیتا ہے۔ اس کے بیان کردہ دیگر واقعات و روایات سے بھی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ میرا یہ قول چند کے حق میں تو بالکل صادق آتا ہے۔ شہاب الدین کے متعلق اس کے بیانات قطعاً بے بنیاد اور غیر تاریخی ہیں۔

سُلطان کے اُمرا کے نام

ذیل میں ہم وہ اسماء ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو راسا میں سلطان شہاب الدین کے امراء [illegible] کے ناموں کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف نہ صرف اس عہد کے تاریخی اشخاص کے ناموں سے بے خبر ہے۔ بلکہ جس قدر نام وہ دے رہا ہے سلطان معز الدین محمد بن سام کے عہد سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔

تاریخ اسلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ ہر عہد میں ملوک و امرا کے نام و خطاب رکھنے کا دستور مختلف رہا ہے۔ جو نام و خطاب ایک عہد میں جاری ہیں وہ دوسرے عہد میں متروک ہو گئے ہیں۔ یہ تبدیلی اگرچہ تدریجی ہے۔ مگر صدیوں کا فرق اس کو نہایت واضح اور روشن کر دیتا ہے۔ اگر ہندوستان کے پٹھانوں اور غوریوں کے عہد کے نام و خطاب کا مقابلہ کیا جائے تو وہ اس قدر متفاوت ہیں کہ ان کی شناخت میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی۔ غوریوں کے زمانے میں امرائے سلطنت ملوک کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ اور ان کے ناموں سے پہلے 'ملک' (بفتح اول وکسر دوم) کا لفظ ضرور لایا جاتا تھا۔ مثلاً ملک حسام الدین خرمیل۔ ملک ناصر الدین تمران۔ ملک تاج الدین تکران وغیرہ۔ ان کے علاوہ غیر معروف وطنی نسبتیں یا عرف

کا بھی رواج تھا۔ چنانچہ تمران۔ ماوین۔ مکران۔ کرماخ۔ کیدان بخرمیل
وجیری۔ ایبک۔ یلدز۔ قباچہ وغیرہ۔ اسی طرح بعض عہدوں کے
نام بھی شامل ہوتے تھے۔ مثلاً امیر داد۔ امیر حاجب۔ خاص بک
یوز بک۔ مغلوں کے عہد میں جس سے میرا مقصد اکبر، جہانگیر اور
شاہجہاں کا زمانہ ہے۔ ایسے خطابات عام طور پر ملتے ہیں جو خان پر
ختم ہوتے ہیں مثلاً رومی خاں۔ مخلص خاں۔ غازی خاں وغیرہ۔
بعض ایسے بھی ہیں جو خاں سے شروع ہوتے ہیں مثلاً خان جہاں
خان دوران۔ خان اعظم۔ خان عالم اور خان خاناں۔

خان کے متعلق ہمیں یاد رہے کہ یہ دراصل ترکی لفظ (معنی
بادشاہ) ہے۔ جو اولاً سلاطین ترک کے لیے مخصوص تھا۔ مثلاً خان خطا
خان قبچاق۔ سلاطین اسلام میں سب سے پیشتر ایلک خانی (افراسیابی)
سلاطین یہ لفظ اپنے ناموں کے آخر میں لانے لگے ہیں۔ مثلاً ایلک خان
طمغاج خان۔ قدر خان وغیرہ۔ لیکن سلاطین غوریہ نے نہ اپنے لیے
نہ اپنے امرا کے لیے "خان" کا استعمال کیا ہے۔ البتہ ان کے
جانشین سلاطین شمسیہ (خاندان غلاماں) کے عہد سے یہ لفظ ہندوستان
میں رواج میں آنے لگا۔ ان کے ہاں امرا کی دو تقسیمیں ہو گئی
تھیں یعنی ملوک اور خوانین۔ طبقہ ملوک میں معمولی امرا شامل تھے
اور خوانین میں شہزادگان سلطنت و امرائے کبار نہ اعلیٰ تھے۔
مقدم الذکر کے نام سے پہلے وہی لفظ ملک آتا ہے۔ لیکن خوانین
کو ایسے ترکی خطاب دیے جاتے ہیں جو خان پر ختم ہوتے ہیں۔
چنانچہ تاج الدین سنجر کا خطاب "کزلک خان"، ملک عز الدین طغرل

کا "طغان خان"، ایبک مقطع لکھنوتی ولکور کا "اور خان"، قمرالدین قیران کا "تمر خان"، ملک اختیارالدین یوزبک کا "طغرل خان"، عزالدین بلبن کا "کشلو خاں"، اور بہاءالدین بلبن کا "الغ خان"، تھا۔ زمانۂ مابعد میں ترکی کی قید تو جاتی رہی اور ہر ایسے قسم کے خطابات دیے جانے لگے جن کے ساتھ لفظ "خان" ترکیب پا سکتا تھا۔ مگر ایسے خطاب دیر تک شہزادوں اور خواص امرا تک ہی محدود رہے۔ مغلوں نے اپنے دور میں ادنیٰ ادنیٰ منصب دار یعنی دو صدی و صدی تک کو خانی کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ اور اس کا رواج نہایت عام کر دیا یہی حالت پرتھی راج راسا کی ہے۔ اس تالیف میں شہاب الدین کے افسروں و دیگر عہدے داروں کے جس قدر نام دیے ہیں مغلوں کے دستور کے مطابق اکثر خان پر ختم ہوتے ہیں۔ یا خان کے ساتھ شروع ہوتے ہیں۔ بلکہ بہت سے نام بھی وہی ہیں جو اکبر و شاہجہاں کے عہد میں رائج ہیں۔ میں اس مقصد کو واضح کرنے کی غرض سے سب سے پہلے راسا کے مذکورہ امرا کی ایک فہرست بہ ترتیب اتفاقی ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ بعد میں ایک فہرست سلطان معزالدین محمد بن سام کے امرا کی طبقات ناصری سے درج کرتا ہوں۔ نیز ایک منتخب فہرست مورخ عہد شاہجہاں عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ جلد اوّل سے دیتا ہوں۔ جس سے واضح ہوگا کہ شاہجہانی دور کے بہت سے نام ایسے ہیں جو راسا کی فہرست کے ناموں سے بہت قریب ہیں۔ بلکہ دونوں میں مشترک ہیں۔ راسا کی فہرست میں ایک کثیر تعداد ایسے ناموں کی ہے جو بالکل مصنوعی ہیں۔ اور ان کی

تخلیق کا ذمہ دار صرف مصنف کو مانا جاسکتا ہے۔

(۴) فہرست اسماء ازراسا

ازبک خاں۔ آلوخاں (عالم خاں) آکوب (یعقوب) خاں۔
عالم خاں۔ ایسپ (یوسف) میاں۔

اعظم۔ ابوخاں۔ احمد خاں۔ آرامس (آرائش) خاں۔ آیوب خاں رومی۔
بابر۔ بازید (بایزید) بھارتھ خاں۔ بلوچ پہاڑی۔ بیرم بنگش
راو۔ بامن برید

باجنت خاں غوری۔ برہم خاں۔ بہول خاں۔ خان بھٹی۔
پچھمی خاں۔ پہاڑ خاں۔ پیرن میر۔ پہاڑ پیر۔ پیرن۔ پیرم۔
تتار خاں۔ تاج خاں۔ تنگی خاں۔ تاجن خاں۔ توگن ترکام تام۔
جہانگیر خاں۔ جلال الدین۔ میر جمن۔ میر جام۔ جسوز خاں۔ جیہان
(جہان ؟) خاں۔ جلو خاں۔ جلال۔ جوسن (جوشن) خاں۔ جلیل خاں۔
جاد جوان۔ چنگیز خاں۔

حبش خاں۔ حجاب خاں۔ حبیب خاں حبشی۔ حبش خاں حجاب۔
حبش خاں حبشی۔ حبشی حسین۔ حبشی مسلم۔ حسن خاں۔ حاجی خاں نیازی۔
حاجی خاں۔ حسین شاہ۔ حاسن (حسن) خاں۔

خلچی خاں۔ خلیل خاں۔ خان خان۔ خان سید احمود۔ خان منگول
لالری۔ خان ہندو بر۔ خان خورسان۔

ختان خاں۔ خریس (قریش) خاں۔ خان ساٹھی۔ خورسان خاں۔
خان جمن (زمن) خواجہ قاسم۔ خان جہاں۔ خوب خاں۔ خان خاناں۔
دریا خاں۔ دلیل خاں۔ داؤد خاں۔ دگین ددسن۔ دہرمائن

سمایستھ ۔ خان رستم بجرنگی ۔

رستم خاں رومی خاں ۔ راجی خاں ۔ روشن علی ۔ روچن (روشن؟)
خاں ۔ راجن سجہت خاں ۔ سیرن خاں ۔ سیرن خاں ۔ سبحان خاں ۔
سارید (سریر؟) خاں سلیم خاں ۔

ساٹھی خاں ۔ سالم ۔ سارنگ دیو ۔ سادیپ ۔ سکت (شوکت؟) خاں
شمس الدین خاں ۔ شادی بیگ ۔ شادی ملک ۔

عثمان ۔ عالم خاں ۔ عرب خاں ۔ عمر خاں ۔ عالیل خاں ۔ علی اسد
خاں ۔ عمادمیر ۔ عبدالمیر ۔ عماد خاں ۔

علی خاں ۔ عالی اکرب (آل یعقوب؟) ۔

غیاث خاں ۔ غازی خاں ۔ غزنیں خاں ۔ غازی مراد (غنی؟) خاں
نیازی ۔ غالب خاں فتح خاں ۔ فیروز خاں (میر) فتح جنگ ۔ فتح نصیر
فتح وزیر ۔ فتن سوب ۔ فرید خاں ۔ فیروز خاں حبشی ۔

قاسم قایم خانی ۔ قاسم خاں ۔ قریش خاں ۔ قاضی کمال ۔ قایم خاں
خواجہ قاسم کاج شہرہ ۔

کبلی خاں ۔ ککر گکھر خاں ۔ کمال خاں ۔ کلیم خاں ۔ کمام بیگ ۔ کریم
خاں ۔ کرلن رکتن ؟ خاں ۔

کاذ سے ۔ کوجاب (کرچاک) خاں ۔ خان کمال گکھر ۔ میر کمود ۔
گکھر خاں ۔ گرت (غیرت؟) خاں ۔ گروع خاں ۔ گکھر گکھر شاہ
گھنگار غوری ۔ میر گردان ۔

لال خاں ۔ لورک رائے ۔

معروف خاں ۔ مور خاں ۔ محمد اساکلی (عیسیٰ قلی؟) مسمار خاں

میر محمد خاں ۔ میر ناصر ۔ محبت خاں ۔

میراں شاہ ۔ ملتان خاں ۔ مرزیز خاں ۔ محمود میر ۔ منصور بھند میر خاں ۔ محمود خاں ۔

میراں مند ۔ ملتان ادب ۔ ملک غالب ۔ منڈہ راو مرہٹہ ۔ بھدی مصطفیٰ خاں ۔ میرن ۔

منڈلیک ۔ میر آتش ۔ ماسوف میر (موصوف ؟) موسم میر ۔ مرزا ہدی ۔ میر ایلچی خاں ۔ میر محمود روہیلہ ۔ بہند ۔

نور خاں حجاب ۔ نور محمد ۔ نوری خاں ۔ نصرت خاں ۔ نظام شاہ نیازی خاں ۔ نوروز خاں ۔

وزیر خاں ۔ خان وہرم (بیرم)

ہجرت (حضرت ؟) خاں ۔ ہمام خاں ۔ ہاجن ۔ ہیرن ۔ ہیجم حجاب ہرحتر سین ۔ ہیر ۔ میر ہام ۔

مصنف کا دستور ہے کہ وہ صحت الفاظ کی مطلق پروا نہیں کرتا اور اُن کے ساتھ ہر قسم کی بے قاعدگی سے کام لیتا ہے۔ ان اسماء میں سلیم بتشدید لام اور کمّال و عمّاد بہ تشدید میم ز ئے گئے ہیں ۔ بہول خاں میں واو سے قبل الف چاہیے یعنی بہاول خاں ۔ حاسن خاں اور ساریر خاں میں الف اضافہ کر دیا ہے ۔ عثمان اور نصرت بضم اوّل کو بکسر اوّل لکھا ہے۔

بلوچ پہاڑی ۔ باجنت خاں غوری ۔ توگن ۔ خان پیدا محمود ۔ خان منگول لالری ۔ خان ہندوبر ۔ خاں خورسان ۔ خان خاں ۔ سیر حجاب ۔ عالیل ۔ عبدالمیر ۔ فتح نصیر ۔ فتح فرید ۔ کیلی خاں ۔ کالی

بلسے ۔ ملتان اوب ۔ ہمیام خاں ۔ ماجن ۔ میرن ۔ ہیجم حجاب وغیرہ
ایسے نام ہیں جن کو مصنف کے دماغ کی اختراع کہا جاسکتا ہے
کیونکہ بصورت موجودہ وہ مسلمانی اسما، کی ذیل میں نہیں آتے۔

الیسب ۔ آکوب اور آلو ۔ مارواڑی زبان میں یوسف یعقوب
اور عالم کی بگڑی شکل ہے ۔ ابّو ابراہیم کی بگڑی شکل ہے۔

(ب) فہرست امرا و ملوک سلطان معزالدین محمد بن سام از طبقات ناصری:-

ملک ضیاء الدین درغور ۔ بہاءالدین سام (بامیان) سلطان غیاث الدین
محمود (فیروزکوہ)

ملک [illegible] کیرانی ۔ ملک قطب الدین تمرانی ۔ ملک تاج الدین
حرب (سجستان)

ملک تاج الدین مکران ۔ ملک علاءالدین ۔ ملک شاہ وخشی ۔ ملک
ناصرالدین ایبغازی ۔

ملک تاج الدین زنگی (بامیان) ۔ ملک ناصرالدین (مادین) ملک
مسعود ۔ ملک ناصرالدین (تمران) ۔

ملک مویدالدین مسعود ۔ ملک شہاب الدین مادینی ۔ ملک شمس الدین
کیدانی ۔ ملک علاءالدین ۔ التسز حسین ۔

ملک حسام الدین علی کرماخ ۔ ملک مویدالملک کرماخ ۔ ملک ظہیرالدین
محمد کرماخ ۔ ملک ظہیرالدین فتح کرماخ ۔ ملک حسام الدین خرمیل ۔ ملک
ناصرالدین حسین امیر شکار ۔ ملک اختیارالدین خروار ۔ ملک اسدالدین
شیر ملک وجیری ۔ ملک رکن الدین سعد (کیدان) امیر سلیمان [illegible]
امیر حاجب محمد علی غازی ۔ امیر حاجب خاص ملک ۔ امیر حاجب حسین

محمد حسن - امیر حاجب حسین سُرخ - ملک شمس الدین سور کیدان -
(سلاطین) سُلطان تاج الدین یلدز - سُلطان قطب الدین ایبک -
سُلطان ناصر الدین قباچہ - سُلطان شمس الدین التمش - سلطان
علی الدین محمود -
سلطان غیاث الدین عوض حسین خلج -
(وزرا) ضیاء الملک درمشی - موید الملک محمد -
عبد اللہ سبجزی - شمس الملک عبد الجبار کیدانی -
(قضاۃ) صدر شہید قطب الدین ابو بکر - صدر سعید شرف الدین ابو بکر -
شمس الدین بلخی -

ان فہرستوں کا تفصیلی جائزہ ہمارا مقصد نہیں - ناظرین پر سرسری مشاہدے سے ظاہر ہو گیا ہوگا - کہ راسا اور طبقات کی فہرستوں میں کسی قسم کی نسبت اور اشتراک نہیں - جہاں طبقات ناصری سُلطان معز الدین محمد بن سام کے زمرہ [illegible] فہرست اسما پیش کر رہی ہے - راسا ایک خیالی اور فرضی فہرست دے رہا ہے - جو قطعیا غلط اور بے بنیاد ہے - جس کا ایک نام تک بھی صحیح نہیں مانا جا سکتا - [illegible] کے مطابق سلطان کا نام شہاب الدین ہے - لیکن ہمیں تاریخ سے معلوم ہے کہ یہ سُلطان کا شہزادگی کا نام تھا - جیسا وہ تخت نشین [illegible] الدین نام ترک کر دیتا ہے - اور "معز الدین" کا لقب اس کی جگہ اختیار کر لیتا ہے - چنانچہ اسی نام و لقب (یعنی معز الدین محمد بن سام) سے بعد کے زمانے میں وہ مشہور ہوا - طبقات کے الفاظ غیاث الدین محمد بن سام کے ذکر

میں حسب ذیل ہیں:-

پیش ازیں لقب او ملک شمس الدین بود و لقب برادرش شہاب الدین بعد از مدتے کہ بر تخت بود۔ لقب او سلطان غیاث الدنیا شد۔ و برادرش ملک شہاب الدین بعد از فتوح خراسان سلطان معز الدین شد (صفحہ ۶۹) چنانچہ یہی نام اس کے عہد کے کتبوں اور سکوں میں نظر آتا ہے۔ کتب تاریخ مثلاً تاج المآثر و طبقات ناصری۔ فیروز شاہی و مبارک شاہی بھی اسی نام سے یاد کرتی ہیں۔ مگر راسا اس کو فقط شہاب الدین کے نام سے جانتا ہے۔ اور اس کے اصلی نام معز الدین سے بالکل ناآشنا ہے۔ کیا ایک معاصر دستاویز میں جیساکہ راسا کے لیے دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ ایسی فاحش غلطی کا ارتکاب ہوسکتا ہے؟ راسا کی اس غلطی کی سراغ رسانی چنداں دشوار نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ خود مُغلیہ دور کے مورخین بابرو فرشتہ و ابوالفضل وغیرہم برخلاف قدیم مورخین کے سُلطان کو معز الدین کے مقابلے میں ترجیحاً "شہاب الدین" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ فرشتہ اسے "سُلطان معز الدین محمد بن سام المقلب بہ شہاب الدین غوری" کہتا ہے۔ ابوالفضل آئین اکبری میں شہاب الدین لکھتا ہے۔ خلاصۃ التواریخ میں سبحان راے شہاب الدین عرف معز الدین تحریر کرتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے بیانات راسا کے لیے جو اکبری عہد یا اس سے بعد کی تالیف ہے۔ گمراہی کا سامان بن گئے۔

اسی طرح راسا میں سُلطان کے وزیر کا نام تتار خاں بتایا

گیا ہے۔ جو اپنے بادشاہ کا نہایت مطیع اور فرماں بردار ملازم ہے۔ متعدد داستانوں میں اس کا ذکر موجود ہے جب کبھی سلطان پرتھی راج کے ہاتھوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ تتار خاں اس کی رہائی کے لیے زرِ فدیہ کے مہیا کرنے میں ہر ممکن کوشش عمل میں لاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ سلطان معزالدین کے تین وزیر ہیں:۔

(۱) ضیاءُ الملک دُرمشانی۔ (۲) مؤید الملک محمد عبداللہ سجزی (۳) شمسُ الملک عبدالجبار کیدانی۔ نظام الملک طوسی کے عہد سے ان ایام میں وزراء کے لیے ایسے مخصوص خطابات کا دستور جاری ہوگیا تھا۔ جو 'الملک' پر ختم ہوتے ہیں۔

تتار خاں اگرچہ خطاب معلوم ہوتا ہے۔ مگر سلطان معزالدین کے عہد سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ ہند میں رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ (۷۹۰ھ) اور اس کے پیشرو محمد بن تغلق کے زمانے میں ایک امیر اس خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ اور یہی پہلا موقعہ ہے جب ہم اس نام سے دوچار ہوتے ہیں۔

"دوم از آناں کہ از درگاہ ہمایوں اعلیٰ اختصاص بافراط بگرفتہ است اعظم تتار خاں بہادر بندہ امیر المومنین ضوعف قدرہ است۔"

(صفحہ ۵۷۹ تاریخ فیروز شاہی از ضیاء برنی)

اس عہد کے بعد تتار خاں بحیثیت خطاب تاریخ ہند میں وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتا ہے اور مغلوں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ کیا یہ امر تعجب خیز نہیں۔ کہ راسا کے مصنف کو نہ سلطان اور نہ اس کے

وزرا کے صحیح نام تک معلوم ہیں

راسا کی فہرست میں ہماری نظر سے جب ایسے نام گزرتے ہیں۔ مثلاً میر آتش۔ رومی خاں۔ اوزبک خاں۔ جہانگیر خاں۔ خان خاناں خان جہاں فتح خاں۔ شادی بیگ۔ کمام بیگ۔ اسا کلی (علیی قلی) حبش خاں۔ حبیب خاں حبشی۔ بنکٹ راو۔ منڈہ راو۔ تو ہمارے تصور میں عہد مغلیہ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اور بغیر کسی پس و پیش کے ہمیں کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ نام سب کے سب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

میر آتش۔ مصنف کے نزدیک کسی سردار کا نام ہے۔ لیکن وہ ایک عہدے کا نام ہے۔ یہ عہدہ ہندوستان میں مغلوں کی آمد کے بعد رواج میں آتا ہے۔ میر آتش توپخانے کا افسر ہوا کرتا تھا۔ یہی حالت رومی خاں کی ہے۔ سلطان بہادر شاہ والی گجرات کے افسر توپ خانے کا خطاب بھی رومی خاں تھا جس کے لیے یہ فقرہ مشہور ہے۔ "پھٹ پاپی رومی خاں نمکحرام" اکبر اور شاہجہاں کے زمانے میں بھی رومی خاں خطاب دیا گیا ہے۔ بہرحال میر آتش اور رومی خاں دسویں صدی ہجری میں ہندوستان میں رواج پاتے ہیں۔

اوزبک خاں تو صاف اور صریح مغلوں کی یادگار ہے۔ مغلوں سے پیشتر ہندوستانی اس لفظ سے ناواقف تھے لیکن اس کے متعلق آیندہ ذکر ہوگا۔

جہانگیر خاں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام جہانگیر بادشاہ کے عہد سے زیادہ رائج ہوتا ہے۔

خانِ جہاں اور خانِ خاناں۔ تغلقوں کے عہد سے یہ خطابات ہندوستان میں موجود ہیں۔ مگر زیادہ شہرت مغلوں کے عہد سے ملتی ہے۔ بیرم خاں اور اس کا فرزند عبدالرحیم خان خاناں کے خطاب کے مالک تھے۔ خان جہاں لودھی جہانگیر کے عہد میں ایک نہایت مشہور امیر تھا۔

فتح جنگ اور اس طرز کے دیگر خطابات مغلوں کے عہد سے قبل بالکل نامعلوم تھے۔ مغلوں کے ہاں ہر زمانے میں بلکہ ریاستوں میں اب تک ایسے خطابات موجود ہیں۔ جہانگیر ابراہیم خاں کو فتح جنگ کا خطاب[1] عنایت کرتا ہے۔

شادی بیگ۔ کمام بیگ (قوام بیگ؟) بیگ کی ترکیب کے نام مغلوں سے پیشتر اس ملک میں رائج نہیں تھے۔ یہی حالت عیسیٰ قلی کی ہے۔ ایران میں صفویوں کی آمد سے علی قلی۔ امام قلی حسین قلی اور شاہ قلی وغیرہ نام رواج پاتے ہیں اور جب ایرانی مغلوں کی ملازمت میں آئے۔ اس فیشن کے نام بھی ان کے ساتھ آئے۔

حبش خاں اور حبیب خاں حبشی اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں جب دکن پر مغلوں کے حملے شروع ہوگئے ہیں۔ مغل دکن میں حبشیوں سے جہاں وہ فوج میں اور دیگر خدمات پر متعین تھے تعلق میں آئے ہیں۔ متعدد حبشی سرداران دکن نے مغلوں کی نوکری اختیار کرلی ہے۔ مثلاً سیام خاں حبشی۔ دلاور خاں حبشی۔ سرور خاں حبشی اور سیدی سالم حبشی شاہجہاں کے عہد کے سردار ہیں۔ اسی

---

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۱۵۵ طبع سید احمد خاں۔

پادشاہ نے ایک اور سردار کو حبشی خاں خطاب دیا ہے۔

بنکٹ راو۔ منڈہ راو مرہٹہ۔ دونوں مرہٹے نام ہیں۔ حبشیوں کی طرح دکنی لڑائیوں میں مغلوں کا مرہٹوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور کئی مرہٹے ان کی ملازمت میں آجاتے ہیں۔

قاسم قایم خانی۔ پرانی شکل قیام خانی ہے۔ نہ قایم خانی۔ چنانچہ شاہجہاں کے عہد میں ایک امیر دولت خاں قیام خانی ہے۔ جس کا منصب ہزار و پانصدی ذات، ہزار سوار رہے لیکن غلط العام قایم خانی ہوگیا۔ چنانچہ راجپوتانے میں جہاں یہ لوگ آباد ہیں۔ اسی نام سے مشہور ہیں۔ قایم[1] خانیوں کا دعوے ہے کہ وہ فیروز شاہ تغلق کے

---

[1] تراب علی تراب، احوال نواب قایم خاں خان جہاں بہادر میں رقم طراز ہے کہ دریرا میں ایک چوہان راجہ موسوم بہ موٹے راو حکومت کرتا تھا۔ اس کا فرزند کرم چند شکار میں فیروز شاہ تغلق اور اس کے وزیر سید ناصر سے ملاقی ہوا۔ اور بادشاہ اور وزیر کی ترغیب سے مسلمان ہوگیا۔ بادشاہ نے اس کا نام قایم خاں رکھا۔ اور وزیر نے اسے متبنّیٰ بنالیا۔ جب فیروز شاہ بنگالے کی مہم پر گیا۔ قایم خاں کو دلی کا صوبے دار بنا گیا۔ جب واپس لوٹا۔ اس کی حسن خدمات اور خوش نظمی کے صلے میں خانجہاں خان بہادر کا خطاب عنایت کیا۔ سید ناصر کی وفات پر قایم خاں وزیر مقرر ہوا۔ جب فیروز تغلق نے جام اجل نوش کیا۔ اس کے جانشین محمد شاہ کا بدستور سابق وزیر رہا۔ اس کے بعد نصیر شاہ کا اور پھر معظم شاہ کا (خانوادہ تغلقیہ میں ان دو ناموں کے پادشاہ نہیں گزرے) مؤخر الذکر ایک مغل سے سازش کرکے قایم خاں کو دریا میں دھکا دلاکر ہلاک کرادیتا ہے۔

قایم خاں خانجہاں کے کئی فرزند تھے۔ ان میں زیادہ مشہور محمد خاں اور تاج خاں ہیں۔ جو ناگور رہنے لگے۔ انھیں بھائیوں نے جھونجھنوں اور فتح پور دو شہر واقع شیخاواٹی (راجپوتانہ) آباد کیے۔ جہاں ان کی اولاد تین سو ساٹھ سال

عہد میں راجپوت سے مسلمان ہوئے۔ لیکن ظن غالب ہے کہ وہ اس عہد سے بہت بعد حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہیں۔

تک حکومت کرتی رہی۔ معظم شاہ وزیر کے خون ناحق سے بچتا کر اور دونوں بھائیوں کی شجاعت کی داستانیں سن سن کر انھیں بلا کر ان کے آبائی عہدے پر بحال کر دیتا ہے۔ یہ عہدہ دیر تک ان کے قبضہ میں رہتا ہے۔ چنانچہ معظم شاہ کے بعد مبارک شاہ کے اور اس کے بعد علاء الدین شاہ کی بھی وزارت کرتے رہے۔ آخر دراندازوں نے سکھا بجھا کر علاء الدین کو ان کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس لیے دونوں بھائی دہلی چھوڑ کر اپنے وطن حصار میں چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ علاء الدین کے بعد بہلول شاہ مسند آرا ہوا۔ اس نے انھیں منصب قدیمی پر بلایا۔ مگر انھوں نے قبول نہیں کیا بلکہ ناگور چلے گئے۔ وہاں بمعیت فیروز خاں رانا موکل سے ان کی جنگ ہوتی ہے جس میں رانا شکست فاش کھاتا ہے۔ اس کے بعد فیروز خاں سے بھی ان کو لڑنا پڑتا ہے۔ اتنے میں تاج خاں وفات پاجاتا ہے اور اس کے غم میں محمد خاں بھی کہا دار فانی کو وداع کہتا ہے۔

یہ بیان تاریخ کی روشنی میں ناقابل قبول ٹھہرتا ہے۔ فیروز شاہ کا کوئی وزیر سید ناصر نامی نہیں تھا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ فیروز شاہ کا وزیر ایک نومسلم ہندو (تلنگی) تھا ابتدا میں تلنگانے کے راجا کا ملازم تھا۔ اس کا نام کنو تھا۔ وہ محمد بن تغلق کے عہد میں اسلام سے آیا۔ اور مسلمانی نام مقبول رکھا گیا۔ اگرچہ جاہل مطلق تھا لیکن ترقی کرتے کرتے محمد شاہ کے عہد ہی میں نائب وزیر بن گیا۔ اور قوام الملک خطاب ملا۔ جب فیروز شاہ تخت پر آیا۔ اس نے خواجۂ جہاں کو معزول کر کے قلمدان وزارت قوام الملک کے حوالے کیا اور خان جہاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا جب کبھی فیروز شاہ دہلی سے باہر جاتا اور ایسا اکثر ہوتا تھا۔ تو خواجۂ جہاں بحیثیت قائم مقام بادشاہ کام کرتا تھا۔ خان جہاں کی وفات پر اس کا فرزند اپنے باپ کے عہدے (وزارت) اور خطاب خان جہانی پر فائز ہوتا ہے۔ یہ بیان میں شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی کی سند پر لکھ رہا ہوں۔ تعجب ہے کہ قائم خانیوں نے خانجہاں (کبیر) کے بعض واقعات زندگی غصب کر کے اپنے مورث اعلیٰ کے لیے محفوظ کر لیے۔

یہ خیال کہ پرتھی راج کے عہد میں مرہٹے۔ حبشی اور قایم خانی غزنیں میں سلطان معزالدین محمد بن سام کی فوج میں شامل تھے۔ نہایت مضحک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان جزئیات میں راسا کا مصنف بھی مجبور ہے۔ وہ اپنے عہد کے حالات و واقعات کے قیاس پر اپنا افسانہ تعمیر کر رہا ہے۔ درحقیقت اس کے زمانے میں سلاطین مغل کی سرکار میں یہ سب اقوام موجود تھیں۔

(ج) فہرست از بادشاہ نامۂ عبدالحمید لاہوری (جلد اول حصہ دوم)

(۱) احمد خاں نیازی صفحہ ۲۹۶ و ۵۰۹ (۲) امیر خاں صفحہ ۱۸۳ و ۲۰۹ (۳) اعظم خاں صفحہ ۲۹/۲، ۲۳ (۴) اغظم (میرکاشغری) صفحہ ۲۴۹ (۵) اوزبک خاں صفحہ ۱۴۶/۲، ۱۳۸/۲، ۳۰۶/۲ (۶) آرایش خاں صفحہ ۵۳ (۷) بابر صفحہ ۴۲ (۸) سید بایزید صفحہ ۱۸۳ (۹) بیرم بیگ ترکمان

لیکن وہ کتو تانگی ہے۔ نہ کرم حید چوہان پیہر سوٹے راؤ۔

تراب کا بیان ہے کہ قیام خاں [illegible] مطابق سمت ۱۴۲۲ بکرمی میں اسلام لایا چنانچہ ؎

ہوئے مسلمان جو دل سے نواب قایم خاں — ملائکوں نے کہا آفریں بہت و ثنا
خرد نے طریقۂ اسلام سے کہا تاریخ — سن آٹھ سے دیک از ہجرت رسول اللہ
سمت تھا سندر [illegible] چودہ سے اور [illegible] — مطابق اس کے جو ہجرت کا میں بیان کیا

مگر شعر ذیل میں بحساب جمل یوں تاریخ دی ہے ؎

میں جستجو میں تھا تاریخ کی کہ ہاتف نے — کہا کہ "دین پہ قایم ہوا ہے قایم خاں"

اگر [illegible] میں قایم خاں مسلمان ہوا تو وہ فیروز شاہ کا زمانہ نہیں پا سکتا کیونکہ شاہ موصوف [illegible] میں فوت ہو جاتا ہے۔ اگر آخری شعر کو صحیح مانا جائے تو "دین پہ قایم ہوا ہے قایم خاں" کے اعداد بحساب ابجد [illegible] ہوتے ہیں جو شاہجہاں کا عہد ہے، البتہ قایم خاں کے عدد [illegible] ہوتے ہیں۔ لیکن اس مادہ سے تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ صرف قایم خاں کے اعداد گننا مقصود ہیں۔

صفحہ ۱۲۴، ۱۶۹ (۱۰) بہرام صفحہ ۱۰۵، ج ۲/۴۴ (۱۱) بھارت بندیلہ صفحہ ۸۲-۱۲۰
(۱۲) تاج سروانی صفحہ ۲/۳۱۴ (۱۳) عارف ولد تاتار خاں سفرچی
صفحہ ج ۲/۴۴۔ (۱۴) جہاں خاں (کاکڑ) صفحہ ۱۱۹ (۱۵) جلال ولد دلاور
خاں صفحہ ۱۸۴۔ ۲/۳۰۶ (۱۶) میر جلال الدین حسین صفحہ ۲۵۸۔
(۱۷) سید جہانگیر صفحہ ج ۲/۲، (۱۸) بہرام خاں (ولد جہانگیر قلی خاں)
صفحہ ج ۲/۳۳،
(۱۹) حسن خاں میواتی صفحہ ۵۱، ۵۷۔ (۲۰) حسن خاں (برادر
خدمت گار خاں صفحہ ۲/۳۱۷ - (۲۱) حبیب کررانی صفحہ ۲/۱۳۶ (۲۲) حبش
خاں صفحہ ۲/۲۹۹۔ ج ۲/۲۴، (۲۳) حبیب سور صفحہ ۱۱۹
(۲۴) خان جہاں صفحہ ۵۷ و ۱۲۵۔ (۲۵) خواص خاں صفحہ ۳،
۱۸۱۔ ۲/۲۹۸ (۲۶) خواجہ قاسم حصاری صفحہ ج ۲/۲۴۶ (۲۷) خواجہ قاسم
(سید اتائی) صفحہ ۱۱۸۔
(۲۸) دریا سے (روہیلہ) صفحہ ۲۰۳، ۳۲۶ (۲۹) دریا خاں
روہیلہ ۲/۲۹۶ (۳۰) دولت خاں ولد الف خاں قیام خانی صفحہ ۱۸۴
(۳۱) دولت خاں قیام خانی صفحہ ج ۲/۲۳۰، ۲/۳۰۶
(۳۲) رستم خاں ابرکی صفحہ ۱۲۵ (۳۳) رومی خاں صفحہ ۱۱۴۔
(۳۴) سیدی سالم حبشی صفحہ ۲۴۱ (۳۵) سید راجی صفحہ ۲/۳۲۳
(۳۵ الف) رستم خاں دکنی صفحہ ۲/۲۹۷۔
(۳۶) شادی خاں (شادی بیگ) صفحہ ۲/۱۳، ۲/۶۰ (۳۷) شمس الدین
ولد نظر بہادر صفحہ ۲/۳۱۹
(۳۸) عرب بہادر خاں صفحہ ۱۲۲-۱۲۸ (۳۹) عثمان (روہیلہ) صفحہ ۱۱۹

(۴۰) علی خاں (شیخ زادہ فرلی) صفحہ ۵۵ (۴۱) علی خاں (ترین) صفحہ ۱۲۴
(۴۲) سید عالم بارہ صفحہ ۱۲۱/۷۳ (۴۳) عمر خاں صفحہ ۳۱۰ (۴۳ الف) غضنفر خاں (عموی بہادر خاں روھلہ) صفحہ ۴۳۰

(۴۴) غیرت خاں صفحہ ۳۹۸ (۴۵) غالب صفحہ ۳۲/۲ (۴۶) غازی بیگ صفحہ ۳۱۹، ۳۲/۲ (۴۷ الف) غزنین خاں (جالوری) صفحہ ۱۶۷

(۴۷) فتح خاں صفحہ ۳۶۸ (۴۸) فیروز خاں صفحہ ۴۷، ۱۸۳، ۳۰/۲
(۴۸ الف) فیروز (برادر غزنین خاں) صفحہ ۳۱۹/۲

(۴۹) قاسم خاں صفحہ ۴۴، ۲۹۴/۲ (۵۰) قوام بیگ صفحہ ۵۴
(۵۱) کمال خاں صفحہ ۵۵ (۵۲) خواجہ کوچک (ولد میر ہاشم) صفحہ ۱۲۴
(۵۳) لعل خاں صفحہ ۱۸۴

(۵۴) محمود خاں صفحہ ۱۵ (۵۵) منصور صفحہ ۳۸۳/ ۳۳۳ (۵۶) محمد خاں (نیازی) صفحہ ۱۶۷. (۵۷) مصطفےٰ خاں (داماد ملا محمد لاہوری) صفحہ ۴۱۴ - ۴۱۵ (۵۸) میر خاں صفحہ ۱۲۳، ۱/۲، ۳/۲ (۵۹) حاجی منصور صفحہ ۳۲۳/۲
(۶۰) نصرت خاں صفحہ ۳۲۰ (۶۱) نور محمد عرب (عرب خاں) صفحہ ۳۹۶
(۶۲) نظام ولد غزنین خاں جالوری صفحہ ۳۱/۲ (۶۳) نیاز خاں (پسر شہباز خاں کنبوہ) صفحہ ۴۱۴ -

(۶۴) وزیر خاں صفحہ ۱۱۷ - ۱۲۲ - ۱۲۴ -

(۶۵) یعقوب خاں صفحہ ۱۶۷ - (۶۶) یوسف خاں صفحہ ۴۱۵ -

(۶۷) میر یوسف صفحہ ۳۰/۲ (۶۸) یوسف نیازی صفحہ ۳۲/۲

بادشاہ نامے کی فہرست کے پچیس تیس اسم ایسے ہیں جو راسا کی فہرست میں شامل ہیں - باقی اس سے مماثلت قریبہ رکھتے ہیں۔ ناموں میں

یہ مطابقت بغیر اشتراک زمانی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں تصانیف آپس میں معاصرت قریبہ رکھتی ہیں۔

بادشاہ نامے سے قطع نظر اگر اس عہد کی تاریخوں کا جائزہ لیا جائے تو راسا کے باقیماندہ ایسے نام جو مسلمانوں میں رائج ہیں مثلاً اعظم خاں احمد خاں پہاڑ خاں۔ تاج خاں۔ جلیل خاں۔ جوشن خاں جبین شاہ خلجی خاں۔ خلیل خاں۔ خواجہ قاسم۔ دلیل خاں۔ داؤد خاں۔ رستم خاں روشن علی۔ سبحان خاں۔ سریر خاں۔ شوکت خاں شمس الدین خاں۔ شادی ملک۔ عالم خاں۔ عمر خاں۔ اسد خاں۔ علی اسد۔ علی خاں۔ غیاث خاں۔ غازی مراد۔ غالب خاں۔ کریم خاں۔ معروف خاں۔ میر ناصر۔ میر محمد خاں۔ محبت خاں۔ میراں شاہ۔ ملتان خاں۔ ممریز خاں۔ مصطفیٰ خاں۔ مرزا مہدی۔ نور خاں۔ نصرت خاں۔ نظام شاہ نیازی خاں۔ نوروز خاں۔ وزیر خاں۔ وغیرہ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کی تاریخوں اور انشاؤں سے بآسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

راسا کا مصنف پٹھانوں کے قبائل روہیلہ۔ مہمند اور نیازی سے واقف ہے۔ مہمند کو وہ شخصی نام کی حیثیت دے رہا ہے۔ نہ قبیلے کی حیثیت بعض ناموں کے ساتھ وہ نیازی لا رہا ہے۔ مثلاً حاجی نیازی۔ غنی خاں نیازی۔ لیکن نیازی ہندوستان میں دسویں صدی بلکہ شیر شاہ سوری کے عہد سے شہرت حاصل کرتے ہیں۔

بابر۔ بیرم۔ سلیم اور جہانگیر جیسے ناموں کو دسویں صدی ہجری سے قبل تاریخ ہند میں تلاش کرنا بے سود ہے۔

سُلطانی شکستیں

راسا کے بیانات کی رو سے سُلطان شہاب الدین پرتھی راج سے بیس مرتبہ شکست کھاتا ہے۔ میں ان داستانوں کے حوالے پر یہاں قناعت کرتا ہوں۔ جن میں ان شکستوں کا ذکر آیا ہے۔

(۱) حسین کتھا۔ نویں داستان۔ شہاب الدین گرفتار ہوتا ہے۔
(۲) آکھیٹک چوک برنن۔ دسویں داستان۔ شاہ کو شکست ہوتی ہے۔
(۳) سلکھ جدھ۔ تیرھویں داستان۔ سلکھ سُلطان کو میدان جنگ میں اسیر کرلیتا ہے۔ (۴) پدماوتی سمے۔ بیسویں داستان۔ پرتھی راج کمان کے ذریعے سے شاہ کو پکڑ لیتا ہے۔ (۵) دھن کتھا۔ چوبیسویں داستان شاہ حسب معمول اسیر ہوتا ہے۔ (۶) ریوا تٹ سمیو۔ ستائیسویں داستان۔ پرتھی راج کمان سے سُلطان کو قید کرتا ہے۔ (۷) اننگ پال سمے اٹھائیسویں داستان۔ چامنڈ کے ہاتھ پر شاہ کی گرفتاری۔ (۸) مادھو بھٹ کتھا اُنیسواں سمے۔ چامنڈ رائے شاہ کو رزم گاہ میں قید کرلیتا ہے۔ (۹) گھگھر کی لڑائی ۲۹ واں سمے۔ کنہ کمان ڈال کر شاہ کو اسیر کرتا ہے۔
(۱۰) پیپا یدھ ۳۱ واں سمے۔ شہاب الدین کو شکست ملتی ہے۔ (۱۱) جیت راو جدھ۔ ۳۲ واں سمے جیت راو کے ہاتھ سے شاہ کا مقید ہونا۔
(۱۲) ہنساوتی وواہ۔ ۳۶ واں سمے۔ شاہ کو حسب معمول شکست۔
(۱۳) پہاڑ رائے۔ ۳۷ واں سمے۔ پہاڑ رائے شاہ کو گرفتار کرتا ہے
(۱۴) پججون چالُسا نام پرستاو۔ ۴۱ واں سمے۔ شاہ کو ایک اور

ہزیمت۔ (۱۵) ہانسی پور پرتھم جدھ۔ ۱۵ واں سے۔ شاہی فوج کو شکست (۱۶) دوسری ہانسی جدھ۔ باونواں سے۔ شاہی لشکر کو ایک اور شکست (۱۷) پجون پاتساہ جدھ۔ ۵۴ واں سے۔ پجون رائے شاہ کو پکڑ لیتا ہے۔ (۱۸) درگا کیدار سمیو۔ ۵۰ واں سے۔ شاہ کی گرفتاری (۱۹) کیماس جدھ۔ ۴۴ ویں داستان۔ کیماس اور چامنڈ شاہ کو قید کرتے ہیں (۲۰) دھیر پنڈیر پرستاد۔ ۶۴ ویں داستان۔ دھیر سلطان کو قید کر لیتا ہے

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان شہاب الدین نے چھ مرتبہ شکست کھائی اور چودہ مرتبہ شکست کھا کر گرفتار ہوا جس سے تمام شکستوں کی تعداد بیس ہوتی ہے۔ تاریخ میں اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ صرف ایک شکست ایک تاجدار اور اس کی سلطنت و ملک کی تباہی و بربادی کے لیے کفایت کرتی ہے۔ لیکن سیاسیات جنگ و نتائج فتح و شکست سے بے پروا پرتھی راج کا یہ داستان گو کس قدر بے خبر ہے جو شہاب الدین جیسے جلیل القدر پادشاہ کو پرتھی راج کے ہاتھ سے ۲۰ مرتبہ ہزیمت دلاتا ہے اور اکیسویں مرتبہ اسے ظفریاب کراتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ نہ شہاب الدین اور نہ پرتھی راج کی حقیقی وجاہت سے واقف ہے اور نہ عواقب شکست و فتح کا اس کو اندازہ ہے۔ وہ اپنے ہیرو کی ثنا خوانی اور اس کے سر پر شہرت دوام کا تاج رکھنے کے لیے اس کو ہندو شجاعت اور جواں مردی کے مثالیہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ جس میں اصلی واقعات سے مطلق سروکار نہیں رکھا گیا۔

پرتھی راج کا حریف شہاب الدین اسلام کے دوسرے درجے کے اولوالعزم سلاطین میں سے ہے۔ اس کی زندگی کے واقعات، اس کی

فتوحات اور شکستیں، مسلمانی تاریخ میں سال وار دکھائی گئی ہیں۔ راسا کی مبینہ شکستوں کے لیے جو اس کے نام پر دی گئی ہیں کم ازکم اس سلطان کی زندگی میں کہیں بھی گنجایش نہیں نکل سکتی۔ اس کو عمر بھر بیٹھ کر پرتھی راج سے ہزیمت پر ہزیمت کھانے کی بجائے دنیا میں اور زیادہ ضروری کام کرنے ہیں۔ محمود نے صرف پنجاب فتح کیا تھا شہاب الدین محمود یوں سے پنجاب لے کر فتوحات کا قدم آگے بڑھاتا ہے اور وسط ہند کا اکثر علاقہ فتح کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی شہرت کا مدار اس کی فتح ہند کی بنا پر ہے۔ مگر فتح ہند اس کے کارناموں کا صرف ایک رُخ ہے۔ ہندوستان سے زیادہ اس کی مصروفیتیں ایران کے واسطے رہی ہیں۔ جہاں اس کو اپنے سے بھی زیادہ طاقتور سلاطین کے ساتھ جنگ آزمائی کرنی پڑی ہے۔ پرتھی راج تو اس کی فتراک کا ایک صید زبوں ہے۔ یہ خوارزم شاہی سلاطین سلطان شاہ اور علاء الدین محمد شاہ ہیں۔ جن کے ساتھ وہ میدان داریاں کرتا رہا ہے۔ اگر اس کی توجہ ایران کے ساتھ منقسم نہ رہتی۔ تو اس کے لیے سارا ہندوستان فتح کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

لیکن میں یہ دکھانے کے لیے کہ راسا کی بیان کردہ شکستوں کے لیے سلطان کی تاریخ میں کوئی گنجایش نہیں۔ یہاں اس کے کارناموں کا بقید سنین مختصر تبصرہ کرتا ہوں۔

جب سلطان غیاث الدین (۵۵۸ھ و ۵۹۹ھ) سیف الدین محمد (۵۵۶ھ و ۵۵۸ھ) کے بعد غور کا بادشاہ بن گیا۔ ان ایام میں سلطان معزالدین جو بحالت شہزادگی شہاب الدین کہلاتا تھا۔ اپنے

چچا ملک فخرالدّین مسعود والی بامیان کے پاس تھا۔ جب غیاثُ الدّین کی تاج پوشی کی اطلاع بامیان پہنچی ملک فخرالدین نے شہابُ الدین سے طعنہ دے کر کہا "تیرے بھائی نے تو کچھ کر کے دکھا دیا۔ تو بھی کبھی کچھ کرے گا؟" شہابُ الدّین نے سر جھکا لیا۔ موقع پاکر دربار سے نکلا اور سیدھا فیروز کوہ پہنچا۔ غیاثُ الدّین نے سرجاندار بنا دیا۔ سال بھر یہاں رہا اور پھر بھائی سے مایوس ہو کر ملک شمس الدین سجستانی کے پاس سجستان چلا گیا۔ سردی کا موسم وہیں بسر کیا۔ آخر غیاثُ الدین نے آدمی بھیج کر بلوا لیا اور تگین آباد اس کے حوالے کر دیا۔ ان ایام میں قبائل غزخطائیوں سے شکست کھا کر غزنیں کی طرف بڑھ گئے تھے اور خسرو شاہ سے غزنیں چھین کر اپنے قبضے میں لے آئے تھے۔ شہابُ الدّین تگین آباد سے نکل کر ہر سال ان پر حملے کرتا رہا۔ آخر سلطان غیاثُ الدّین نے غزوں کو شکست فاحش دی اور ۵۶۹ھ میں غزنیں فتح کر کے معزالدین کے حوالے کر دی۔

اس واقعے سے دوسرے سال یعنی ۵۷۰ھ میں معزالدین نے غزنیں کا بقیہ علاقہ تسخیر کر لیا اور گردیز پر متصرف ہوا۔ تیسرے سال (۵۷۱ھ) ملتان پر فوج کشی کی اور ملاحدہ کے قبضے سے اسے نکال لیا۔ ۵۷۲ھ میں جماعت سنقران پر فوج کشی کی اور اس جماعت کو قتل کیا۔ اس واقعے کے دوسرے سال سلطان نے براہ ملتان راجہ بھیم دیو والی گجرات پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ یہ واقعہ ۵۷۴ھ میں پیش آیا۔ ۵۷۵ھ میں سلطان نے فرشور (پشاور)

پر چڑھائی کی اور مسخر کرلیا۔ اس کے بعد متواتر دو سال تک (۵۷۶ھ
۵۷۷ھ) لاہور پر چڑھائی ہوتی رہی۔ چونکہ محمودی کمزور ہو چکے تھے
خسرو ملک نے ایک ہاتھی اور اپنا فرزند بھیج کر صلح کرلی۔ یہ واقعہ ۵۷۷ھ
میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کے دوسرے سال ۵۷۸ھ میں سلطان نے
دیول پر لشکر کشی کی اور سمندر تک کے علاقے پر قابض ہوگیا۔ ۵۸۱ھ
میں لاہور پر پھر حملہ آور ہوا اور اس کے علاقے کو تاراج کیا۔
واپسی کے وقت حکم دیا کہ قلعۂ سیالکوٹ کی مرمت کی جائے حسین
خرمیل کی تقرری وہاں عمل میں آئی۔ سلطان کی مراجعت غزنی کے
بعد خسرو ملک مع کھوکھروں کی جماعت کے سیالکوٹ کی تسخیر کی غرض
سے آیا۔ محاصرہ دیر تک رہا۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ ناکام واپس
لوٹا۔ ۵۸۲ھ میں سلطان معزالدین پھر لاہور پہنچا۔ خسرو ملک تاب
مقابلہ نہ لا سکا۔ سلطان سے ملاقات کے لیے باہر آیا اور قید کرلیا گیا۔
لاہور پر سلطان کا قبضہ ہوگیا۔

۵۸۳ھ سے ۵۸۵ھ تک سلطان معزالدین کیا کرتا رہا؟ ہمیں
علم نہیں لیکن گمان غالب ہے کہ ان ایام میں اس کی توجہ ہندوستان
کے بجائے ایران اور خوارزم شاہیوں کی طرف مبذول رہی ہے۔ ان
ایام میں سلطان شاہ اس قدر طاقت ور تھا کہ غیاث الدین اور
معزالدین کو اس کے خلاف اپنی پوری طاقت صرف کرنی پڑی ہے
شمس الدین بامیانی اور تاج الدین والی سیستان ان کے شریک
ہوتے ہیں۔ مرغاب کے قریب دونوں فوجیں چھ مہینے تک ایک
دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ آخر ۵۸۶ھ میں جنگ ہوئی اور

سلطان شاہ کو شکست فاحش ملی اور وہ چالیس آدمیوں کے ساتھ بحالت تباہ مرو پہنچا۔ یہ بھی کہا جاتا ہو کہ غیاث الدین نے اسی سال معزالدین کو سلطان کا خطاب دیا۔

ان واقعات کے بعد سلطان معزالدین بتہندہ پرچڑھائی کرتا ہو اور اسے فتح کرلیتا ہو۔ قاضی ضیاء الدین تولکی کو قلعہ سپرد کردیا جاتا ہو۔ غزنیں اور ہندوستان کی فوجوں سے بارہ سو تولکی اس کے خیل میں منتقل کردیے جاتے ہیں اور یہ شرط کرلی جاتی ہو کہ آٹھ ماہ تک یعنی جب تک کہ سلطان غزنیں سے واپس نہ آجائے قلعہ کو بحالت حملۂ غنیم کے سپرد نہ کیا جائے۔ مگر واقعات خلاف معمول پلٹا کھاتے ہیں۔ سلطان معزالدین کا غزنیں جاکر واپس آنا کجا۔ رائے پتھورا اپنی فوجوں کے ساتھ بہت قریب آچکا تھا۔ ہندوستان کے راجہ مہاراجہ اس کے ساتھ تھے۔ سلطان اس کے مقابلے کے لیے تراین پہنچا۔ جب جنگ کی صفیں قایم ہوگئیں۔ سلطان نے گوبند رائے کے ہاتھی پر حملہ کیا۔ شاہ کا نیزہ اچٹتا سا گوبند رائے کے منہ پر لگا جس سے اس کے دو دانت جھڑگئے۔ گوبند رائے نے ایک سیل مارا جو شاہ کے بازو پر مونڈھے کے قریب لگا زخم گہرا آیا۔ قریب تھا کہ بیہوش ہوجائے۔ ایک خلجی بچہ شاہ کا ردیف بن گیا اور میدان جنگ سے لے نکلا۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی اور لاہور آکر ٹھیرے۔ یہ وہ شکست ہو جس کی ہندوؤں نے شاید سود درسود لگاکر ایک روایت کے حساب سے سات اور راسا کی روایت کے مطابق پوری بیس شکستیں بنالی ہیں۔ قصہ مختصر رائے

تھورا جنگ سے فارغ ہوکر قلعہ بترہندہ پر آیا۔ اور اسے محصور کرلیا قاضی ضیاءُ الدین کچھ دن اوپر تیرہ مہینے مقابلے پر ڈٹا رہا اور لڑتا رہا۔ جب شاہ کی طرف سے بالکل مایوس ہوگیا۔ قلعہ رائے پتھورا کے حوالے کرکے غزنیں کی طرف چل دیا۔

دوسرے سال معزالدین نے اپنی فوجیں ہندوستان پر حملے کی نیت سے فراہم کیں۔ صاحب طبقاتِ ناصری کا بیان ہے کہ مجھے تولک کے ایک ثقہ شخص کی زبانی جس کا نام معینُ الدین اوشی تھا معلوم ہُوا کہ اس سال شاہ کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار زرہ پوش سوار تک پہنچ گئی تھی۔ پرتھی راج بترہندہ پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد تراین کے قریب خیمہ زن تھا۔ وہیں دوسری جنگ ہوئی جس میں رائے پتھورا کو شکست ہوئی۔ پرتھی راج اس وقت ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ بھاگنے کے ارادے سے ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہوا اور میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ مگر سرستی کے قریب گرفتار ہوا اور قتل کردیا گیا۔ گوبندرائے عین میدان جنگ میں مارا جاچکا تھا۔ سلطان نے اس کی لاش کو اس کے دو ٹوٹے دانتوں کی بنا پر پہچان لیا۔ یہ فتح ۵۸۸ھ میں حاصل ہُوئی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سُلطان معزالدین کی زندگی میں ہندوستان کا باب ۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء میں کھلتا ہے۔ جب وہ ملاحدہ سے ملتان لیتا ہے۔ ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء میں بھیم دیو سے شکست۔ ۵۷۵ھ/۱۱۷۹ء میں پشاور پر قبضہ۔ ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں دیول پر تصرف۔ ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں لاہور کی فتح۔ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں سُلطان شاہ کی شکست۔ ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں تراین

پرفتح ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ سلطان معزالدین کے اس کارنامہ حیات میں نہ ان مفروضہ سات شکستوں کو نہ ان بیس شکستوں کو کہیں جگہ دی جاسکتی۔ نہ یہ امر قرین قیاس ہے کہ کوئی سیاست داں اور جنگ آزما بحالت قایمی ہوش و حواس چودہ بار اپنے حریف کو گرفتار کرکرکے اور زرفدیہ لے لےکر آزاد کرسکتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ مصنف راسا کے ماؤف دماغ میں بالکل ممکن ہوگیا۔ وہ پرتھی راج درکنار اس کے دربار کے ادنئے ادنئے سامنت کے ہاتھ سے سلطان کو گرفتار کراتا ہے۔ کبھی سلکھ اس کو پکڑ لاتا ہے۔ کبھی چامنڈ راے۔ کبھی کنہ۔ جیت راؤ بھی یہ عزت حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد پہاڑ راے کی باری آتی ہے۔ یہی خوش قسمتی کیماس کے حصے میں آئی ہے۔ اسی سلسلے میں پجّون راے جی کا نام بھی قابل ذکر ہے اور دھیر پنڈیر تو ڈنکے کی چوٹ خود سلطان سے رو در رو کہہ دیتا ہے کہ میں تمھیں میدان جنگ سے باندھ کر لے جاؤں گا۔ ہوشیار رہنا۔ چنانچہ جو وہ کہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سلطان معزالدین نہیں ہوا بلکہ ربر کا چوہا کہ جس بلی نے جس وقت چاہا منہ میں دبایا اور لے کر چل دی۔

ادھر خود سلطان کو اس قدر رسوا اور بے باک بلکہ سڑی اور سودائی ظاہر کیا گیا ہے کہ متواتر شکستوں اور گرفتاریوں کے باوجود عقل دور اندیشی سے کام لینا نہیں جانتا۔ بات بات پر غزنیں سے اٹھ دوڑتا ہے اور ہندوستان آکر نئی ذلتوں اور رسوائیوں سے اسے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے جاسوسوں سے پرتھی راج

کا دربار بھرا پڑا ہی۔ دم دم کی خبریں اس تک پہنچائی جاتی ہیں۔ ہر خبر اس کے لیے محرک جنگ ہی۔ مثلاً وہ سُن پاتا ہی کہ پرتھی راج کھٹو بن میں شکار کھیلنے جاتا ہی۔ بے تابانہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہی اور آکر کھٹو بن کو اپنی فوجوں سے گھیر لیتا ہی۔ جنگ ہوتی ہی اور خود گرفتار ہو جاتا ہی۔ اسی طرح وہ سُنتا ہی کہ اننگ پال نے پرتھی راج کو دلی کا تخت دے کر بن باس لے لیا ہی۔ سلطان اس موقع کو یورش کے لیے غنیمت سمجھتا ہی ایک اور مرتبہ شاہ کو اطلاع دی جاتی ہی کہ پرتھی راج ایک دفینہ نکالنے کی غرض سے کھٹو بن گیا ہی۔ سلطان فوراً لشکر لے کر آ پہنچتا ہی۔ ناگور کے قریب ایک خونریز جنگ ہوتی ہی۔ کسی اور موقع پر اس سے کہا جاتا ہی کہ پرتھی راج شکار کے لیے کہیں جا رہا ہی۔ شاہ معاً پانچ لاکھ سپاہ لے کر گھگھر پر آگیا۔ جہاں بڑا کشت و خون ہوا۔ ایک مرتبہ پرتھی راج جے چند پر حملہ کرنا چاہتا ہی۔ مگر سلطان اس کا سدِ راہ ہو کر طالب جنگ ہوتا ہی۔ ایک روز شاہ اپنے وزیر سے دریافت کرتا ہی کہ پرتھی راج کی کوئی تازہ خبر بھی آئی۔ وہ عرض کرتا ہی کہ حالت بدستور ہی۔ کوئی نئی بات قابلِ ذکر نہیں۔ اس پر شاہ کہتا ہی۔ بہت دن ہوئے اب تو اس پر چڑھائی ہونی چاہیے۔ ان الفاظ کے ساتھ فوج کشی کا حکم دیا جاتا ہی۔ یہ اور اس قسم کی اور لشکر کشی اکثر اوقات شاہ کی گرفتاری پر منتج ہوتی ہی۔ اس صورت میں وزیر شاہی تتار خاں ہمزنیں سے زرِ فدیہ کا انتظام کر کے اپنے آقا کو چھڑوا منگواتا ہی۔ فدیہ کے لیے پرتھی راج انوکھی فرمائشیں کرتا ہی۔ مثلاً ہچون

پاتساہ جدھ میں شاہ کے فدیے میں پندرہ ہزار باز مانگے گئے تھے۔ دھیر
پنڈیر پرستاو میں شاہ کو ۴۰ ہاتھی اور پانسو گھوڑے بھیجنے پڑے۔
کیماس جدھ میں بارہ ہاتھی اور ایک ہزار باز۔ گکھر کی لڑائی میں
سات ہاتھی اور پچاس گھوڑے۔ اننگ پال سمے میں سو باز اور
دو لاکھ روپے دینے پڑے۔ اسی طرح ریواتٹ سمیو میں نو ہزار گھوڑے
اور بہت سے موتی اور دھن کتھا میں مشہور ہاتھی "دسنگار ہار"
کے علاوہ تین ہزار گھوڑے پرتھی راج کی نذر کیے گئے۔ جیس کتھا میں
فدیہ نہیں لیا جاتا بلکہ تین بار سلام کروایا جاتا ہے۔ اور یہ وعدہ لیا
جاتا ہے کہ آیندہ وہ ہندوؤں کے خلاف تلوار نہیں اٹھائے گا۔
ایک اور موقع پر جب وہ رہا کیا جا رہا ہے اس کی آنکھ شرم سے
اونچی نہیں اٹھتی۔ رہائی کا حکم سن کر تین مرتبہ کورنش بجا لاتا ہے۔
اور پرتھی راج اس سے کہتا ہے۔ شہاب الدین! تم ایک والی ملک
ہو۔ مگر ڈھیٹ اور بے شرم ہو۔ تم بار بار یہاں سے رہا کیے جاتے
ہو۔ مگر بار بار چڑھائی کرکے آتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ الغرض وہ
ہر قسم کی توہین اور ذلت برداشت کرتا ہے۔ مگر اپنی عادت سے باز
نہیں آتا۔ نہ اسے اپنے وعدوں کا پاس ہے اور نہ اپنی ذلت اور
ہتک کا خیال ہے۔

لیکن حقیقی سلطان معزالدین محمد اس ہندو رزمیہ کے شری
اور خبطی شہاب الدین سے بالکل مختلف ہے۔ وہ غیرت و حمیت کا
پتلا ہے اپنے چچا کے ایک خفیف سے طعنے پر برا مان کر اس کے
دربار سے چلا جاتا ہے اور اپنے بڑے بھائی کے پاس آجاتا ہے جب

دیکھتا ہے کہ یہاں بھی اس کی قدر نہیں کی جاتی وہ اس کے دربار سے بھی چل دیتا ہے۔ پرتھی راج سے وہ ایک شکست کھاتا ہے۔ جب تک دوسرے سال آکر اس شکست کا ازالہ کرکے اپنی کتاب سیرت سے رسوائی کا یہ داغ دھو نہیں ڈالتا اس کو چین نہیں آتا۔

خوارزم سے واپسی کے وقت دریائے جیحوں کے کنارے جب خطائیوں اور ترکستانیوں کی ٹڈی دل افواج اسے گھیر لیتی ہیں اور اس کا مشہور سپہ سالار حسین خرمیل رات کی تاریکی میں اپنی پانچ ہزار فوج سمیت روپوش ہوجاتا ہے۔ سلطان معزالدین کے عزم آہنیں میں بال برابر فرق نہیں آتا۔ دوسرے دن وہ بڑی جرأت کے ساتھ غنیم کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کی ساری فوج کاٹ دی جاتی ہے۔ شاہی چھتری پر غنیم نے اس قدر تیر برسائے تھے کہ دور سے اس پر سیہ کا گمان گزرتا تھا۔ تاہم اس کے پائے ثبات میں تزلزل نہیں آیا تھا۔

ایک فاتح کی حیثیت سے بھی اس کا درجہ بلند ہے۔ طبقات ناصری میں قاضی منہاج سراج نے اس کے نام پر حسب ذیل فتوحات دی ہیں:

گردیز۔ ملتان واچہ۔ برشور (پشاور) سیالکوٹ۔ لوہور (لاہور) بترہندہ۔ ترائن۔ اجمیر۔ ہانسی۔ سرستی۔ کہرام۔ میرٹھ۔ کول۔ دہلی تھنکیر۔ بدایوں۔ گوالیر۔ بھیرہ۔ بنارس۔ قنوج۔ کالنجر۔ اودھ۔ مالوا اودوند۔ بہار۔ لکھنوتی۔ مروالرود۔ نیشاپور۔ طوس۔ مرو۔ باورد نسا۔ شارستانہ۔ سبزوار۔ جناباد۔ خوارزم۔ اندخود۔

میں بخوف طوالت اس آسمان اور ریسمان کے فرق کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دکھائے بغیر آگے بڑھتا ہوں۔

سلطانی علاقہ و محکوم اقوام

راسا شاہ کو ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک ظاہر کرتا ہے جس میں بے شمار جنگ جو اقوام آباد ہیں۔ وہ اس کی ایک چٹھی کے آنے پر اپنے اپنے دستے لے کر اس کے علم کے نیچے آکر جمع ہوجاتی ہیں۔ اس کی آمدنی کے ذرائع غیر محدود ہیں۔ وہ شکستوں پر شکستیں کھاتا ہے مگر اس کے خزانے اور فوج میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ میں یہاں ان بعض موقعوں کا ذکر کرتا ہوں جن میں اس کی افواج کی تعداد مذکور ہے۔ مثلاً مادھو بھاٹ کتھا میں وہ دو لاکھ فوج کے ساتھ پرتھی راج سے جنگ کرتا ہے۔ گھگھر کی جنگ میں اس کے لشکر کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔ کیماس جدھ میں اس کے ساتھ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی تھے۔ پجّون پاتساہ جدھ میں تین لاکھ سپاہ لے کر آیا تھا۔ ریواتٹ سمیو میں اٹھارہ لاکھ فوج اور آٹھ ہزار ہاتھی لے کر آتا ہے۔ چونکہ بائیس مرتبہ پرتھی راج سے شکست کھاتا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان حملوں اور جنگوں میں اس کا کس قدر روپیہ صرف ہوا ہوگا اور کس قدر انسانوں کی قربانی اسے دینی پڑی ہوگی۔

کوی نے اس تمام علاقے کی جو سلطان کے زیر نگیں ہے کوئی تفصیل تو دی نہیں ہے جس سے ہم اس کے طول و عرض کا اندازہ کر سکیں۔ لیکن ۲۹ویں داستان میں اتفاقیہ اگر تمام مقبوضات کا نہیں تو بعض حصّوں کا ضرور ذکر آگیا ہے۔ موقع یہ ہے کہ گکھڑ کی

جنگ میں جب کنہ جس کی آنکھ پر ہمیشہ پٹی بندھی رہتی ہے۔ شہاب الدین کو گرفتار کر کے لے آتا ہے اور اجمیر میں قید رکھتا ہے۔ اس وقت پرتھی راج کے سامنت دربار میں مشورہ دیتے ہیں کہ اس مرتبہ شاہ کو قتل کر دینا چاہیے۔ کیونکہ وہ بار بار یورش کرکے آتا ہے اور سرکشی سے باز نہیں آتا۔ اس پر کنہ کہتا ہے کہ کم از کم ایک موقع اسے اور دینا چاہیے اگر اب بھی شرارت سے باز نہیں آیا تو میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں خود اپنے ہاتھ سے شاہ کا سر کاٹ ڈالوں گا۔ اس پر سامنت خاموش ہو جاتے ہیں اور یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ قندہار مع تمام مغربی علاقے کے اور کشمیر اور کیلاس مع تمام پہاڑی علاقے کے شاہ سے ضبط کر لیا جائے اور صرف غزنین کا علاقہ اس کے پاس رہنے دیا جائے۔ کنہ نے پھر عذر داری کی اور کہا کہ اس مرتبہ تو اسے معافی دینی چاہیے۔ اور اگر ایسے ہی آپ لوگ مصر ہیں تو پنجاب اس سے لے لیا جائے۔ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور کنہ شاہ کو لینے کے لیے اجمیر چلا گیا۔ شہاب الدین اپنی جاں بخشی کی خبر سن کر بہت خوش ہوا۔ کنہ کو اس نے ایک قیمتی جواہر ہدیے میں دیا۔ اب کنہ شاہ کو لے کر دہلی آیا۔ یہاں پہنچ کر شاہ نے اپنی شمشیر خاص اور دو گھوڑے پرتھی راج کے نذر کیے۔ اور قرآن بیچ میں لے کر قسم کھائی کہ میں آیندہ ہندوستان کی طرف منہ بھی نہ کروں گا بلکہ اگر میں اٹک سے بھی پار اُتر دوں تو مجھے مسلمان نہ کہنا

پینگی دھر سیم | بیچ پوران قرآن اچانکوں تم ابے | تبے تم کڈھیو پران

اُترول اٹک تو میں اورا مُسلمان نا ہی دھروں اا ح ۶ ۴ صٓ ۹۵۵

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ مصنف کے نزدیک شہاب الدّین کی سلطنت ایران کے علاوہ موجودہ افغانستان ۔ پنجاب ۔ کشمیر اور کیلاس یعنی ہمالیہ کے علاقے پر شامل تھی ۔ مگر تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہی کہ سلطان کے پاس ان ایّام میں صرف غزنیں اور پنجاب کا علاقہ تھا ۔ نہ کشمیر اس کے قبضے میں تھا اور نہ اس وقت تک کشمیر پر مُسلمانوں کا قبضہ تھا بلکہ وہاں ہندو راج قایم تھا ۔ مگر مصنّف نے کشمیر کو جو سُلطانی قبضے میں دکھایا اس کی وجہ صرف یہ ہی کہ مصنّف کے اپنے عہد میں کشمیر پر مُسلمان قابض تھے ۔ اس لیے قدرتاً اس کو گمان ہوا کہ پرتھی راج کے عہد میں بھی اس پر مُسلمانوں کی حکومت ہوگی ۔

شاعر کا یہ قول کہ گھکھر کی جنگ کے بعد پنجاب سُلطان سے چھین لی گئی سنجیدہ تاریخ کی رو سے بالکل بے بنیاد ہی ۔ کیونکہ محمود کے عہد سے پنجاب پر مُسلمانی قبضہ مسلم ہی ۔ ۵۸۲ھ میں سُلطان معزالدین خسرو ملک غزنوی کو قید کرکے لاہور پر متصرّف ہوتا ہی ۔ اور مدّۃ العمر پنجاب پر قابض رہتا ہی ۔

کیلاس ہمالیہ پہاڑ میں ایک فرضی علاقہ کا نام ہی ۔ ہندو اساطیری روایات کی رو سے وہ ہمالیہ پہاڑ کی ایک بلند چوٹی کا نام ہی جو کوبیرا کا مسکن ہی اور شیو کی سیرگاہ ہی ۔ بہر حال کیلاس دیس جو دیوتاؤں کا مسکن ہی ۔ سُلطان معزالدین کی قلمرو میں شامل نہیں تھا ۔

اب تک میں نے شہاب الدّین کے جزوی علاقے کا ذکر کیا ہی ۔ اگر مصنّف راسا کے ان متفرق اشارات کو یکجا فراہم کیا جائے جو کتاب

کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں تو ان سے پایا جائے گا کہ شاہ کی حکومت نہ صرف ایشیا اور یورپ بلکہ افریقہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ ایسی اقوام پر حکومت کرتا معلوم ہوتا ہے جو ان تین برّاعظموں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

بڑی لڑائی چھیاسٹھویں داستان میں شہاب الدین سات ہزار فرمان لکھ کر دیس دیس بھیجتا ہے اور فوجیں طلب کرتا ہے۔ ان میں سے بعض کے یہ نام ہیں:۔ کدلواس ۔کیلاس دیس ۔روہ ۔ قندہار ۔ گکھڑ ۔ گردان ۔خورسان (خراسان=ایران) ملتان بھٹنیر بھکروان وغیرہ (چھند ۱۴۱ صفحہ ۲۱۲۷/۱۶)

گھگھّر کی لڑائی ۲۹ ویں داستان میں شاہ کے زیر علَم یہ اقوام ہیں:۔ دو لاکھ گرز بردار ۔گکھڑ ۔خورسانی (خراسانی) بلخی ۔جلیانی ۔لوہانی جاشی ۔ اوزبک ۔ہمیر ۔کلیانی ۔ رومی ۔سریانی ۔عراقی۔

ہانسی پور پرتھم جدھ ۵۱ ویں داستان میں شاہی سپاہ میں یہ اقوام شامل ہیں:۔ کھندھاری ۔حبشی ۔ رومی خلجی اچی ۔ قریش بنجاری سید ۔سیلانی ۔ شیخ ۔بھٹی ۔ میدانی ۔چوگتا (چغتا) پیرزادہ ۔ لوہانی ترکام ۔ بلوچ وغیرہ۔

سلکھ جدھ تیرھویں داستان میں لشکر شاہی میں یہ قومیں بتعداد ذیل حاضر تھیں:۔ کشمیری ۳۷ ہزار ۔حبشی ۵۳ ہزار ۔ رومی ۳۵ ہزار فرنگی ۳۷ ہزار ۔پٹھان ۱۷ ہزار ۔پاسوان (پاسبان) ۱۵ ہزار ۔ شاگرد پیشہ ۲۵ ہزار۔

پدماوتی سمے بسویں داستان میں یہ اقوام مذکور ہیں:۔خراسانی

ملتانی۔ کھنگھار۔ بلخی۔ روہنگی۔ ہلبنی۔ سمانی (سامانی) بلوچ۔ منجاری۔ ہزاری۔
ان اسما میں بعض نے سہو کتابت یا دیگر اسباب کی بنا پر ممکن ہے کہ مصنوعی ہستی اختیار کر لی ہو۔ مثلاً کلیانی۔ میدانی۔ ہمیر۔ کسقند سربانی۔ گردان۔ کویلی کور۔ ہنجاری۔ الچی۔ روہنگی۔ ہلبنی۔
ہمیر اگرچہ 'امیر' کی بگڑی شکل ہے۔ مگر مسلمانوں میں کسی قوم کا نام نہیں۔ کھنگھار تو ہندوؤں کی ایک نیچ ذات کا نام ہے۔ اس کا مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ الچی میرے خیال میں کسی قوم کا نام نہیں۔ بلکہ خلچی (خلجی) کے تابع مہمل کے طور پر لایا گیا ہے۔ اسی طرح فرنگی کا تابع روہنگی اور تابع دوم ہلبنی معلوم ہوتا ہے۔ توابعات کا کثرت کے ساتھ استعمال چند کوی کی ایک مقبولہ خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً گکھڑ کے واسطے بکھڑ اور پیدل کے واسطے ہیدل آتا ہے۔
رہے باقی نام بلوچ۔ گکھڑ۔ ملتان۔ بھٹنیر۔ بھکروان۔ بھٹی۔ ہزاری قریش۔ بخاری۔ سید۔ پیرزادہ۔ شیخ۔ پٹھان۔ شاگرد پیشہ۔ پاسوان (پاسبان) روہ۔ قندھار۔ جابانی (جلوانی) لوہانی۔ بلخ۔ بلخی۔ خورسان (خراسان) مکران۔ عراق۔ کدلواس۔ اوزبک۔ کھونکار۔ چوگتا۔ ترکام فرنگی اور حبشی وغیرہ۔ ان میں سے بعض ایسے ناموں کی نسبت جو راسا کی تصنیف کے لیے ایک خاص زمانہ متعین کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ میں یہاں چند الفاظ علیحدہ علیحدہ عنوان کے ذیل میں عرض کرتا ہوں

گکھڑ

راسا میں گکھڑوں کا کثرت کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ سلکھ جلد ۵ ۱۳ ادبیا

داستان میں ایک خان گکھڑ کا نام ملتا ہے:- ۵

خان جلال خان لال ا خان خلجی خان گکھڑ ۱۱ چھند ۱۱ ص ۵۲۳/۵

چوبیسویں داستان دھن کتھا میں شہاب الدین کی فوج کے دو ہزار گکھڑ لڑائی میں مارے جاتے ہیں۔ اٹھائیسویں داستان انگ پال سمے میں گکھڑ بھی پال مالوے کے راجا کے ساتھ مل کر پرتھی راج کے باپ سومیشور سے جنگ کرتے ہیں۔ ۴۲ دیں داستان کیماس جدھ میں شہاب الدین کے ایک سردار گکھڑ خاں کا نام آتا ہے۔ دھیر پنڈیر چونسٹھویں داستان میں بہ تعمیل فرمان شاہی ساٹھ ہزار گکھڑ بسر کردگی آرلیق خاں کانگڑے پہنچ کر دھیر کو گرفتار کر کے غزنین لے جاتے ہیں۔ بڑی لڑائی چھیاسٹھویں داستان میں جب پنڈیر نبسی میدان جنگ میں ہمیر پر نرغہ کرتے ہیں اس کی حفاظت کے لیے تین ہزار گکھڑ شہاب الدین کے حکم سے مقرر ہوتے ہیں۔ ان مقامات کے علاوہ اور موقعے بھی ہیں جن میں گکھڑوں کا ذکر بہ کثرت ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ شہاب الدین کے وفادار اور اطاعت شعار تابعین سے ہیں اور اس کی جنگوں میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ راسا کے بیانات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ مگر سلطان معزالدین کی تاریخ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گکھڑ سیاسی اعتبار سے بالکل نامعلوم کمیت ہیں۔ نہ وہ اس سے کبھی تعلق میں آئے اور نہ اس عہد کی نہ اس عہد سے بعد کی تاریخوں میں ان کا تذکرہ آتا۔ بلکہ یہ کھوکھر ہیں جو سلطان موصوف کے عہد میں پنجاب میں نہایت طاقت ور تھے۔ اور سلطان کی آخری مہم انہی کھوکھروں کے خلاف تھی۔ وہ ہر زمانے میں

فتنہ و شورش برپا کرتے رہے ہیں۔ اور دیگر سلاطین نے بھی ان کی سرکوبی کا اقدام کیا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کھوکھر کس عہد میں اسلام لائے لیکن اس قدر صاف پایا جاتا ہے کہ نویں صدی سے قبل وہ دائرۂ اسلام میں آچکے تھے۔ اسی صدی میں ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب میں وہ اپنی حکومت کا ڈول ڈال رہے ہیں۔ اور لاہور پر قبضے کی بار بار کوشش میں مصروف ہیں۔ کھوکھروں میں سب سے مقدم شیخا کھوکھر ہے۔ تاریخ مبارک شاہی میں سب سے پہلے محمد شاہ تغلق بن فیروز شاہ ۷۹۲ھ ۱۳۸۹ء کے عہد میں اس کا مذکور آتا ہے۔ جب وہ باغی ہو کر حصار لاہور پر قابض ہو گیا ہے۔ شیخا ناصر الدین محمود بن محمد شاہ ۷۹۵-۸۱۵ھ ۱۳۹۲-۱۴۱۲ء کے عہد میں سارنگ خاں حاکم دیپالپور سے شکست کھا کر مع اہل و عیال کوہستان جموں میں پناہ لیتا ہے۔ جب امیر تیمور ہند سے ۸۰۱ھ پہنچتا ہے۔ شیخا اس کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ تیمور اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہے۔ مگر شیخا موقع پا کر لاہور پر قابض ہو جاتا ہے اور تیمور کے حکم سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ شیخا سے زیادہ طاقتور اس کا فرزند جسرت ہے جو ۸۲۳ھ میں سلطان علی بادشاہ کشمیر کو جب وہ ٹھٹھ کے سفر سے واپس کشمیر جا رہا تھا۔ گرفتار کر کے اس کا مال و اسباب لوٹ لیتا ہے۔ اس فتح پر وہ دہلی کی فتح کے خواب دیکھنے لگتا ہے اور پنجاب میں تو اس نے واقعی طوفان مچا دیا ہے۔ راے فیروز کو شکست دیتا ہے۔ جالندھر پر زبردستی متصرف ہو جاتا ہے اور دریاے ستلج تک کے تمام علاقے کو تاراج کر دیتا ہے۔ بالآخر اس کی فوجوں نے سرہند کو محصور کر لیا۔ جب سلطان مبارک شاہ

۸۳۴ھ/۱۴۳۲ء اس کی سرکوبی کو پنجاب آیا اس نے مقابلے سے گریز کرکے اپنے کوہستانی مامن تیکھر میں پناہ لی۔ بادشاہ کی واپسی کے بعد لاہور پر قبضے کے لیے اس نے متواتر کوششیں کیں۔ اور ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھا۔ جب سلطانی فوجوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ اپنے تمام قبائل کو لے کر پہاڑوں میں گھس گیا۔ راو بھیم والی جموں سے اس کی دو مرتبہ جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ میں فریقین برابر رہے۔ دوسری میں رائے بھیم مارا گیا۔ اس فتح سے اس کی مردہ امیدوں میں پھر جان پڑجاتی ہے۔ اور تقدیر آزمائی کے لیے ایک مرتبہ اور کمربستہ ہوکر اپنے پہاڑی مامن سے نکلتا ہے۔ لاہور اور دیپالپور کے علاقوں میں تاخت و تاراج شروع کردیتا ہے ۸۳۱ھ/۱۴۲۷ء میں وہ کلانور کو گھیر لیتا ہے۔ ملک الشرق ملک سکندر تحفہ کو شکست دیتا ہے مگر کانگڑے میں رائے غالب کلانوری اور ملک تحفہ کی فوجوں سے ہزیمت پاتا ہے۔ ۸۳۵ھ/۱۴۳۱ء میں جالندھر کے قریب عین معرکے میں ملک سکندر تحفہ کو گرفتار کرلیتا ہے۔ اب پھر وہ لاہور پر قبضے کے لیے ہاتھ پانو مارتا ہے مگر بدستور ناکامی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ جب بادشاہ اقطاع لاہور و جالندھر پر ملک کالا لودھی مقرر کرتا ہے جسرت عہد و د بجواڑہ میں ملک موصوف کو شکست فاش دیتا ہے۔ محمد شاہ بن فرید ۸۴۶-۸۳۷ھ/۱۴۴۳-۱۴۳۳ء بھی ایک مہم جسرت کے خلاف بھیجتا ہے۔ شاہی فوج اس کا علاقہ تاراج کرکے واپس آجاتی ہے۔ مگر عنقریب بعد بادشاہ سے اس کی صلح ہوجاتی ہے اور لودھیوں کی مہم میں وہ شاہی افواج کا شریک کار رہتا ہے۔ اس کے بعد جسرت کا ذکر تاریخ میں نہیں آتا مگر یہ امر یقینی ہے

کہ کھوکھر اس کے بعد بھی دیر تک مقامی اہمیت کے مالک رہے۔
گکھڑوں کا سیاسی عروج اور تاریخ میں ان کی شہرت مغلوں کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ جب ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ اپنی پہلی مہم ہندوستان میں جنجوہوں کی حمایت میں دیپالپور کے گکھڑ سردار ہاتھی خاں کو شکست دیتا ہے۔ لیکن یہ معاندت بہت جلد بعد دوستی میں بدل جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ گکھڑوں کا ایک دستہ دوسری مہم ہند میں بابر کا شریک کار ہے۔ جب ہمایوں شیرشاہ سے ہزیمت پاکر فرار ہوتا ہے۔ گکھڑ اس کے حامی رہتے ہیں۔ شیرشاہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے قلعۂ رہتاس تعمیر کرتا ہے اور ان کی بربادی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ ہمایوں کی واپسی کے بعد گکھڑوں کو ان کی وفاداری کا صلہ ملتا ہے۔ اور مغلوں کی حمایت میں وہ بہت ترقی کرتے ہیں۔ بیسیوں گکھڑ سلطنت کے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ محمد شاہ کے عہد میں سلطان مقرب خاں اٹک اور چناب کے درمیانی علاقے پر اپنی حکومت قایم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی کوشش دیرپا ثابت نہ ہوئی۔
کوی چند کا اپنی تالیف میں گکھڑوں کو سلطان شہاب الدین کی ملازمت میں دکھانا حقیقت میں ایک تاریخی غلطی ہے لیکن اس سہو کا وہ ذمہ دار نہیں ہے۔ خود مغلیہ عہد کے مورخین میں سے بعض کو یہ مغالطہ پیش آیا ہے کہ وہ کھوکھروں کو گکھڑ سمجھ بیٹھے۔ چنانچہ مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ اسی غلطی کا شکار ہے۔ فرشتہ ہر جگہ کھوکھر کو گکھڑ کی شکل میں لکھتا ہے۔ اسی طرح کھوکھروں

کے تمام کارنامے گکھڑوں کی طرف منتقل ہو گئے حتیٰ کہ فرشتہ نے سلطان معزالدین محمد کا قتل بھی گکھڑوں کے سر تھوپ دیا۔ یہ غلطی دوسرے لوگوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے چنانچہ پرتھی راج راسا میں بھی مُغلیہ عہد کی اس غلطی کی صدائے بازگشت ملتی ہے اور مصنف اپنے عہد کے حالات کے مدنظر گکھڑوں کو مغلیہ سرکار میں سرآوردہ دیکھ کر تصور کرتا ہے کہ شہاب الدین کے ہاں بھی وہ اسی طرح معزز و ممتاز ہوں گے۔

بلوچ

مُصنف راسا کئی موقعوں پر بلوچوں کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً پدماوتی سے بیسویں داستان اور ہانسی پور پرتھم جلد ۱۵ ویں اور دوتیہ جلد ۵۲ ویں داستان میں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچی شہاب الدین کے ماتحت ہیں۔

بلوچ اصلاً ایرانی النسل ہیں اور سلطان معزالدین محمد کے عہد تک غالباً ایران ہی میں تھے۔ مسعودی کے قول کے مطابق بلوس (بلوچ) چوتھی صدی ہجری میں کرمان کے علاقے میں آباد تھے اور صحرائے لوط پر ان کا تصرف تھا۔ اصطخری کے زمانے میں (چوتھی صدی) وہ خراسان اور سیستان کی طرف بڑھتے ہیں۔ اور سیستان کے دو پرگنے ان کی طرف منسوب ہیں۔ فردوسی کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ جب نوشیرواں ان کی مفسدہ پردازی کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اس کا مشیر کہتا ہے کہ بلوچیوں کا انتظام تو اردشیر سے بھی نہیں ہو سکا۔

زکار بلوچ ارجمند اردشیر بکوشید با کار دانان پیر
نہ بد سود مندی با فسون ورنگ نہ از بند و رنج و نہ پیکار و جنگ

مگر نوشیرواں اس مشورے کو منظور نہ کر کے بلوچیوں پر لشکر کشی کرتا ہے۔ اور قرار واقعی سزا دیتا ہے۔

بشد ایمن از رنج ایشاں جہاں بلوچی نماند آشکار و نہاں

بلوچیوں کا کوچ سندھ و ہندوستان کی سرحد کی طرف اس علاقے میں جس کو عرب جغرافیہ نگار توران کے نام سے یاد کرتے ہیں اور بعد میں بلوچستان کے نام سے مشہور ہوا چنگیزیوں کے خروج کے بعد کا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال سلطان معزالدین اگرچہ سندھ پر قابض ہے مگر وہ نہ ہندوستان کی سرحد پر اور نہ خراسان میں بلوچیوں کے ساتھ تعلق میں آیا۔ اور نہ اس کی تاریخ میں بلوچیوں کا تذکرہ ملتا۔ مصنف راسا اپنے عہد کے حالات کو زیر نظر رکھتے ہوئے جب مغلوں کے ہاں دیگر اقوام کی طرح بلوچی بھی ملازم تھے۔ ان کو اپنے افسانے میں شہاب الدین کی فوجوں میں شامل بتاتا ہے۔

مُغل اور چغتّا

پرتھی راج راسا میں مغل اور چغتا کا مذکور بھی آتا ہے جس سے راسا کو ایک قدیم تالیف ماننے کا عقیدہ ہمارے لیے ناقابل یقین ٹھہرتا ہے کیونکہ اس کتاب کو عام طور پر پرتھی راج کی زندگی یا اس کی وفات سے جو ۵۸۸ھ میں ہوتی ہے عین بعد کی تالیف مانا جاتا ہے لیکن مغلوں کا خروج ممالک اسلام میں ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں یعنی پرتھی راج سے

تین سنتیس سال بعد کا واقعہ ہے۔ جب وہ مسلمانی سلطنتوں کا چراغ گل کرتے ہوئے روم و روس بلکہ یورپ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اگرچہ ان کے حملے برابر ہوتے رہے خصوصًا صوبہ پنجاب میں مگر ۹۳۲ھ ۱۵۲۸ء تک ان کو اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب ظہیرالدین محمد بابر پانی پت کے میدان میں لودھیوں کی طاقت توڑکر ہندوستان کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ مگر چند کوی کا دعویٰ ہے کہ پرتھی راج اور اس کے باپ سومیشور کے زمانے میں ایک مغل بادشاہ سرزمین میوات میں حکومت کرتا تھا۔ یہ مغل راجا راسا کی داستانوں مگل کتھا (۸ ویں) اور مگل جدھ (۱۵ ویں) کا موضوع ہے۔ اس کا نام مگل راے ہے اور مسلمان معلوم ہوتا ہے۔ اس کے فرزند اور دیگر سرداران فوج کے نام بھی مسلمانی ہیں۔

یہاں قدرتًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مغلوں کا مغلستان کے سوا ہندوستان درکنار ممالک اسلام میں بھی قدم نہیں آیا تھا۔ یہ لوگ میوات میں حکومت کرنے اور سومیشور اور اس کے فرزند پرتھی راج کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے کے لیے کہاں سے آگئے۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ راسا پر ہمیں تاریخی دستاویز کی حیثیت سے نظر نہیں ڈالنی چاہیے، بلکہ ایک افسانے کی حیثیت سے یہ رزمیہ پرتھی راج کو ہندو شجاعت اور جوانمردی کے مثالیے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اسی لیے چند کوی اپنے ہیرو کے زور و طاقت اور جلال و شان دکھانے کے لیے اس کی شہرت و ناموری کے تاج میں ہر قسم کی خیالی فتوحات اور فرضی ظفریابیوں کے چمک دار نگینے جڑ رہا ہے۔ مصنف کو

ان خونناک مغلوں کی بابت جنھوں نے دنیا کی ایک تہائی آبادی کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اگر ذرا بھی صحیح اندازہ ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ ان کے متعلق کبھی ایسی بے سر و پا داستانیں تراشنے کی جرأت نہ کرتا۔ لیکن جہاں اس نے دیگر حکمرانوں کو ان خیالی جنگوں میں جن کے لمبے چوڑے بیانات اس کے رزمیہ میں محفوظ ہیں۔ اپنے ہیرو کے ہاتھ سے تباہ و شکست خوردہ دکھایا ہے۔ ان مغلوں کو بھی جو اس کے عہد میں تمام ہندوستان پر اپنا شاہی اقتدار قایم کر چکے ہیں، پرتھی راج کا کنونڈا ظاہر کیا ہے۔

فرنگی اور رومی

تیرھویں داستان سلکھ جدھ میں پرتھی راج کا جاسوس شہاب الدین کی فوج میں ۳۷ ہزار فرنگیوں کا بھی ذکر کرتا ہے ؎

سینتیس سہس سجے فرنگ　　　تن لنب جھول ٹوپی سرنگ

چھند ۱۸ ص $\frac{۱۲۵}{۵}$

اسی طرح بیسویں داستان پدماوتی سمے میں پھر فرنگیوں کا مذکور ہے جن کو شاعر لال بانات کے لباس میں ملبوس بتارہا ہے ؎

رد ہنگی فرنگی ہلبنی سمانی　　　ٹھٹی ٹھٹ بلوچ ڈھالن نسانی

تانن گھیرن بیٹھ ہے جین سالن　　　فرنگی کتی پاس سکلات لالن

چھند ۵۵ - ۵۶ ص $\frac{۶۳۹}{۲}$. بانات سترھویں صدی عیسوی سے لے کر تقریباً اب تک فرنگیوں بالخصوص فوجیوں کی ایک خصوصی

شان رہی ہے۔ وقائع کوہستان میں فضل عظیم بھی انھیں سقرلات پوشں لکھ رہا ہے، چنانچہ ؎

تمامی یلان سقرلات پوش نبرد آزمایان ہنگامہ کوش

(صفحہ ۹ مطبع مصطفائی صادق الاخبار شاہجہان آباد ۱۲۶۹ھ)

ہندوستان میں فرنگیوں میں سب سے پہلے پرتگالی ہیں جو غالبًا سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے موجود ہیں۔ فوج میں بھی ملازم رکھے جاتے ہیں، خصوصًا توپ خانے میں۔ ٹاڈ صاحب کا یہ عذر کہ ان فرنگیوں سے مراد حروب صلیبی کے فرنگی ہیں، واقعات معلومہ کے سامنے عذر لنگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ فرنگی ہندوستان میں صرف دسویں صدی ہجری کے آغاز سے ملنے لگے ہیں۔ اس صدی سے قبل ان کا پتہ نہیں ملتا۔ ابتدا میں صرف گجرات اور دکن میں نظر آتے ہیں۔ بعد میں ہندوستان خاص میں بھی آنے لگے۔

بہر حال جس دور میں پرتھی راج راسا لکھا جا رہا تھا اس دور میں فرنگیوں کو ملازمت میں رکھنے کا عام دستور موجود تھا۔ اسی لیے مصنف اپنے عہد کے واقعات سے آنکھ بند نہیں کرسکتا تھا۔

جو رائے کہ فرنگیوں کے لیے ہے وہی رومیوں کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے۔ ان میں فرق اتنا ہی تھا کہ فرنگی مذہبًا عیسائی تھے اور رومی مسلمان۔

مسلمانی اقوام اور ممالک سے مصنف کی بے خبری کا یہ حال ہے کہ وہ کندلواس اجیک اور کھونکار کو ملک اور علاقے تصور

کر رہا ہے۔ بادلویں داستان ہانسی دوتیہ جدھ میں کوی لکھتا ہے کہ جب سلطان کو یہ علم ہوا کہ تتار کی فوج کو جو والدۂ شاہ کے لوٹے جانے کی توہین کے ازالہ کے لیے بھیجی گئی تھی شکست مل گئی نہایت برہم ہوا اور اس نے ہانسی کے خلاف ایک مہم بھیجنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ فرامین بھیج کر روم۔ ہریو (ہرات) بھنبر۔ بھکر سمرقند۔ کسقند۔ بلخ۔ بلوچ۔ بکران۔ کندلواس۔ اجبک۔ کھونکار اراک۔ کھندھار سے تازہ فوجیں منگوائیں۔ اس کے نزدیک گویا روم۔ سمرقند۔ کنقند۔ بلوچ۔ قندلواس۔ ازبک۔ خونکار اور عراق وغیرہ مقامات سلطان کے زیرنگیں تھے۔ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ تمام مقامات غزنین کے قرب وجوار میں واقع ہیں۔ اور ان علاقوں کے حاکم شہاب الدین کے یا ملازم ہیں یا اس کے باج گزار ہیں جن کو بوقت ضرورت فوج کے ساتھ سلطان کی امداد کرنا ضروری ہے۔

اگر ممالک اسلام اور شہاب الدین کی قلمرو سے وہ واقف ہوتا تو ہرگز ایسی غلطی کا مرتکب نہ ہوتا کہ سمرقند سے لے کر روم تک کا سارا علاقہ جس پر ان ایام میں کئی تاجدار حکومت کر رہے تھے۔ شہاب الدین کی قلمرو میں شامل کر لیتا۔ مثلاً سمرقند و بخارا پر ملوک افراسیابی جو ایلک خانی بھی کہلاتے ہیں حکمراں تھے۔ ایران پر خوارزم شاہی اور اتابک قابض تھے۔ عراق پر خلفائے عباسیہ کا تصرف تھا۔ روم۔ سلاجقہ اور عیسائی سلاطین بازنطینیہ میں منقسم تھا۔

اوجبک (اوزبک)

اوزبک اقوام ترک مغول کی ایک شاخ ہے جو سائبیریا میں آباد تھی۔ محمد شیبانی خاں سنہ ۹۰۶ھ ۱۵۰۰ء میں سائبیریا سے ترک سکونت کرکے ترکستان میں آجاتا ہے اور تیموری شاہزادوں کا زور توڑکر تمام ترکستان اور خوراسان پر قابض ہوجاتا ہے۔ جہاں اس کا خاندان گزشتہ صدی تک حکومت کرتا رہا۔ ہندوستان میں اوزبکوں کی شہرت مغلوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اکبر سلاطین اوزبک کے ساتھ برابر سفارتی تعلقات قایم رکھتا رہا اور اسی دور سے ان کی شہرت ہندوستان میں جہاں وہ ملازمتیں حاصل کرنے بھی آنے لگے ہیں عام ہونے لگی۔

کندلواس یا کدلواس (قزلباش)

یہ لفظ دراصل ترکی قزلباش (سُرخ سر) ہے۔ یہ اصطلاح ایران میں بعہد اسمٰعیل صفوی سنہ ۹۰۷ھ ۱۵۰۲ء سنہ ۹۳۰ھ ۱۵۲۴ء رواج میں آتی ہے جس سے مراد شیعہ فوج ہے۔ اسمٰعیل نے یہ جدت کی کہ اپنی فوج کو بارہ ترک والی ٹوپی وردی کے طور پر دی۔ بارہ ترک رمز ہے بارہ ائمہ معصوم کی طرف۔ رفتہ رفتہ اس کے معنی ایرانی شیعہ سپاہی ہوگئے ہندوستان میں اس لفظ کو اکبر کے عہد سے قبل تلاش کرنا فضول ہے۔

کھونکار (خونکار)

یہ لفظ فارسی میں خونکار اور خوندگار کی شکل میں ملتا ہے۔ جو خداوندگار کا مخفف ہے۔ رشیدی میں اس کے معنی صاحب امر و صاحب فرمان دیے ہیں۔ اصل میں سلاطین مغل، سلاطین عثمانیہ کو اس لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مغلیہ عہد کے اہل قلم نے بھی یہ اصطلاح اختیار کر لی جو اکبر سے قبل بہت کم استعمال میں آتی ہے۔

حصار

مصنف کو چونکہ تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں اس لیے پرتھی راج کے عہد میں حصار فیروزہ کا ذکر کر رہا ہے حالانکہ اس زمانے سے دو صدی بعد فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ د ۷۹۰ھ اس کو آباد کرتا ہے۔ حسین کتھا نویں داستان میں مرقوم ہے کہ جب حسین پرتھی راج کے دربار میں پہنچا تو اس نے پانچ ترکش ایک خراسانی کمان سنگل دیپ کا ایک مست ہاتھی۔ پانچ عراقی گھوڑے۔ ایک بیش قیمت الماس اور دو لعل راجا کی نذر گزرانے۔ پرتھی راج بہت محظوظ ہوا اور کیتھل۔ ہانسی اور حصار کے پرگنے اس نے حسین کی جاگیر میں دے دیے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ فیروز شاہ نے اپنے نام پر اس کا نام حصار فیروزہ رکھ کر آباد کیا۔ چونکہ اس علاقے میں پانی کی کمی تھی اس لیے دریائے ستلج سے ایک نہر کاٹ کر وہ حصار لے جاتا ہے۔ بڑی لڑائی میں پاوس پنڈیر کو حصار کا جاگیردار

دکھایا گیا ہی۔

راہِ مکّہ

مصنف سلطان معزالدین محمد بن سام کے زمانے میں سفر مکہ اور اس کی راہوں سے اس قدر ناواقف ہی کہ سلطان کی والدہ کو غزنین سے حج بیت اللہ کے لیے ہندوستان کے راستے بھیج رہا ہی۔ والدۂ شاہ ہانسی تک بخیریت پہنچ جاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہی کہ بیگم تھانہ یا سورت سے جہاز میں سوار ہوتیں۔ مگر سفر ملتوی رہتا ہی کیونکہ پرتھی راج کے سامنتوں نے موقع پاکر ان کو لوٹ لیا۔ بیگم کی حفاظت میں جو فوج بھیجی گئی تھی بھاگ گئی اور وہ لٹ لٹاکر واپس غزنین چل دیں جہاں پہنچ کر انھوں نے اپنی داستان غم اپنے فرزند شہاب الدین کو سنائی بادشاہ کو طیش آتا ہی اور اس توہین کے انتقام کے لیے فوجیں بھیجتا ہی۔ چنانچہ ہانسی پر پہلی جنگ ۵۱ ویں داستان اور ہانسی کی دوسری جنگ ۵۲ ویں داستان اسی واقعے کی صدائے بازگشت ہیں۔

لیکن مصنف کو شاید یہ علم نہیں تھا کہ ان ایام میں غزنین اور اس کے علاقے کے لوگ براہِ ہند مکے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ براہ ایران و بغداد[۱]۔ ہندوستان کا راستہ حاجیوں کے لیے بالکل غیر محفوظ تھا۔

---

[۱] ہندوستانی حاجیوں کے لیے بھی یہی راستہ تھا۔ خاقانی ایک قصیدے میں لکھتا ہی ؎

عشق برکردہ زمکہ آتشی کز شرق و غرب　　کعبہ را ہر ہفت کردہ ہفت مردان دیدہ اند

ہم بداں آتش زہند و چیں بہ بغداد آمدہ　　ماہ ذوالقعدہ بروے دجلہ تاباں دیدہ اند

یعنی ہندی اور چینی بھی بغداد میں آکر جمع ہو جاتے ہیں ذیقعدہ کا چاند دیکھنے کے بعد حاجیوں کا قافلہ مکہ کی طرف روانہ ہوتا ہی۔

چور اور ڈاکو کثرت سے تھے ۔ جگہ جگہ مختلف راجاؤں کی عمل داریاں تھیں جنھیں ویسے بھی مسلمانوں سے نفرت تھی ۔ والدۂ شاہ کو ہانسی تک لانے سے مصنف کا منشا یہ ہی کہ بیگم براہِ گجرات مکہ معظمہ جائیں لیکن یہ وہ راستہ ہی جو مسلمانوں نے گجرات فتح کرنے کے بعد اپنے لیے کھولا ہی اور جو اب تک جاری ہی ۔ بہر حال مصنف اس راستے کو لینے میں اپنے عہد (مغلیہ عہد) کے قاعدے اور رواج پر عمل درآمد کر رہا ہی ۔

ستی کی صدائے بازگشت

مصنف کا عقیدہ ہی کہ مسلمان عورتیں اور کنیزیں اپنے آقاؤں اور خاوندوں کی لاش کے ساتھ زندہ دفن کر دی جاتی ہیں ، چنانچہ حسین کتھا نوین داستان میں چترریکھا حسین کی لاش کے ساتھ زندہ دفن ہوتی ہی ۔ دھیر پنڈیر ۲۴ ویں داستان میں شہاب الدین کا خواص سیرن شہاب الدین کی گرفتاری کے وقت اپنی پیاری جان لے کر غزنین بھاگ جاتا ہی ۔ جب وہ گھر پہنچتا ہی اس کی بیوی ملامت کے لہجے میں اس سے کہتی ہی ۔ اگر تو میدان جنگ میں قتل ہو جاتا اور میں تیری لاش کے ساتھ دفن ہوتی ۔ مجھے یہ حالت تیرے اس فرار ہونے اور جان بچانے سے ہزار درجے زیادہ گوارا ہوتی ۔ یہ صدائے بازگشت ہی ستی کی رسم کی جو ہندوؤں میں رائج تھی ۔ یہ ہندو بھاٹ اس وہم میں مبتلا ہی کہ جہاں ہندو عورتیں زندہ جلا دی جاتی ہیں ۔ مسلمان عورتیں زندہ دفن

کی جاتی ہیں۔

بخشی

میں یہاں بعض دفتری اصطلاحوں کا ذکر کرتا ہوں جو راسا میں مل جاتی ہیں۔ ان میں ایک اصطلاح تو "بخشی" (تنخواہ دہندۂ فوج) ہے مصنف اس کو "بگسی" لکھتا ہے۔ راجپوتانے میں آج بھی غیر تعلیم یافتہ ہنود سے یہی تلفظ مسموع ہوتا ہے بلکہ جدھ تیرھویں داستان میں آتا ہے ؎

سلطان کھبری یہ سین پائی بگسی سہاب برنی سنائی

(چھند ۲۰ ص $\frac{۵۲۱}{۱۰}$ ج)

ایک اور موقع پر آتا ہے ؎ بجل خاں بگسی بھیو (چھند ۱۱۸ ص $\frac{۱۱۹۵}{۱۰}$ ج)

مگر یاد رہے کہ بخشی ہندوستان میں مغلوں کی آمد تک رواج میں نہیں آیا تھا۔ اور یہ مغل ہیں جن کے ساتھ یہ اصطلاح اس ملک میں آتی ہے۔ بلکہ ریاستوں میں آج بھی یہ عہدہ موجود ہے۔ قدیم زمانے میں اس کی جگہ عارض آتا ہے۔

بخشی کے متعلق تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ در اصل سنسکرت کا لفظ بھکشو بمعنی بھکاری اس کی قدیم شکل ہے جو بدھ مت والوں کے ساتھ چین میں پہنچا۔ اور وہیں سے منگولستان پہنچ گیا۔ چنگیزیوں میں اس سے مراد اہل انشا اور مستوفی ہے۔ انھیں کے ساتھ یہ لفظ ایران میں آیا، جہاں سے دسویں صدی ہجری میں بابر کے ساتھ واپس ہندوستان پہنچتا ہے۔ بہرحال راسا میں بخشی کا استعمال ہمارے نزدیک اس تالیف کے جدید العہد ہونے کی ایک مضبوط دلیل ہے۔

شاگرد پیشہ

جس طرح بخشی مغلیہ عہد کی دفتری اصطلاح ہے۔ اسی طرح شاگرد پیشہ ہے جس سے مقصد نجی خدمت گاران شاہی ہیں۔ شاگرد پیشہ کے لیے بہار میں آتا ہے :۔

"لفظی است مستعمل دفاتر در بار سلاطین ہندوستان و در ایران 'عملہ' بجاے آں گویند۔"

راسا میں یہ لفظ بھی موجود ہے چنانچہ پچیس سہس ساگردپیں (چھند ۲۰ صفحہ ۵۲۱ ساکمہ جلد ۵ ۱۲ دیں داستان)

عرضداشت

عرضداشت ایک اور دفتری اصطلاح ہے جو متاخرین میں تو بہت زیادہ مستعمل ہے۔ بہار عجم میں اس کے متعلق تحریر ہے :۔

" در ہندوستان پادشاہ زادگان و امرا بجناب عالی و خورداں بخدمت بزرگاں نویسند۔"

راسا میں یہ اصطلاح بصورت 'ارداس' موجود ہے۔ چنانچہ سہ

تب تتار ارداس لکھی (چھند ۲۹ صفحہ ۲ دھن کتھا ۲۴ ویں داستان)

اسی داستان میں ایک اور موقع پر آتا ہے :۔

لکھی ارداس تتار خاں اسپی بیر دچار۔ (چھند ۲۰۵ صفحہ ۲۴ دھن کتھا ۲۴ ویں داستان)

ڈاک چوکی

'ڈاک چوکی' ایک اور اصطلاح ہے جو اکبری عہد کے مورخین کے ہاں عام استعمال میں آرہی ہے۔ مثلاً :-

"و شیخ زادہ دمشقی بہ تقریب دیر رسیدن ڈاک چوکی از دہلی بدروغ آوازہ در انداختند کہ سلطان تغلق نماند (منتخب التواریخ بدایونی صفحہ نول کشور)

لیکن قدیم لفظ اس کے لیے یا تو فارسی الاغ ہے یا ہندی دھاوہ" چنانچہ فرشتہ اس کی طرف ایما کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"در اثنائے ایں حال ڈاک چوکی باصطلاح آں مردم الاغ مے گفتند با فرمان از دہلی رسید" (صفحہ ۱۳۱ نول کشور)

برنی نے ایک موقع پر دونوں لفظ دیے ہیں :-

"کارہائے ملک در دہلی بگشت دغیرے بر تخت گاہ دہلی متمکن گشت وراہ الاغ و دھاوہ بکلی منقطع شد

ایک اور موقع پر علاءالدین خلجی کے حالات میں بہ تقریب مہم دکن برنی لکھتا ہے :-

"بسبب آنکہ یک دو تھانہ از راہ برخاستہ بود راہ لشکر منقطع شدہ و الاغ و قاصدے و دھاوہ از لشکر در دہلی نہ رسید"

اس سے اس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاک چوکی کوئی قدیم اصطلاح نہیں ہے مگر مغلوں میں اس کا رواج بہت عام ہے۔ اسی اثر میں ہم دیکھتے ہیں کہ راسا میں بھی استعمال میں آرہی ہے چنانچہ :-

آین ڈاک چوکی لورکھن ۱۱ (چھند ۸۰ ۲۹ ح ۲۲۵ ص دھن کتھا ۲۴ ویں داستان)

اُردو

اس سلسلے میں ایک اور قابل ذکر اصطلاح اردو ہے جسے مصنف بہ شکل 'اُردھ' لکھ رہا ہے:

(۱) دو سین ساجے راجے رو دھ ٹھڈے سو آئے آسو اُردھ
(چھند ۹۲۷ ح ۲۲۶۳/۱۹ ص بڑی لڑائی چھیاسٹھویں داستان)

(۲) لو ہانو مد موند ا بان ٹکے بہو بھاری ۱۱ اُٹھی سو ٹھڑ جوان اپٹھ اُردھ نکاری ۱۱
(چھند ۱۱۷ ح ۸ ص ۹۰۶)

اردو کے تعلق میں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مغلوں سے قبل کے ہندوستان میں یہ لفظ رواج عام میں نہیں تھا۔ اور یہ جو بعض تاریخوں میں ایک آدھ جگہ مل جاتا ہے مثلاً طبقات ناصری و تاریخ فیروز شاہی شمس سراج میں تو یہ ہمارے نزدیک قدما کی تحریر میں متاخرین کی فردگزاشت کا پرتو ہے یعنی جب اکبری عہد میں یہ کتابیں نقل ہوئیں۔ سہو کتابت سے یہ لفظ بعض موقعوں پر متن میں شامل ہو گیا۔ البتہ تغلق نامے میں امیر خسرو اس کو بہ شکل 'اُرد' لکھ رہے ہیں جس کی شکل راسا کے 'اُردھ' سے بہت ملتی جلتی ہے۔ مثالیں ذیل میں عرض ہیں:

ز اُرد خاص تا دروازۂ قصر ہمہ تیغ و سناں بد باشہ عصر
ص ۱۲۶ شعر ۲۶۱۷ تغلق نامہ

دیگر:
چو بشکست آں سپاہ و رفت ہر سوے + ملک آور دسوے اردگہ روے
ص ۱۳۱ شعر ۲۵۲۰ تغلق نامہ۔

ہمیر

راسا میں کئی موقعوں پر ایسے نام ملتے ہیں جن میں ہمیر کا لفظ موجود ہے۔ مثلاً پدماوتی ویاہ ۲۶ ویں داستان میں منگل گڈھ کے راجا ہاڑا ہمیر کا ذکر آتا ہے۔ اور کانگڑہ جدھ ۳۵ ویں داستان میں ہاہولی راے ہمیر کا نام آتا ہے جو پرتھی راج کا ایک ساونت ہے۔ مصنف ہمیر کو بالتشدید ہمّیر لکھتا ہے اور یہ اس کی ناواقفیت یا بے پروائی پر مبنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر اوقات شاعر کو ہم الفاظ کے توڑنے مڑورنے اور ان کے گھٹانے بڑھانے میں مصروف دیکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہمیر نام ہندووں میں کب سے رائج ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری میں وہ رنتھنبھور کے چوہان راجا کا نام ہے جو ہمیر دیو کے نام سے بہت مشہور ہے اور جس کے حالات میں ہمیر راسا اور ہمیر کاویہ وغیرہ ہندی تصنیفات موجود ہیں۔ مگر یاد رہے کہ ہمیر، مسلمانی لفظ ہے اور لفظ امیر کی بگڑی شکل ہے۔ اوّل اوّل بخط ہندی مسکوکات پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سب سے قدیم خود سلطان معزالدین محمد بن سام کے سکے ہیں۔ جن پر "سری ہمیر" کی شکل میں ملتا ہے۔ سری ہمیر سے مقصد امیرالمومنین خلیفۂ بغداد ہے۔ یہ ہندی کلمہ سلطان معزالدین۔ شمس الدین التمش۔ رکن الدین فیروز۔ سلطان رضیہ وغیرہ کے مسی سکوں پر نظر آتا ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ یہ عین پرتھی راج کا زمانہ ہے جب یہ مسلمانی لفظ مسکوکات میں شایع ہو کر ہندوؤں میں روشناس ہونے لگا ہے۔ بحیثیت علم اس کا اختیار کیا جانا بہت بعد کی بات ہے۔ اس

لیے یہ خیال کرنا کہ پرتھی راج کے عہد میں ہندو قوم نے بحیثیت اسم اس لفظ کو اختیار کر لیا تھا حتیٰ کہ خود پرتھی راج کے ایک سامنت کا نام ہمیر تھا۔ بیحد غیر اغلب اور ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔

ہتھنار

بے شمار موقعوں پر اس رزمیہ میں ہتھنار یعنی ہتھنال کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً گھگھر کی لڑائی ۲۹ ویں داستان میں آتا ہے: ؎

سوا گیں ہتھناری اپار سجن ؛ تن دکھیت کائر دور بھجن ؛؛

(چھند ۱۲ صفحہ ۹۴۷/۹)

ہتھنال سے مراد ایسی توپ ہے جسے ایک ہاتھی آسانی سے لے جا سکے۔ اکبر کی اور ایجادات کے علاوہ جن میں بعض توپیں ٹکڑے کر کر کے لے جائی جاتی تھیں اور بعض میں سترہ توپوں کے لیے ایک پلیتہ درکار تھا۔ ایک ایجاد یہی ہتھنال ہے۔ یعنی ہاتھی کی توپ جس کا نام اکبر نے گج نال رکھا تھا۔ آئین اکبری میں آتا ہے:

"و نیز چناں برساخت کہ یک فیل بآسانی کشد و آنرا گج نال نامند"

(ج اول صفحہ ۱۴۳ نول کشور)

اکبر کے عہد سے قبل اس گج نال یا ہتھنال کا کتب تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔ جب راسا میں ہتھنال کا ذکر آ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی تصنیف اکبر کے عہد سے بعد کی ہے۔ کیونکہ گج نال و ہتھنال بے گجنال قدیم ہے۔

کمان یا کمند

ایک انوکھی رسم یعنی کمان کے ذریعے سے گرفتاری راسا کے صفحات میں کئی جگہ ملتی ہے۔ مثلاً پدماوتی سمے بیسویں داستان میں آتا ہے کہ عین گھمسان کے معرکے میں پرتھی راج نے کمان ڈال کر شہاب الدین کو گرفتار کر لیا۔ ریوا تٹ سمیو ستائیسویں داستان میں پھر مذکور ہے کہ پرتھی راج نے کمان ڈال کر شاہ کو اسیر کر لیا۔ اور گھگھر کی لڑائی ۲۹ ویں داستان میں مرقوم ہے کہ کنہ چوہان نے میدان جنگ میں کمان ڈال کر شاہ کو کھینچ لیا۔ بہر حال یہ تین موقعے تو صاف طور پر مجھے معلوم ہیں۔ اور موقعے بھی ہوں تو تعجب نہیں۔ اس گرفتاری کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ پادشاہ کو کمان کے ذریعے سے اسیر کیا جاتا ہے۔ لیکن کمان کے ذریعے سے دشمن کی گرفتاری کمان کا جدید استعمال ہے۔ جو صرف راسا میں پایا جاتا ہے۔ ایرانی اور مسلمانی اقوام میں گرفتاری کے لیے کمند کا بالعموم استعمال رہا ہے۔ مگر مصنف راسا کمند کا کام کمان سے لے رہا ہے۔ اگر ہمیں سچی بات کہنے کی اجازت دی جائے تو کہیں گے کہ مصنف راسا کو کمان اور کمند میں التباس ہو گیا ہے۔

طبیب

چوتھی داستان، لوہا نو آجان باہو سمے، اس کہانی سے شروع ہوتی ہے کہ پرتھی راج کو ایک دن یہ عجیب شوق چرایا کہ اپنے سادھنوں

کو تیس ہاتھ اونچے چھجے سے کدائے۔ ساونت راجا کی اس انوکھی فرمائش پر حیرت زدہ رہ گئے۔ لوہانا آجان باہو راجا کے حکم کی تعمیل میں بلا پس وپیش کود پڑا اور غریب کے چوٹ آگئی۔ راجا نے فوراً طبیبوں کی حاضری کے لیے حکم دیا۔ وہ آئے اور علاج کے لئے لوہانا کو اٹھاکر اپنے گھر لے گے ؎

تب طبیب تسلیم کری ا لے گھر آئے لوہان ۱۱ (چھند ۲۴۷ ح ۴)

ذرا پرتھی راج کے عہد کی اس زبان پر بھی غور کرلیا جائے۔ اگر آج یہ فقرہ اُردو میں لکھا جائے تو یوں ہوگا:-

تب طبیب تسلیم کر [کے] لوہانا [کو] گھر لے آئے۔

اسی طرح یہ امر بھی قابل لحاظ معلوم ہوتا ہے کہ پرتھی راج کے پاس چھٹی صدی ہجری کے وسط میں جب کہ وہ ناگور میں مقیم ہے مسلمان طبیب بھی موجود ہیں۔ جو راج کنوار پرتھی راج کو تسلیم کرکے لوہانا کو علاج کی غرض سے اپنے گھر لے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پرتھی راج کے عہد میں خصوصاً راجپوتانہ جیسے الگ تھلگ مقام پر طبیب موجود نہیں تھے۔ ہندوستان میں ان کی مقبولیت اس عہد سے بعد کی بات ہے مگر چونکہ مصنف کی آنکھوں میں اس کے اپنے عہد کی زندگی کا نقشہ پھر رہا ہے۔ جب طبیب ہندوستان کی زندگی کا لازمہ بن گئے ہیں۔ اور ہندوستان کے ہر حصے میں پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے رزمیہ میں ان کا ذکر کرنے پر مجبور ہوا۔

لاڈنوں اور کھٹّو

راسا میں جن شہروں اور موضعوں کے اسمار ملتے ہیں ان میں سے اکثر مارواڑ سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً سانبھر۔ اجمیر۔ ناگور۔ سارونڈا۔ اچل پور۔ پارس پور۔ پنچوسر۔ درپور۔ لاڈنوں اور کھٹّو۔

لاڈنوں فی زمانہ ایک جاگیری قصبہ ہے جو اس کے لکھ پتی بنیوں کی بنا پر دور دور مشہور ہے۔ یہ قصبہ جودھپور ریلوے کی اس شاخ پر ایک اسٹیشن ہے جو سجان گڑھ اور ڈیگانہ جنکشنوں کے درمیان چلتی ہے۔ راسا جو اپنے لیے اس قدر قدامت کا مدعی ہے تعجب ہے لاڈنوں کو اس کے جدید تلفظ سے یاد کرتا ہے یعنی لاڈنوں۔ حالانکہ اس کا قدیم تلفظ جو آئین اکبری میں محفوظ ہے۔ بہ صورت لاڈوں ملتا ہے۔ (آئین ص ۲۷۲ جلد دوم)

کھٹّو کا ذکر راسا میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ پرتھی راج کی چہیتی شکارگاہ معلوم ہوتی ہے جہاں متعدد موقعوں پر وہ شکار کھیلتا دکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ (۱) جب حسین پناہ لینے کے لیے پرتھی راج کے دربار کا رُخ کرتا ہے۔ اس وقت پرتھی راج کھٹّو پور میں جس سے مقصد یہی کھٹّو ہے شکار میں مصروف تھا۔ (حسین کتھا نویں داستان چھند ۹ ص ۲۸۸)۔ (۲) سلکھ جدھ ۱۳ ویں داستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ پرتھی راج شہاب الدین سے زر فدیہ وصول کرکے اور اس کو آزاد کرکے کھٹّو بن شکار کو چل دیتا ہے۔ (۳) آکھیٹک چوک برنن دسویں داستان میں پرتھی راج کھٹّو بن میں شکار کو جاتا ہے۔ شہاب الدین کو جاسوسوں کے ذریعے سے یہ اطلاع غزنین پہنچ جاتی ہے۔ شاہ لشکر لے کر پہنچ جاتا ہے

اور بن کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ (۴) جیت راو جدھ ۲۴ ویں داستان۔ دلی پہنچنے سے ڈھائی سال بعد پرتھی راج کھٹو بن شکار کو جاتا ہے۔ اس کی اطلاع نیت راو کھتری شہاب الدین کو پہنچا دیتا ہے۔ (۵) نہاوتی ووا ہ ۲۶ ویں داستان۔ شاہ کو جاسوسوں کے ذریعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پرتھی راج کھٹو پور شکار کو گیا ہے۔ (چھند ۱ ص ۱۰۴۴/ج ۹)۔ (۶) کیماس جدھ ۴۳ ویں داستان۔ دھرمائن کایستھ پرتھی راج کے کھٹو بن جانے کی اطلاع شہاب الدین کو پہنچاتا ہے۔ (چھند ۱۵ ص ۱۱۰۰/ج ۱۰)۔ (۷) دھن کتھا ۲۴ ویں داستان۔ پرتھی راج اسی کھٹو کے بن سے ایک خزانہ نکالتا ہے۔ یہ داستان راسا کی مقتدر داستانوں میں سے ہے۔

راسا کی روایات میں کھٹو کے اس قدر اہم ہونے کی وجہ سے ہم مطلق تاریکی میں ہیں۔ اس کے بیانات سے تو ایسا واضح ہوتا ہے کہ سندر بن اور کجلی بن کی طرح کھٹو بن بھی کوئی بہت بڑا بن ہوگا۔ جس میں پرتھی راج مہینوں شکار کھیلتا رہتا ہے حتیٰ کہ شہاب الدین غزنین سے آکر اسے گھیر لیتا ہے۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کھٹو کا فقط نام سن رکھا ہے۔ وہ اس مقام کے طبعی اور جغرافیائی حالات سے بالکل ناواقف ہے۔ کھٹو تمام تر ریگستانی علاقہ ہے۔ یہ موضع ایک پہاڑ کے ضلع میں جو تین میل لمبا ہے آباد ہے۔ پانی اس قدر نایاب ہے کہ اس علاقے میں کسی وقت بھی کوئی وسیع و عریض جنگل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور نہ شکاری جانور آباد ہو سکتے ہیں۔ شیر۔ تیندوا۔ چیتا۔ سانبھر۔ جھانک وغیرہ

ان اطراف میں نہیں پائے جاتے۔ ہرنوں کی اقسام میں صرف چکارہ ملتا ہے۔

کھٹو نام کے دو موضعے ہیں جو ایک دوسرے سے دو تین میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ ایک کو دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے مغربی قصبے کو آج کل بڑی کھاٹو اور مشرقی قصبے کو چھوٹی کھاٹو کہتے ہیں۔ راسا کا مصنف صرف ایک قصبے سے واقف ہے جو اس کے نزدیک کھٹو ہے۔ کھٹو اس میں شک نہیں قدیم تلفظ ہے اور کھاٹو جدید۔ راقم نے اس قصبے کے متعلق جس قدر پرانے فرامین اور کتبے دیکھے ہیں۔ ان پر بہ صورت کھٹو نام ملتا ہے کھٹو کلاں قدیم الایام میں نہایت اہم مقام ہوگا۔ وہاں کا سب سے قدیم کتبہ جو سابق میں کسی تالاب پر واقع تھا۔ سلطان شمس الدین التمش متوفی سنہ ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ع کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی عہد کی ایک جامع مسجد بھی موجود ہے۔ کھٹو میں شیرانیوں کا قبیلہ نہایت قدیم زمانے سے آباد معلوم ہوتا ہے۔ ان کے متعلق سب سے قدیم تلمیح کتاب مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول، میں ملتی ہے۔ جو شیخ احمد کھٹو کے حالات میں نویں صدی ہجری کے وسط کی ایک تالیف ہے۔ کھٹو کی شہرت وہاں کے پتھر اور بابا اسحٰق مغربی کے مزار نیز ان کے مرید شیخ احمد کھٹو کی بنا پر ہے۔ جن کا مزار سرکھیج احمد آباد میں ہے۔ کھٹو پرگنہ ناگور میں شامل ہے اور بڑی کھاٹو کے نام سے ریلوے اسٹیشن بھی ہے جو ڈیگانہ اور سجان گڑھ لائن پر آتا ہے۔ محمد شاہی عہد سے یہ تمام علاقہ ریاست جودھپور کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ تب سے موضع کھٹو

چانپاوت راجپوتوں کی جاگیر میں ہے۔

پدماوت

پدماوتی سمے بیسویں داستان کے بعض خط و خال محمد جائسی کی پدماوت کے ساتھ ملتے جلتے ہیں جو شیرشاہ متوفی ۹۵۲ھ کے زمانے کی تالیف ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ دونوں کہانیوں میں شہزادیوں کا نام پدماوت ہے۔ دونوں شہزادیوں کے پاس طوطے ہیں۔ جائسی کے ہاں طوطا پدماوت کے حسن و جمال کی تعریف کرکے رتن سین والی چتوڑ کو اس کا عاشق بنا دیتا ہے۔ راسا میں طوطا پرتھی راج کی تعریفیں کرکرکے پدماوتی کو اس کا نادیدہ شیدائی بنا دیتا ہے۔ دونوں کہانیوں میں طوطا قاصد کا کام دیتا ہے۔ رتن سین بھی جاکر مندر میں ٹھہرتا ہے۔ پرتھی راج بھی پدماوت کو لانے کے وقت مندر میں پہنچتا ہے۔

ان کہانیوں میں واقعات و حالات کا یہ اشتراک اتفاقی نہیں مانا جاسکتا۔ ضرور ہے کہ ایک دوسرے سے لے رہا ہو۔ اور ہمارا خیال ہے کہ راسا کا مصنف جائسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلا رہا ہے۔

سوالک

پدماوتی سمے بیسویں داستان میں یہ چھند آتا ہے:

سوالکھ اوتر شیل ۔ کمئوں گڈھ دو رنگ ۔۔

(چھند ۲۶ صفحہ ۶۴۹)

اس چھند کا مطلب یہ ہے کہ شمال کی طرف کوہستان سوالک میں کماؤں کا ناقابل تسخیر قلعہ ہے۔ موجودہ نقشوں میں کوہستان سوالک ہردوار اور ڈیرہ دون کے مابین دکھایا جاتا ہے۔ ٹائمز انسائیکلوپیڈیا میں ہردوار۔ ریاست ناہن اور ضلع ہوشیار پور کے درمیان بتایا ہے۔ لیکن واقعات بابری سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے عہد میں تمام ہمالیہ پر سوالک کا اطلاق ہوتا تھا۔ چنانچہ

"بجر دگذشتن از دریاے سندھ دریں کوہستان از توابع کشمیر ولایتہاست مثل پکلی وسہنک اکثری اگرچہ الحال اطاعت کشمیر می کنند اما پیشتر با داخل کشمیر بودہ۔ بعد از گذشتن کشمیر دریں کوہ بے نہایت ایل والوس و پرگنہ دولایتہاست تا بنگالہ وکنار دریاے محیط بایں کوہ پیوستہ است ...... متاع مردم ایں کوہ نافہ مشک وقوتاس بحری و زعفران وسرب ومس است۔ ایں کوہ را مردم ہند سوالک پربت گویند۔ بزبان ہند (سوا) ربع۔ لک صد ہزار (و) پربت کوہ (را) مے گویند۔ یعنی ربعے (و) صد ہزار کوہ کہ یک صد وبیست و پنج ہزار کوہ باشد۔ دریں کوہ ہا برف ہرگز بر طرف نمی شود۔" (صفحہ ۹۰ طبع بمبئی)

جہاں تک مجھے معلوم ہے سوالک کا ذکر سب سے پیشتر تیمور کے حملۂ ہند میں آتا ہے۔ قلعۂ میرٹھ کی فتح کے بعد گنگا عبور کر کے تیمور کوہستان سوالک میں گھس جاتا ہے۔ اور جمنا سے پار اتر کر پہاڑیوں سے جنگ کرتا ہوا کانگڑے کا رخ کر لیتا ہے۔ وہ ایک ماہ کے

عرصے میں کوہستان سوالک وکوہ کوکہ طے کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تیمور کے ہاں سوالک کا استعمال ایک خاص حصۂ کوہستان تک محدود ہے جو ہردوار سے شروع ہوکر کانگڑے پر ختم ہوتا ہے۔

اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پرتھی راج اور اس کے قریب تر زمانے میں سوالک کا استعمال ایک بالکل مختلف خطۂ زمین پر ہو رہا تھا۔ جو غالباً ہانسی وسرستی منڈور و ناگور کے مابین محدود تھا طبقات ناصری میں جو ۶۵۸ھ کی تالیف ہے۔ کئی موقعوں پر سوالک کا تذکرہ ملتا ہے۔ سب سے پہلے بہرام شاہ غزنوی م ۵۴۷ھ ۱۱۵۲ء کے حالات میں ایک فقرہ محمد باہلیم والی ہندوستان کے متعلق یہ آتا ہے:

"وولایت ہندوستان تمام اورا دادو او بار دیگر عاصی شدہ قلعۂ ناگور در ولایت سوالک بجد بیرہ بنا کرد" صفحہ ۲۴۔ ملوک نیم روز کے ذکر میں تاج الدین ینال تگین خوارزمی کے متعلق لکھا ہے:۔

"و ایں تاج الدین در خدمت ملک کریم الدین حمزہ بود در ناگور سوالک۔ ناگاہ فرصتے جست و خواجہ نجیب الدین را شہید کرد"

ترائن کی دوسری جنگ کے موقعے پر جس میں پرتھی راج مارا جاتا ہے، پھر سوالک کا نام ہمیں ملتا ہے۔ چنانچہ:۔

"و دارالملک اجمیر و تمام سوالک چوں ہانسی و سرستی و دیگر دیار فتح شد" صفحہ ۱۲۰

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوالک کے ذیل میں ہانسی وسرستی بھی شامل ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء کے بیان میں بہ ذیل ۶۲۴ھ یہ فقرہ مرقوم ہے:۔

"وبعد ازاں بیک سال در شہور سنہ اربع وعشرین وستمایہ عزیمت قلعہ مندور کرد از حدود سوالک. حق تعالیٰ آں فتح اور ا میسر گردانید" صفحہ ۱۲

منڈور مارواڑ کی پرانی راجدھانی ہی جو موجودہ شہر جودھپور سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہی۔

طبقات کے ان فقروں سے ایسا مفہوم ہوتا ہی کہ سوالک ایک بڑی قسمت کا نام ہی جس میں ناگور اور منڈور سے لے کر ہانسی اور سرستی تک کا تمام علاقہ شامل ہی۔ لیکن یہ بیان اس خطہ کی حدبندی کے لیے بڑی حد تک مبہم اور ناکافی معلوم ہوتا ہی۔ البتہ اس قدر کہا جا سکتا ہی کہ غزنوی دور میں سوالک کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ ناگور کے واسطے ہورہا ہی۔ ناصرالدین محمود (۶۴۴-۶۶۴ھ / ۱۲۴۶-۱۲۶۵ء) کے عہد میں ہانسی اور ناگور کا علاقہ غیاث الدین بلبن کی جاگیر میں تھا۔ منہاج سراج اس جاگیر کو بعض موقعوں پر ہانسی وسوالک کے نام کے ساتھ یاد کرتا ہی۔ چنانچہ:-

"الغ خاں را فرمان داد تا بسر اقطاع خود بطرف سوالک وہانسی برود" صفحہ ۲۱۷

ایک اور مثال یہ ہی:-

"چوں بخطۂ ہانسی رسید بر سبیل سرعت تمام تر فرمان داد تا جملہ لشکر ہائے سوالک۔ ہانسی وسرستی وجیند وبروالہ واطراف آں بلاد در مدت چہاردہ روز جمع شدند" صفحہ ۳۰۵ اور برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہی:- "وسوالک تا جالور وملتان تا مرلیہ واز پالم تا لوہور" صفحہ ۲۶۹۔

(دیگر) "کرت دیگر سہ چہار امیران تمن مغل باسی چہل ہزار سواران مغل سرزدہ درسرزمین سوالک کو داگور درآمدند" (ص ۲۱۳ تاریخ فیروز شاہی)

ان فقروں میں سوالک سے مقصد یہی ناگور ہے۔ میں یہاں اس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ پرگنہ ناگور کو مقامی تقسیم کے مطابق جو یقیناً کسی قدیم روایت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ مارواڑ کے لوگ آج بھی سوالک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی ایک ضرب المثل ہے۔ کہ سوالک کے بیل عمدہ ہوتے ہیں۔ ایک مشہور دوہرے میں اہل سوالک کی مذمت یوں کی گئی ہے: ؎

بیٹی نہ دیجیے سوالکیا جو دیجیے تو جوئے ۔۔۔ روٹی دے ہے جوار کی پُو کو دے ہے روئے

ایک اور دوہرا سنیے ؎

سوالکیوں کی ڈیکری پڑی پول میں پیسے ۔۔۔ اوڑن کالی لوگڑی ڈاکن ہو جوں دیسے

جب پرتھی راج کے زمانے میں سوالک کا استعمال ناگور و ہانسی کے علاقوں پر ہو رہا ہے تو تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اسی عہد کی ایک تالیف میں جیسا کہ راسا کے واسطے دعویٰ کیا جاتا ہے سوالک کو ایسے معنوں میں لایا جاتا ہے جو پرتھی راج کے زمانے سے دو ڈھائی صدی بعد رواج میں آئے ہیں۔

دربار و محل سرا

راسا میں درباری اور شاہانہ زندگی کے جو بعض مناظر دکھائے گئے ہیں وہ مغلیہ زمانے کی رسوم دربار سے اس قدر ملتے جلتے ہیں

کہ ہمیں ان میں اختلافی عنصر کی تلاش میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہے۔ جو لوازمے مغلوں کے ہاں دیکھے جاتے ہیں وہی پرتھی راج اور جے چند کے درباروں میں کسی قدر ضمنی اختلاف کے ساتھ ملتے ہیں نقیب ہیں۔ نوبت نقارہ ہے۔ چتر اور چتر دار علیٰ ہذا چونری بردار و چوبدار ہیں۔ دربار فرش و فروش اور قیمتی قالینوں سے آراستہ ہے۔ دیواروں پر پچی کاری کا کام ہو رہا ہے۔ امرا کی باقاعدہ نشستیں مقرر ہیں۔ اہل نغمہ و نشاط ہیں۔ موسیقی ساز بج رہے ہیں اور خوشبوؤں سے تمام دربار مہک رہا ہے۔ سلام اور درباری تسلیم کا بھی رواج ہے۔ نوبت نشان بجتا ہے ؎

نوبت نشان دربار بجّے (چھند ۱۱ ص ۱۹۴۴)

بسنت

دلی ورنن انسٹھویں داستان میں نگمبودھ گھاٹ پر جمنا کے کنارے ایک باغ کا ذکر آتا ہے۔ جہاں بسنت کے ایام میں پرتھی راج علی الصباح دربار کرتا۔ میٹھے سروں والے ساز بجتے اور گویّے اپنی شیریں اور دلکش آوازوں میں عمدہ عمدہ راگ اور راگنیاں چھیڑتے۔ عنبر عبیر اور گلال کی لپٹ سے تمام دربار بس جاتا۔ وسط میں مہاراج پرتھی راج کا سنگھاسن (تخت) ہوتا۔ آس پاس سامنتوں کی نشستیں ہوتیں۔ راجا کے دائیں بائیں خدمت گار چنور لیے کھڑے ہوتے۔ بائیں طرف گوبند رائے بڈگر اور سلکھ پربار بیٹھتے اور دائیں طرف سومیشور کا سگا بھائی کنہ چوہان بیٹھتا۔

جس کی آنکھوں پر ہمیشہ پٹی بندھی رہتی۔ تخت کے پیچھے گرو رام پروہت کا آسن ہوتا اور سامنے کوی چند بیٹھتا۔ چند پنڈیر۔ چامنڈ رائے۔ لکھن بگھیلا وغیرہ سامنت اپنے اپنے آسنوں پر ادب سے بیٹھے ہوتے فرش پر گدی تکیے لگے ہوتے جن پر زری کا کام ہوتا۔ دیواروں میں نیلم یاقوت وغیرہ رنگین جواہرات کی پچی کاری ہوتی؛ ؎

پچی رتّی نلّی مانکین ۱ رتنن جتنن منی نیچ کین ۱۱

(چھند ۳۰ صفحہ ۱۵۵۲/۱ دلی ورنن ۵۹ ویں داستان)

دوپہر کو جب کھانے کا وقت ہوتا۔ بن بیر پڑھیار آتا اور ہاتھ جوڑ کر اطلاع دیتا کہ کھانا تیار ہے۔ اس پر راجا مع اپنے ساونتوں کے جاکر دسترخوان پر بیٹھتا اور کھانے سے فارغ ہوکر کچھ عرصے قیلولہ کرتا اور پھر دربار میں جا بیٹھتا۔

بسنت پنچمی

بسنت پنچمی کے موقع پر راجا بسنت کے دربار سجانے کا حکم دیتا ہے۔ حکم ہوتے ہی ملازموں نے "نیت استھان" آراستہ کرنا شروع کیا۔ جشن کے لیے سارا ضروری سامان نکالا۔ بات کی بات میں منوں اگر۔ عبیر اور گلال لاکر حاضر کیا۔ ہرے ہرے پتوں۔ شاخوں۔ بیلوں اور بوٹوں سے مجلس کو سجایا۔ سوتی۔ ریشمی زرتار اور قسم قسم کے بسنتی رنگ کے کپڑوں سے دربار کے مقام کی آرائش کی گئی۔ زعفران۔ مشک۔ اگر اور صندل کی خوشبو

بسائی ۔ زمین پر جاجم، اور انمول دُلیچے (زلیچے) بچھائے ۔ گلاب کا چھڑکاؤ ہوا اور عبیر کی گرد اُڑنے لگی ۔ درمیان میں گوپال لال جی کا سنگھاسن قایم کیا گیا ۔ پوجا کا وقت آتے ہی گھنٹے ۔ سنکھ ۔ جھالر ۔ مردنگ ۔ جنتر ۔ نفیری بھیری ۔ شہنائی ۔ چنگ ۔ ڈھول ۔ اپنگ ۔ دمامہ ۔ بنسی وغیرہ ساز بجنے لگے ۔ پوجا کے اختتام پر راجہ بھی اپنے مقام سے اُٹھ کر گوپال لال کے سنگھاسن کے پاس آ بیٹھا ۔ اب مجرا شروع ہوا ۔ ارباب نشاط نے اپنا اپنا کمال دکھایا ۔ آدھی رات کے وقت دربار برخاست ہوا اور راجا انعام دے کر زنانے محل میں چلے گئے ۔

جے چند کا دربار

جے چند کے دربار میں بھی جس کا نقشہ شاعر نے قنوج سمے ۶۱ ویں داستان میں کھینچا ہے ۔ قریب قریب یہی کیفیت نظر آتی ہے ۔ رنگین قالینوں کے تھان کے تھان بچھے ہیں ۔ جن کو دیکھ کر قوس قزح کے رنگ شرماتے ہیں ۔ ریشمی دھاگے سنہری تاروں کے ساتھ گتھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں ۔ جیسے زمین سورج کی شعاعوں سے منور ہوتی ہے ۔ نیلم اور یاقوت کی چنی ایسی خوش آیند نظر آتی ہے گویا دریائے نیل میں مچھلی تیر رہی ہے ۔

برن تھان تھانن دُلیچے دِرلیچے　　　تنن دیکھ رنگن دھنن پتی لاجے
گتھے رکت پٹن سوی ڈوری ہیمن　　　منو جیم رُدِ کرن مل نچل ہی تیمن
جرے رکت نیلن نگن پٹ ساہی　　　منو آورے بندھو دھر نیل ماہی

(چھند ۶۳ - ۵۶۴ صفحہ ۱۶۶۰/۱۴ ح قنوج سمے)

جے چند کے سر پر ایک خواص چاندی کی ڈنڈی کا چتر لیے کھڑا ہے اور دائیں بائیں دو چوبدار ہیں :-

سر نیت چہتر منڈیو سوبھوپ ۔ بہو دیس رڈی بہوتاس روپ
دوہو پٹھ ساجی ورچنور ڈھار ۔ رجی روپ جانی اسونی کمار

(چھند ۲۱ - ۵۱۹ صفحہ ۱۶۵۴/۱۴ ح)

چوبدار بھی موجود ہیں :-

پان دھار چھڑ چھگرہ ۔ راج گرہی بر بھٹ

(چھند ۸۴۸ صفحہ ۱۶۴۲/۱۴ ح قنوج سمے ۶۱ ویں داستان)

نقیب بھی ہیں جو حکم احکام پہنچاتے ہیں :-

حکم نقیبن کہہ پھرے ۔ ڈیرا ڈیرا گاہے ۱۱

(چھند ۵۲ صفحہ ۱۲۰۶/۱۱ ح چوالیسویں داستان)

میں بخوف طوالت صرف انہی چند امور پر قناعت کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ دربار کی آراستگی اور تکلف کے ساتھ اس کی سجاوٹ مغل سلاطین کے ہاں ایک مقبولہ روایت رہی ہے قیمتی اور اعلیٰ اعلیٰ قالینوں اور ریشمین پردوں سے وہ اپنے درباروں کو سجاتے بلکہ جشنوں کے موقعوں پر عام آئین بندی کرتے تھے۔ میں یہاں ایک مختصر بیان بدایونی کی تاریخ سے نقل کرتا ہوں جو ۲۵ھ جلوس اکبری کے جشن نوروز کے متعلق ہے

" آئین بندی ہر دو دیوان خانہ خاص و عوام با نواع تماشہائے لطیف فرمودہ۔ اشیائے قیمتی گوناگوں ترتیب نمودہ دیردہ ہائے

فرنگی وتصویر ہاے بے نظیر گرفتند و سراپردہاے اعلیٰ افراشتند وبازارِ آگرہ و فتحپور را نیز باین دستور آراستہ تا ہزدہ روز وشب جشن عالی داشتند واقسام طوائف اہل نغمہ وساز ہندی و فارسی وارباب طرب از مرد وزن ہزاران ہزار طلبیدہ" (صفحہ ۲۳۸ نول کشور ۱۸۶۶ء)

بلکہ ارباب موسیقی تو ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ آئین اکبری سے یہ فقرہ سُنیے :۔

"شمشیر بازان چابکدست وپہلوانان ہر سرزمین در انتظار فرمایش ہاے خدمت افشرند وخنیاگران مرد وزن آمادۂ فرمان پذیری باشند۔ شعبدہ بازان شگفت آور وبازیگران نشاط افزا دستوری نمایش جویند" صفحہ ۱۴۵ ج اول نول کشور ۱۸۶۹ء)

موسیقی مغلیہ دربار کا ایک مقبول ضابطہ رہا ہے جس کو صرف عالمگیر بادشاہ نے اپنے عہد میں موقوف کیا تھا۔ ورنہ ان کے ہاں سازندے اور اہل نغمہ باقاعدہ ملازم رہتے تھے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں خوشبو خانے پر ایک علیحدہ عنوان قایم کیا ہے وہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو خوش بو کا بے حد شوق ہے وہ اس کو عبادت الٰہی کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ عنبر اور عود اور دیگر مرکبات قدیم سے نیز جدید قسم کے مرکبات ساختۂ بادشاہی سے محفل خسروی ہر وقت معطر رہتی ہے۔ طرح طرح کی شکلوں کی سنہری اور رُپہلی انگیٹھیوں میں بخور سُلگایا جاتا ہے۔ خوشبودار پھول کثرت کے ساتھ فراہم کیے جاتے ہیں۔ ان کا روغن تیار ہوتا ہے جو جسم اور سر پہ ملا جاتا ہے۔ میں اصل عبارت بھی سُنا دیتا ہوں :۔

"بزم آرائے سلطنت بوئے خوش را دوست دارد وآں را دست مایۂ ایزدی پرستش داند۔ ہموارہ از عنبر و عود و شگرف آمیزتہائے باستان و فراہم آوردۂ گیتی خداوند قدسی محفل عطر آگیں باشد و در زرینہ و سیمیں مجمرہا کہ بگوناگوں پیکر بر سازند بخور کنند۔ گلہائے بویا خرمن خرمن آمادہ از گل روغن بر سازند و بدن و موئے سر بدو پیرا ندایند" (ص ۹۳ جلد اول نول کشور ۱۸۶۹ء)

ابوالفضل نے اور امور کے علاوہ ان مرکبات کے جو دربار میں تیار ہوتے تھے مثلاً سنتوکھ۔ ارگجہ۔ گلکامہ۔ روح افزا۔ اوپٹنہ عبیر مایہ۔ کشتہ۔ فتیلہ۔ بارجات۔ عبیر اور غسول وغیرہ کے نسخے بھی بیان کیے ہیں۔ ان میں سے عبیر کا نسخہ یہ ہے:-

تین پاؤ صندل چھپّیں تولہ عود (اگر) دو تولے اور آٹھ ماشے مشک۔ سب کو پیس کر سایہ میں خشک کریں اور استعمال میں لائیں

ان ایام میں سیر بھر عود کی قیمت دس روپے سے پانچ اشرفی تک ہوتی تھی اور تولہ بھر عنبر کی قیمت ایک اشرفی سے تین اشرفی تک

پچّی کاری

دیواروں پر رنگین اور قیمتی پتھروں سے پچّی کاری کا مصنف نے جو ذکر کیا ہے اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ دستور ہندوستان میں مغلوں کے عہد سے زیادہ قدیم نہیں۔ شاہ جہاں کا زمانہ اس کے لیے بہترین مانا جاتا ہے۔ دہلی کے قلعے میں دیوان خاص کی اور آگرے میں تاج محل کی پچّی کاری بے مثال مانی گئی ہے۔ پچّی کاری دراصل

فارسی پرچین کاری کی بگڑی شکل ہے جس کے معنی لغت میں یوں دیے ہیں :-

"انواع نقاشی کہ از سنگ یا رہا برنگ دیگر کنند"

درحقیقت یہ ایک مسلمانی دستکاری ہے۔ پرتھی راج کے عہد میں اس کا رواج تسلیم کرنا عقل ونقل پر ستم توڑتا ہے۔ میں نقیب چوبدار اور چونری بردار وغیرہ کے لیے کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ ہندوستانی سرکاروں اور رجواڑوں میں ابھی تک ان کا رواج باقی ہے۔ نقیب کا ترجمہ کڑکیت اور ڈونڈی والا ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارا مصنف اصلی لفظ نقیب ہی استعمال کر رہا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔

جاجم اور دُلیچہ

جاجم اور دُلیچہ جن کے فرضی شاعر نے دربار میں بچھے بیان کیے ہیں۔ دونوں ایرانی الاصل ہیں۔ دُلیچہ زلیچہ یعنی زیلوچہ کی بگڑی شکل ہے۔ زیلو بمعنی پلاس وقالی فرہنگوں میں مل جاتا ہے۔ زیلوچہ اس کا اسم تصغیر ہے۔ پلیٹ نے اپنی فرہنگ میں دُلیچہ کو غالیچہ کی تغیر یافتہ شکل کہا ہے جو ناقابل تسلیم ہے۔ زلیچہ کی مثال مثنوی خوب ترنگ تصنیف ۹۸۶ھ سے دی جاتی ہے جو میاں خوب محمد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ نے بزبان گوجری (اردوے گجرات) لکھی تھی۔ وہو ہذا:

(۱) بڈا زلیچہ اک بچھولے سوتا چتالس اور جاے

(دیگر) توتا یوں زلیچہ سوے جیوں پوتلا چتریا ہوے

سلام و تسلیم

سلام اور تسلیم بجالانے کا بھی دستور ہی۔ جب لورک رائے کھتری شہاب الدین کی رہائی کے لیے غزنین سے دلی آتا ہی۔ پرتھی راج کے حضور میں تین مرتبہ تسلیم کرتا ہی ۔ ہ

سنمکھ آئے چھوان کو سیس نائی تسلیم کیے

(چھند ۳۰۳ صـ۲۲ـ دھن کتھا چوبیسویں داستان)

یہی نہیں بلکہ جب راجہ اسے بیٹھنے کا حکم دیتا ہی وہ پھر سلام کرکے بیٹھتا ہی : ہ

بیٹھن حکم راجان کیے کری سلام بیٹھو نرسیے

(چھند ۳۰۴ صـ۲۲ـ ح ۷)

اور جب تتار خاں مفروضہ وزیر شہاب الدین کی عرضداشت راجہ کی خدمت میں پیش کرتا ہی۔ تین بار پھر سلام کرتا ہی ۔ ہ

تب کھتری پرتھی راج کوں کری سلام تئے بار
لکھی ارداس تتارخاں سیپی بیسر دچار

(چھند ۳۰۵ صـ۲۲ـ ح ۷)

یہ ادنے ادنے بات پر سلام کرنے کا طریقہ درحقیقت مغلیہ دربار کا دستور ہی۔ جب دھرمائن کایستھ پرتھی راج کے وزیر کیماس کی خدمت میں پادشاہ کی چٹھی پہنچاتا ہی۔ حسب دستور تین بار سلام کرتا ہی : ہ

دیے پتری ایہی سوکر　　کری سلام تیے بار
صاحب تم سن لرن کو　　آیو سندھو اتار

(چھند ۸۴ صفحہ ۱۱۰۶ ح ۱۰ پہاڑ راے سمے، ۳۲ ویں داستان)

حسین کتھا نویں داستان میں جب پرتھی راج شہاب الدین کو قید سے آزاد کرتا ہے۔ شاہ تین بار سلام کرتا ہے: ؎

کیے سلام تئے بار　　جاہو اپنے سو تھانہ
متی ہندو پرساہ　　سبھی آؤ سو تھانہ

(چھند ۲۰۹ صفحہ ۱۲۱۴ ح ۴)

دھیر پنڈیر چوستھویں داستان میں پھر شاہ اپنی رہائی کے وقت پرتھی راج کو تین بار سلام کرتا ہے: ؎

کری سلام تہوں بار　　دھر انگریہے ترکان

(چھند ۴۲، ۳ صفحہ ۲۰۹۹ ح ۱۸)

یہاں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ اکبر بادشاہ نے دو قسم کی تعظیم مقرر کی تھی۔ پہلی کورنش جس میں سیدھے ہاتھ کو پیشانی پر رکھ کر سر کو جھکانا پڑتا تھا۔ دوسری تسلیم جس میں سیدھے ہاتھ کی پیٹھ کو زمین سے چھوکر اور آہستگی کے ساتھ اٹھاکر سیدھا کھڑا ہوکر سر کو ہتیلی کے ساتھ چھونا پڑتا تھا۔ خاص خاص موقعوں پر مثلاً رخصت ملازمت و عطاے جاگیر و منصب و بخشش فیل واسپ تین مرتبہ تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ دوسری قسم کی داد و دہش کی صورت میں صرف ایک مرتبہ بلازم بھی اپنے آقاؤں کے ساتھ یہی دستور برتتے تھے۔ گویا اسی ضابطے کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں کہ شہاب الدین جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے

پرتھی راج کے آگے اپنی رہائی کے وقت تین تین مرتبہ تسلیمات بجالاتا ہے۔ میں اپنے بیان کی تائید میں آئین اکبری سے ایک فقرہ یہاں درج کرتا ہوں جو کورنش سے متعلق ہے:-

"گیتی خداوند روے دست راستین برفراز پیشانی نہادہ سرفرود آوردن قرار فرمود وآں را بہ زبان وقت کورنش گویند" (صفحہ ۱۵۶)

اور تسلیم کے لیے لکھا ہے "آئین چنانست بندگانِ عاطفت پذیر پشت دست راست بر زمین نہادہ بہ آرامیدگی بردارند وراست ایستادہ روئے دست را بر تارک سر نہند دبدیں دل گزیں روش سپرد خود را گزارش نمایند و آنرا تسلیم برگویند . . . ہنگام رخصت و ملازمت و منصب و جاگیر وتشریف وبخشش فیل واسپ سہ تسلیم را پیش گاہ نمایش گردانند و در باقی مراتب داد و دہش وگوناگوں عنایت یگاں یگاں بجا آید"

(صفحہ ۱۵۶ جلد اول نول کشور ۱۸۶۹ء)

ہمیں یاد رہے کہ مغلوں کے درباری ضابطے اس عہد کی دیگر سرکاروں کے لیے دستور العمل بن گئے تھے۔ چنانچہ مصنف راسا پرتھی راج کے دربار کو انھیں ضوابط کے مطابق دکھا رہا ہے۔ بلکہ اسی دستور کی پابندی اسے گوکھ یعنی جھروکے کے ذکر پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ پرتھی راج بھی جھروکے میں بیٹھا کرتا تھا۔ درگا کیدار سے اٹھاونویں داستان کی تمہید میں وہ لکھتا ہے کہ پرتھی راج کیماس وزیر کے غم میں مبتلا ہے۔ رات دن اسی کے دھیان میں گھلا جاتا ہے۔ نہ اسے جھروکے میں بیٹھنے سے چین آتا ہے نہ انتر محل میں جانے سے۔ بلکہ ساونتوں کے ساتھ

چوگان کھیلتے وقت بھی یہی غم اس کو ہلکان کیے جاتا ہے چنانچہ کہا ہے:ے

نہ سیچ کھُد گوکھ تھ		نہ سیچ اندر راج
اُرانتر کیاس دکھ		سانمتاں سرتاج (چھند ۱ ص ۱۵۱۱/۱۳)
زب کریڈت چوگان		ستھ سامنت سوبھر
جب رامت اس رنگ		تب سنبھرے منتر بر (چھند ۲ ص ۱۵۱۱/۱۳)

یہ جھروکا ہمیں اکبر کے جھروکۂ درشن کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح چوگان بازی بھی مسلمانی کھیل ہے جس کا وطن ایران ہے۔

دُعا گوئی

دُعا گوئی بھی درباری ضوابط میں داخل ہے۔ مغلوں کے ملازمین اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہوتے وقت سب سے پہلے اس کے حق میں دعائیں دیتے نظر آتے ہیں اور پھر حرف مطلب زبان پر لاتے ہیں۔ راسا میں اس دستور کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ سلکھ جُدہ تیرھویں داستان میں پرتھی راج کا جاسوس شہاب الدین کی فوج کشی کی خبر لے کر آتا ہے۔ اصل مقصد کی طرف رجوع کرنے سے پیشتر وہ راجا کو یوں دعا دیتا ہے:ے

اچھو اک چھو آن غازی		خلق تو کھگ راضی
میدا اس مار باجی		پرو تو سرن ساجی
بھے بھیت بھوکن ترھیون		نھل پتر کیذن بھکیون
آواس نرواس تیرن		جہاں تہاں تجی دھتور کھیرن
اجمیر بیسر سہائی		دشمن بیال لکھ دیو ہائی

پیر پیغمبر دواہ گیر سارے آن ئین مئی ترن دنت چارے
ڈھلّی تخت تھر راج تین تین گنگ جل جمن روی چند جی تین

(چھند ۱۰ صفحہ ۲۵)

یہ دعا بالکل مسلمانی طرز کی ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پرتھی راج کا مخبر مسلمان ہوگا۔ وہ دُعائیہ کہتا ہے۔ کہ اے غازی چوہان! خلق خدا تیری شمشیر سے خوش رہے تو میوات کا فاتح کہلاتا ہے۔ خدا تجھے اپنی حفاظت میں رکھے۔ اجمیری پیر تیرا دستگیر ہو۔ اور دشمن پامال ہوں۔ تمام اولیا اور پیغمبر دعاگو ہیں۔ کہ جب تک گنگا اور جمنا چاند اور سورج قایم ہیں تب تک تو دلی کے تخت پر برقرار رہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دواہ گیر (دعاگیر) بہ قیاس 'زمیں گیر' 'دامن گیر' نہیں ہے بلکہ 'دعاگر' کی بگڑی شکل ہے ؎

دعا گرند بہ شاخ چنار مرگل را تدرو و فاختہ و عندلیب و قمری سار
اگر دعا گر گل بر چنار مرغانند چرا چو دست دعا گر شدست دست چنار

اس چھند میں یہ الفاظ مسلمانی ہیں۔ اے۔ غازی (گاجی) کھلک (خلق)، راجی (راضی) کھیر (خیر)، پیر۔ دسمن (دشمن) پیمال (پایمال) جہلا آج بھی پیمال بولتے ہیں۔ پیر۔ پیگمبر (پیغمبر) دواہ (دعا) گیر (گر) تکھت (تخت) مسلمانی الفاظ کی یہ بہتات اگرچہ استعجاب انگیز ہے۔ مگر اس کی توجیہ ہمارے نزدیک یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر اس موقع پر ایک ایسے مخبر کو راجہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے جو مذہبًا مسلمان ہے اور اپنے جذبات و خیالات کے مطابق دعا دہی میں مصروف ہے۔ اجمیر پیر کی حمایت۔ دشمن کی پایمالی اور پیروں کی دعاگوئی خالصًا مسلمانی

جذبات ہیں ۔

اجمیر پیر

'اجمیر پیر' کی ترکیب بھی قابل لحاظ ہے۔ 'اجمیر پیر' سے مقصد خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں ۔ لوگ انھیں اجمیری پیر، اور پیر اجمیری کہتے ہیں ۔ مسلمانی روایت پرتھی راج کے عہد میں خواجہ صاحب کو اجمیر میں موجود بتاتی ہے ۔ لیکن انھیں مقبول عام ہوکر اجمیری پیر کے خطاب سے مشہور ہونے کے لیے صدیوں کا زمانہ درکار ہے ۔ خواجہ اجمیر ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے پیشوا ہونے کے لحاظ سے اگرچہ ہر عہد میں مقبول و محترم مانے گئے ہیں ۔ لیکن سلاطین مغلیہ کی ارادتمندی نے ان کی شہرت و عظمت کے اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں خصوصاً اکبر ۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانوں میں اکبر ایک زمانے میں خواجہ صاحب کا اس قدر معتقد تھا کہ اپنی منت پوری کرنے کے لیے فتحپور سیکری سے اجمیر تک پیادہ پا جاتا ہے ۔ جہانگیر بھی اجمیر گیا ہے اور درگاہ پر دیگیں چڑھاتا ہے ۔ جو اب بھی موجود ہیں ۔ شاہجہاں چاندی کا کٹہرا بنواتا ہے ۔ اور جہاں آرا بیگم آپ کے حالات میں ایک رسالہ مونس الارواح نامی تصنیف کرتی ہے ۔ جس کا اصل نسخہ لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے اور یہی زمانہ ہے جب عوام میں 'اجمیری پیر' کی قسم کی ترکیبیں رائج ہوتی ہیں ۔

ڈھلی تخت (دلی تخت) فارسی ترکیب 'تخت دہلی' کثرت استعمال سے ایک مقبول عام ترکیب بن گئی ۔ اور اس وقت رواج میں آئی

جب دہلی مسلمانی حکومت کا پایۂ تخت بن گیا۔ مگر اس موقع پر جاسوس کا پرتھی راج کو جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دلی کے تخت پر قایم بتانا قبل از وقت ہی کیونکہ پرتھی راج ابھی تک ایک راج کنوار کی حیثیت کا مالک ہی۔ اس کا باپ سومیشور زندہ ہی۔ جو اجمیر پر حکومت کرتا کہ اور دہلی اس کے مفروضہ نانا اننگ پال کے قبضے میں ہی۔ یاد رہے کہ سلکھ جدھ تیرھویں داستان ہی جس میں اننگ پال پرتھی راج کو متبنّٰی بناکر دلی کی گدی اس کے حوالے کر دیتا ہی۔

اب تک ہم نے پرتھی راج کے درباری لوازمہ کا مطالعہ کیا ہی۔ جو اکثر امور میں مغلیہ درباروں کی نقل معلوم ہوتا ہی۔ اس سے ظاہر ہی کہ مصنف نے پرتھی راج کے عہد کی خصوصیات تمدنی سے ناواقفیت کی بنا پر اس کے دربار کو اپنے عہد کے انداز میں سجا دیا ہی بلکہ مسلمانی اصطلاحات کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مثلاً عنبر و عبیر وغیرہ جن سے دربار بسایا جاتا ہی۔ گلاب جس کا چھڑکاؤ ہوتا ہی۔ جاجم اور دلیچے (قالین) فرش پر بچھائے جاتے ہیں۔ موسیقی سازوں میں چنگ۔ شہنائی۔ دمامہ اور نفیری۔ موخرالذکر کو مصنف نے نپھیری بہ یائے مجہول لکھا ہی۔ سلام اور تسلیم۔ نقیب اور تخت و چوگان بھی اسی مد میں داخل ہیں۔ اب ہم ایک اور زاویۂ سے نگاہ ڈالتے ہیں۔ جو پرتھی راج کی رانیوں۔ ان کے محل اور ڈیوڑھی کے امور پر روشنی ڈالتا ہی۔

آکھیٹ چکھ سراپ نام پرستاو تریسٹھویں داستان میں یہ قصہ آتا ہی کہ پرتھی راج قنوج کی مہم سے واپس آنے کے بعد اپنے مقتول

پہلوانوں اور ساتھیوں کے لیے بے حد مغموم رہنے لگا ہے۔ اس کا غم غلط کرنے کے لیے رانیاں یہ تدبیر کرتی ہیں۔ کہ راجہ سے فرمائش کرتی ہیں کہ ہمیں بھی تو کبھی لے جاکر شکار کی سیر کرائیے اور دکھائیے کہ شکار کیونکر کھیلا جاتا ہے۔ شیر۔ ہرن اور سوّر کس طرح مارے جاتے ہیں۔ شیر ہرن کو کس داؤ سے مارتا ہے اور کتے زنجیروں سے آزاد ہوکر اپنے شکار کو کیسے دبوچتے ہیں۔ اس پر راجہ ان کی درخواست منظور کرلیتا ہے۔ اور ایک ماہ کے لیے پانی پت جانے کی ٹھہرتی ہے۔ جے چند کی دختر سنجوگتا پورے ماہ کے اخراجات کا ذمہ اپنے سر لیتی ہے۔ وہ اپنی ڈیوڑھی کے مہتمم جھگرو ساہ کو حکم دیتی ہے کہ ہر چیز کا انتظام کرے اور اعلیٰ پکوان پکوائے۔ الیچی (الائچی) لونگ۔ مرچ سکّر (شکر) کھانڈ۔ کھنڈ اور بہت سا اچار پانی پنتھ (پانی پت) پہنچوادے جب جانے کی تیاری ہوچکتی ہے۔ سواری کے لیے پلکیاں (پالکیاں) ڈول (ڈولیاں) سکھپال۔ رتھ۔ سکھاسن اور ہاتھی آتے ہیں۔ رانیاں اپنی اپنی پسند کی سواریوں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ لونڈیاں خوشبو کی کپیاں۔ پانوں کا سامان اور صندوق وغیرہ سر پر لیے پیدل ساتھ ہولیں۔ ان کے پیچھے عصا لیے خواجہ سراؤں کا جھرمٹ ہے۔ ان کے پیچھے اعتمادی فوج کے دستے ہیں اور انتظام کے لیے چودہ کا ساتھ ہیں۔ پانی پت پہنچ کر رانیاں خیمے ڈیرے کھڑے کیے جانے تک ایک باغ کی سیر کو جاتی ہیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ باغ کی روشیں بڑی صفائی کے ساتھ بنی ہیں۔ درخت پھولوں اور پھلوں سے لدے ہیں اور پرندے ان پر بیٹھے چہچہا رہے ہیں۔ آم۔ نیبو جنبو

وغیرہ کے درخت جھوم رہے ہیں ۔ چنبہ ۔ کیلے ۔ بدام ۔ انار ۔ تاڑ
چھوہارے ۔ سپاری ۔ کیوڑا ۔ کیتکی ۔ گلال ۔ پھالسے ۔ لونگ ۔ داکھ
چندن ۔ پنڈر (بیر) وغیرہ کے درخت بڑی کثرت سے موجود ہیں۔
ان میں مور ۔ چکور ۔ لال ۔ فاختہ وغیرہ پرندے پھر رہے ہیں ۔ درختوں
کے سینچنے کے لیے چرس ۔ رہٹ اور ڈھینکوری (ڈھینکلی) کا انتظام
ہے۔ وغیرہ وغیرہ ۔

اس بیان میں سنجوگتا اپنے کارپرداز جھگرو ساہ کو اچار بہم
پہنچانے کے لیے خاص طور پر ہدایت دیتی ہے۔ اس کے متعلق عرض
ہے کہ آچار ایرانی الاصل لفظ ہے اور مسلمان ہندوستان میں اس کا
رواج دیتے ہیں ۔ لیکن کیا پرتھی راج کے عہد میں اس کا اس قدر رواج
ہو چکا تھا کہ ہندوؤں کے ہاں بھی عام استعمال میں آ رہا تھا ۔ مشکل سے یقین
کیا جا سکتا ہے ۔ آداب الحرب کے علاوہ نظامی کے سکندر نامے میں بھی یہ
لفظ ملتا ہے :-

ز آچار ہا ہرچہ باشد عزیز ترنج و بہ و سیب و نارنج نیز

لیکن یہ مغلوں کا زمانہ ہے جب اچار کا کثرت کے ساتھ رواج
دیکھا جاتا ہے ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں پچیس قسم کے آچار کی فہرست
مع قیمت درج کی ہے ۔ (آئین اکبری صـ۲۰۷ـ)

اسی طرح آب کشی کے جو ذرائع بتائے ہیں مثلاً چرس ڈھینکلی
وغیرہ مغلوں کے عہد میں عام رواج میں آ رہے ہیں ۔ رہٹ البتہ
آب کشی کا ایسا ذریعہ ہے جس کا رواج پنجاب کے ساتھ مخصوص تھا
اور بابر کے عہد تک ہندوستان میں رائج نہیں ہوا تھا ۔ جب

بابر آگرے میں اپنا باغ تیار کراتا ہے۔ رہٹ جس کی اشاعت لاہور و دیپال پور تک محدود تھی۔ اس باغ کی خاطر آگرے میں تیار کرایا جاتا ہے چنانچہ واقعات بابری میں آتا ہے:-

"بدستور لاہور و دیپال پور چرخ ہارا راست کردہ آبہا جاری کردند" (ص۲۱۱ طبع بمبئی)

اب یہ خیال کرنا کہ پانی پت جیسے قصبے میں پرتھی راج کے ایام میں رہٹ کا رواج تھا ہمیں ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے۔

پانی پت کے مذکورۂ بالا باغ میں مصنف کے بیان کے بموجب بادام لونگ چندن اور سپاری کے درخت موجود ہیں۔ لیکن ایسا بیان وہی شخص دے سکتا ہے جس کو درختوں کی کاشت اور خاص خاص زمینوں کے ساتھ خاص خاص درختوں کی مناسبت و غیر مناسبت کا راز معلوم نہ ہو۔ بادام ایسا درخت ہے جو ہندوستان کے شمال مغربی ممالک میں ملتا ہے مثلاً کشمیر و افغانستان و ایران وغیرہ۔ لونگ جزائر شرق الہند سے آتی ہے۔ ان میں جاوا اور بتاویا قابل ذکر ہیں صندل اور سپاری دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان درختوں کے لیے یہ تصور کرنا کہ پانی پت کے ایک باغ میں بعہد پرتھی راج موجود تھے ہمارے نزدیک بالکل بے معنی ہے۔

مصنف نے پرتھی راج کے زنانے کے ساتھ خواجہ سراؤں کو موجود بتا کر سلاطین اسلام کے زنانہ محلوں کی ایک اہم خصوصیت کو اجاگر کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

چاڑھیو چلی کھوجن کو ستھ سنگ ۔۔۔ نہی جن کے سب انگ اننگ

(چھند ۲۷ صفحہ ۱۹۹۱/۱۷۲ اکھیٹ چکھ سراپ نام پرستاو ۶۳ ویں داستان)

خواجہ سرا

خواجہ سراؤں کا دستور قدیم معلوم ہوتا ہے۔ بعض قدیم سلاطین ایران نے یونانیوں سے خراج میں خواجہ سرا وصول کیے ہیں۔ ایرانیوں سے مسلمانوں میں ان کا رواج ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے ساتھ یہ ضابطہ ہندوستان میں آیا۔ مسلمانوں کی تقلید میں راجپوت حکمرانوں نے اپنی حرم سراؤں کے لیے خواجہ سرا رکھنے شروع کر دیے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ راجپوتوں میں یہ دستور کس زمانے سے جاری ہوا۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ خواجہ سراؤں کی ضرورت اسی وقت پیش آئی ہوگی۔ جب انھوں نے پردے کی رسم اختیار کر لی ہے۔ پردہ اور خواجہ سرا لازم ملزوم ہیں۔ راجپوتانے میں تو ہمارے اپنے زمانے تک اکثر ریاستوں میں خواجہ سرا باقی تھے۔ بلکہ قدیم وضع کی ریاستوں میں تو اب بھی موجود ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک امر قابل ذکر یہ ہے کہ راجپوتوں کے یہ خواجہ سرا اکثر اوقات مسلمان ہوتے تھے۔ جودھپور میں مہاراج کی ڈیوڑھی کا سردار الماس نامی خواجہ سرا تھا جو اپنی دولتمندی کے لیے مشہور تھا۔ اس نے اپنا روپیہ خیر و رفاہ عامہ کے مصرف میں استعمال کیا۔ بلکہ مشہور ہے کہ نہرِ زبیدہ کی بھی مرمت کرائی تھی۔ اس کے انتقال کو ساٹھ ستر برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے

اگرچہ مصنف نے پرتھی راج کے محل میں پردے کے رواج

سے متعلق صاف الفاظ میں اقرار نہیں کیا ہے۔ مگر راسا میں ایسی علامات ضرور ملتی ہیں جن سے یہی قیاس ترتیب دیا جاسکتا ہے کہ اس کے زنانہ محل پردے کی پابندی سے خالی نہیں تھے۔ اسی آکھیٹک چکھ سراپ میں جیساکہ میں ابھی عرض کرچکا ہوں۔ رانیاں راجہ کے دل بہلانے کے خیال سے اسے پانی پت لے جانا چاہتی ہیں اور شکار کھیلنے کا عذر تراشتی ہیں مگر راجہ رانیوں کے ساتھ نہیں جاتا بلکہ پہلے انھیں روانہ کرتا ہے اور پھر آپ ساونتوں کے ساتھ جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بوجہ پردہ رانیوں اور ساونتوں کا اجتماع اسے منظور نہیں تھا۔

داسیاں

خواجہ سراؤں کے علاوہ پرتھی راج کے ہاں داسیوں (کنیزوں) کا بھی دستور تھا۔ جو محل کے باہر بھیتر آمدورفت رکھتی ہیں۔ اور محل کے تمام معاملات انہی کے ذریعے طے ہوتے ہیں۔ ان داسیوں کا راسا میں کئی مقام پر مذکور آتا ہے۔ تمام پیغامات انھیں کے وسیلے سے زنانے میں راجا کے پاس پہنچتے ہیں۔ سواری کے وقت وہ رانیوں کا ضروری ضروری سامان اپنے سر اور کندھوں پر لے کر پیادہ چلتی ہیں۔

ناری بھیس نر (اردابیگنی)

مغلوں کے ہاں قلماقنیوں اور اردابیگنیوں کا دستور تھا۔ جو مردانہ

لباس زیب تن کیے، پانچوں ہتھیاروں سے مسلح پہرہ چوکی اور محلات کے حفاظتی کاموں پر متعین ہوتی تھیں۔ اسی تقلید میں مصنف نے سنجوگتا کے محل کے دروازے پر "ناری بھیس نر" یعنی مردانہ لباس میں پہرہ دار عورتوں کو موجود دکھایا ہی جو لال لال ڈنڈوں سے مسلح ہیں: ؎

دِکھ دیے در بار پنگ کنور جیۂ بار ہی
ناری بھیس نروستر سستر لکری کر جھار ہی (چھند ۱۴۰ ص ۲۱ ج ۱۸ / ۲۲)

تلمیح کو صاف کرنے کے لیے ہمیں بڑی لڑائی ردبرستاو ۶۶ ویں داستان کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس میں قصہ یوں آتا ہی کہ جب دلی میں یہ خبر پھیلی کہ شہاب الدین بڑی تیاریوں کے ساتھ دہلی پر عنقریب حملہ کرنے والا ہی۔ شہر کے مہاجنوں کو اپنی غیر محفوظ حالت کا پورا پورا احساس ہوا۔ اس کے انتظام کے لیے سب کے سب مل کر سری منت نگر سیٹھ کے پاس پہنچے۔ وہ اگرچہ انھیں کوئی معقول تدبیر نہیں بتا سکا۔ مگر سب کو ساتھ لے کر گرو رام کی خدمت میں جو پرتھی راج کا پروہت تھا جا پہنچا۔ پروہت جی بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ لیکن حرف مطلب سنتے ہی لگے بہانے کرنے کہ میں تو ایک غریب برہمن ہوں۔ پوتھی پاٹھ جانتا ہوں۔ سیاسیات سے میرا کیا واسطہ اس پر مہاجنوں نے انھیں قایل کرنا چاہا کہ راج گرو ہو کر آپ کا اس قدر غیر متعلق رہنا بے حد نامناسب ہی۔ قصہ مختصر گرو جی اپنی باری میں انھیں لے کر کوی چند کے پاس آئے۔ کوی جی سارا قصہ سن کر یہ مشورہ دیتے ہیں کہ راجہ کی ڈیوڑھی پر چلنا اور عرض معروض کرنا چاہیے۔ چنانچہ تمام جماعت بہ سرکردگی کوی چند سنجوگتا دختر جی چند

راجۂ قنوج کے محل سرا کے دروازے پر پہنچتی ہے۔ مہاجن لوگ بڑے مالدار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی چوڈول پر سوار تھا اور کوئی سکھاسن پر۔ ابھی یہ لوگ مشکل سے ڈیوڑھی تک پہنچنے پائے تھے کہ وہ مردانہ لباس میں پہرہ دار عورتیں ان کی طرف بجلی کی تیزی کے ساتھ جھپٹیں اور اپنے ڈنڈے پوری طاقت کے ساتھ اُن کے سر اور کمروں پر برسانے شروع کیے۔ اُنھوں نے نہ چندکوی کا لحاظ کیا اور نہ گرو رام کی پروا کی سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا۔ گرو جی اور چندکوی تو پھر بھی مضبوط رہے۔ ڈنڈے پڑے، ماریں کھائیں مگر اپنی جگہ سے نہیں ٹلے۔ مہاجن بیچارے اپنی اپنی سواریاں اور جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگے کسی کی چوڈول رہ گئی اور کسی کی پالکی کسی کا ہاتھ ٹوٹا اور کسی کا ماتھا پھوٹا۔ اور ان چڑیلوں نے جب تک کہ شاہی محل سے انھیں دور دور تک نہیں بھگا دیا دم نہیں لیا۔

تاریخ ہند سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص بھی سنجیدگی کے ساتھ یقین نہیں کر سکتا کہ مذکورہ بالا ہتھ چھٹ پہرہ دارنیاں درحقیقت پرتھی راج کے عہد سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہماری رائے میں مصنف ان تاثرات کا چربہ اتار رہا ہے جو اس کے اپنے عہد میں مغلوں کی حرم سرا کی قلماقنیوں اور اردا بیگنیوں سے متعلق عوام میں قصے کہانیوں میں مشہور تھے۔

یہی نہیں بلکہ یہ جو مصنف نے پرتھی راج کو بیسیوں بیویوں کا شوہر بیان کیا ہے اور جس کے لیے شاعر کو ۲۵ ویں داستان (وواہ سمے) جداگانہ لکھنی پڑی۔ اس میں بھی ہمیں مسلمان سلاطین کی تقلید

کی بو آتی ہے۔ جن کے محلات میں حرموں کی کثرت اور کنیزوں کی افراط ان کی شان امارت کے قیام کے لیے ایک لازمی امر خیال کیا جاتا تھا۔

شکار

شکار ترکوں اور مسلمانوں کا ایک خاص مشغلہ ہے۔ مسلمانوں میں شکار کے بیسیوں طریقے مروج ہیں۔ خصوصاً وہ جن میں شکاری جانوروں اور پرندوں کے ذریعے سے شکار کھیلا جاتا ہے یعنی تازی کتوں۔ چیتوں۔ باز۔ جرہ باز۔ شاہین و چرغ وغیرہ کے ذریعے سے راسا میں پرتھی راج کو شکار کا بے حد شایق ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کو اس دلچسپ تفریح کا اتنا ہی لپکا ہے۔ جتنا فیروز شاہ تغلق یا جہانگیر کو ہو سکتا ہے۔ وہ شکار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ شکاری پرندوں کا بے حد شوق ہے اور شہاب الدین سے فدیے میں ہاتھی گھوڑوں کی طرح باز اور جرہ باز بھی وصول کرتا ہے۔ کیماس جدھ ۴۳ویں و داستان میں منجملہ چوبیس ہاتھیوں اور دو لاکھ ٹڑی کے سو باز بھی شاہ کے فدیے میں شامل ہیں۔ بجوّن پاتساہ جدھ ۵۴ ویں داستان میں سلطان پندرہ ہزار باز دینے پر اپنی رہائی خریدتا ہے۔

یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں کہ اگر ہندو مذہبی زندگی کا عنصر پرتھی راج کی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پرتھی راج میں اور قرون وسطیٰ کے کسی مسلمان والی کی زندگی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ میں اس کے شکار کے بعض واقعات یہاں عرض کرتا ہوں:-

(۱) آکھیٹک بیر بردان چھٹی داستان میں دیکھا جاتا ہی کہ پرتھی راج ایک مرتبہ شکار کو جاتا ہی۔ اس کے ساتھ ایک ہزار شکاری کتے۔ ایک سو چیتے اور ایک سو شکاری ہرن ہیں۔ اس لوازمے کے ساتھ وہ ایک گھنے جنگل میں شکار کے لیے گھس جاتا ہی (چھند ۱۱ - ۱۳ ص ۳۷۰ / ح ۲)

(۲) آکھیٹک چوک برنن دسویں داستان میں پرتھی راج کھٹو بن میں شکار کو جاتا ہی۔ اس کے ساتھ پانسو پیدل۔ پانسو شہ‌سوار۔ ایک ہزار کتے۔ پانسو ہمراہی پچپن چیتے اور بے تعداد باز اور بہری تھے۔ (چھند ۱۳ ص ۴۲۸ / ح ۴)

(۳) بھومی سپن پرستاو۔ سترھویں داستان۔ پرتھی راج ایک مرتبہ شکار کو جاتا ہی۔ ہانکا کرایا جاتا ہی۔ ایک شیر سامنے آتا ہی۔ راجہ تیر مارتا ہی مگر خطا جاتا ہی۔ شیر طیش میں آکر جھپٹتا ہی۔ جب قریب آچکتا ہی۔ راجہ تلوار کے ایک ہی وار میں اس کو ہلاک کرڈالتا ہی۔ (چھند ۳ ص ۵۰۶ / ح ۲)

(۴) جیت راو جدھ ۳۴ ویں داستان۔ دلی پہنچنے کے ڈھائی برس بعد پرتھی راج کھٹو بن میں شکار کو جاتا ہی اور سنیت راو کھتری اس کی اطلاع شہاب الدین کو بھیج دیتا ہی۔ اس دفعہ راجہ کے ساتھ ایک سو بیس کتے۔ بیالیس سیاہ گوش اور ایک سو ہرن تھے۔

(چھند ۳ ص ۱۰۳۲ / ح ۹)

(۵) دھن کتھا چوبیسویں داستان:۔ پرتھی راج ایک دن سنگار ہار مشہور ہاتھی پر سوار ہوکر شکار کو گیا۔ کنہ بھی ساتھ ہولیا۔ دونوں بہادر گھنے جنگل میں شکار کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ اتنے میں ایک

بڑبان نے آکر خبر دی کہ مہاراج یہاں سے قریب ہی ایک زبردست سوّر موجود ہے۔ راجہ نے اس کے گھیرنے کا حکم دیا اور خود بھی اسی طرف بڑھا۔ جب سوّر نے دیکھا کہ چاروں طرف سے گھر چکا ہے۔ ہنکارتا ہوا ایک سمت کو ہولیا۔ راجہ نے موقع پاتے ہی فوراً اسے تیر سے مار لیا۔ اس اثنا میں ایک شیر کی خبر آئی۔ راجا نے کہا کہ میں تو اب شیر کو مارے بغیر یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ اتنا کہہ کر شیر کی طرف چل دیا۔ دیکھا کہ ندی کے کنارے ایک خونخوار شیر ایک بیل کو مار کر اس کا گوشت کھا رہا ہے۔ راجا نے ہاکے کا حکم دیا اور مہاوت نے سنگار ہار کو اسی طرف بڑھایا۔ شور و غل کی آواز سن کر شیر بڑی تیزی کے ساتھ راجا پر آیا۔ راجا نے تیر چلایا جو خطا گیا۔ خواصی میں کرنبھ رائے بیٹھا تھا اس نے شیر کے ایک تلوار ایسی ماری کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

(چھند ۳۳۵۔۔ ۳۵۰ ح ۲۲۹/۷ ص)

(۶) ششیوورتا ورنن پرشاد ۲۵ ویں داستان:- منقول ہے کہ پرتھی راج ماگھ بدی منگل وار کو اپنے سرداروں کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شکار کو چلا۔ بڑبان نے آکر ایک سوّر کا پتہ دیا۔ اور عرض کی کہ راجا پیدل چلے۔ راجا فوراً گھوڑے پر سے اتر گیا اور تپک کندھے پر رکھ کر سوّر کی تلاش میں بڑھا۔ جب نظر آیا فوراً مار لیا۔ اور بڑبان کو انعام و اکرام دیا۔ سب طرف سے راجا کے نشانے کی تحسین و آفرین ہونے لگی اور راجا نے سندر باڑی میں آکر قیام کیا۔ (چھند ۵۰ ص ۲۶۶/۷)

میں ان بیانات پر اکتفا کرتا ہوں۔ تلاش سے شکار کے اور

موتے پرتھی راج کی ان داستانوں میں ملیں گے۔

باغ

دلی ورنن ۵۹ دیں داستان میں شاعر نے دریاے جمنا کے نگمبودھ گھاٹ کے ایک باغ کا بیان دیا ہی۔ جس میں اس کے میوہ دار درختوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہی۔ میں سب سے پہلے اصل اقتباس کتاب سے لےکر یہاں درج کرتا ہوں۔ اس کا وزن رجز مثمن مخبون (مفاعلن چار بار) ہی:-

سُدھن نگمبود ھین، جمن تٹھ سودھین　　تہاں سو باگ برجھین، بنے سو گل آبین
ہمیرتا سو باسین پھلن سو پھول راین　　بِرکھ بیلی ڈنبرن، سرنگ پان اترن
جو کیسرن کُمن کُمن، مدھو اس تن بھرن　　انار داکھ بلون، سو چھتر تی ڈھلون
سری کھنڈ تھنڈو آبین (کلدا) گلاب بارا پھول نیں　　جو پکین کند ٹھنٹھنین کھجوری کھوری ابین
سوان نناس جیرن، ستو تین جنبھیرن　　اکھوٹ سیو دابین، اوال بیلی سیابین
سری پھلن نرنگین، سبد سوادھتین　　چونت مورو اکین ہنو سنگیت سکاکین
اُپم گت راجین ہنو کی اندر سابین　　. . . . .

اوڈی سو داس گلال اتی۔ اوڈی عبیر اسمان
منہو بیان عنبر سرت۔ بجی تمتی سُرگان

(چھند ۵ - ۱۲ صـ ۱۵۵۴ - ۱۴ ج ۱۴)

اس اقتباس میں ان درختوں وغیرہ کے نام دیے گئے ہیں:-

باغ۔ گل۔ کیسر۔ کمن کمن۔ انار۔ داکھ۔ سری کھنڈ۔ گلاب

چنپیہ - کدم - کھجور - آم - انناس - جیری (زیرہ) ستوت (شہتوت) جنبھیری اکھوٹ (اخروٹ) سیو (سیب) وام (بادام) سری پھل (ناریل) نرنگی (نارنگی) گلال - عبیر - آسمان - عنبر - ان میں باغ - گل - گلاب - انار - شہتوت نارنگی عبیر عنبر - آسمان مسلمانی الفاظ ہیں - اور یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جس طرح پرتھی راج کے عہد کی زبان مسلمانی الفاظ سے اس قدر مخلوط متصور نہیں ہو سکتی - اسی طرح یہ بعض درخت جو مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں آئے ہیں - ایسے قدیم زمانے میں دلی کے ایک باغ میں کیونکر موجود مانے جا سکتے ہیں - بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں باغات کا دستور ہی نہیں تھا -

---

زعفران

مصنف سب سے پہلے کیسر (زعفران) کا ذکر کرتا ہے - اس کی ناواقفیت ملاحظہ ہو - اس کے نزدیک زعفران بھی مولی گاجر کی طرح ہر باغ اور ہر باڑی میں لگائی جا سکتی ہے - حالانکہ تمام ہندوستان میں کشمیر کے سوا اور کسی مقام پر پیدا نہیں ہوتی - اور وہاں بھی ایک خاص زمین میں ہوتی ہے -

جس پھول کو ایرانی 'گل' کہتے ہیں - اہل ہند اسے 'گلاب' کہتے ہیں - لیکن یہ ہندوستانی تصرف ہے - اس بدعت کے لیے سوائے استعمال ہند کے عذر پیش کرنے کے ہمیں کوئی اور معقول وجہ معلوم نہیں - مسلمانوں کو ہندوستان میں آباد ہو کر ایسے مختلف فیہ ناموں کے وضع کرنے اور

رواج عام میں لانے کے لیے بھی تو وقت درکار ہے۔ یہی حالت نارنگی کی ہے۔ یہاں شاعر نے اس لفظ کو نرنگی بہ تخفیف الف لکھا ہے۔ لیکن اور موقع پر الف کے ساتھ نارنگی لکھ رہا ہے۔ ایرانی اسے نارنگ کہتے ہیں جس کی معرب شکل نارنج ہے۔ نارنگ کے آخر میں 'ی' کا اضافہ ہندوستانی اپج ہے۔ اس 'ی' کو خواہ بقاعدۂ فارسی زاید کہا جائے۔ یا بہ قاعدۂ ہندی یائے تانیث مانا جائے مگر اس کے اضافے کی ذمہ داری بحق استعمال ہند عاید ہوتی ہے۔

انّناس

انناس کے متعلق یاد رہے کہ اگرچہ آئین اکبری میں وہ میووں کی فہرست میں شامل ہے۔ مگر ہندوستان میں تازہ وارد ہے۔ پرتگالی دسویں صدی ہجری میں باہر سے یہاں لائے ہیں۔ ابوالفضل انناس کو کٹھل سفری کہتا ہے۔ کیونکہ اس کے پودے گملوں میں رکھ کر سفر میں بآسانی لے جائے جا سکتے ہیں۔ وہ اس کے بیان میں کہتا ہے کہ انناس شکل اور رنگت میں مستطیل نارنگی کی مانند اور ذائقہ اور خوشبو میں آم کی طرح ہے۔ پھل ڈنڈی کی جڑ میں لگتا ہے جس پر چند پتے نکلتے ہیں جب میوہ توڑ لیا جاتا ہے۔ پتے اتار کر زمین پر الگ الگ لگا دیتے ہیں اور یہی پتے تخم کا کام دیتے ہیں۔ درخت صرف ایک بار پھل دیتا ہے۔ جس میں ایک ہی پھل آتا ہے (آئین اکبری صفحہ) اکبر کے عہد میں انناس اس قدر قلت کے ساتھ معلوم تھا کہ مختصر نگار ابوالفضل

کو بطور اطلاع جدید اس کی صراحت دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جہانگیر بھی اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ کہ اناس ان سواحلی علاقوں سے آتا ہے۔ جو فرنگیوں (پرتگالیوں) کے قبضے میں ہیں۔ (توزک ص۳۰) ادھر پرتگالی بیانگ دہل کہتے ہیں کہ اناس ان درختوں میں سے ہے جن کا ہمارے ذریعے سے ہندوستان میں رواج ہوا ہے۔ ان امور کو جاننے کے بعد ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ جب ہم راسا کے مصنف کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ۔ پرتھی راج کے عہد میں جمنا کے کنارے نگمبودھ باغ میں اناس کا درخت موجود تھا۔

درختوں کے جس قدر نام اوپر گزرے ہیں۔ بہت ہی خفیف فرق کے ساتھ سب کے سب آئین اکبری میں ملتے ہیں۔ ان کا حوالہ ذیل میں درج ہے:-

گل ص۸۸ و ص۸۹ - زعفران ص۹۶ - گل زعفران ص۱۰۹ - انار ص۷۶ - انگور ص۷۴ - سرکھنڈی ص۱۰۱ ص۱۱۱ - چنبہ ص۹۵ ص۱۰۸ - کدم ص۱۰۰ (راسا میں کدھمب ہے) - کھجور ص۸۵ - آنب ص۷۴ - انبہ ص۷۳ (راسا میں بحالت جمع انبین ہے)۔ اناس ص۷۷ ص۷۸ - توت ص۷۸ (راسا میں سنتوت آیا ہے جو شہتوت کی بگڑی شکل ہے) جنبھیری ص۷۴ - اخروٹ ص۷۳ (راسا میں اس موقع پر اکھوٹ ہے۔ مگر دوسرے موقع پر صاف اکھروٹ لکھا ہے) سیب ص۷۶ (راسا میں سیو ہے)۔ امرت پھل ص۷۸ - نارنگی ص۱۰۸ - گلال ص۹۸ - شبیر ص۹۵ - شنفر ص۹۶ -

راسا اور آئین اکبری کی فہرستوں میں وہ فرق جو بلحاظ اختلاف زمانہ ان میں ہونا چاہیے۔ بالکل مفقود ہے۔ بلکہ ان کا توافق حیرت انگیز ہے

کھانے

آکھیٹ چکھ سراپ ۶۳ ویں داستان میں پانی پت کے مقام پر سنجوگتا ایک بھاری دعوت دیتی ہے۔ مصنف نے اس موقع پر مختلف کھانوں۔ پکوانوں و دیگر اشیاء کے نام دیے ہیں جو میں یہاں درج کرتا ہوں :۔

پترا ول (پاتل) دونے۔ پوپ (روٹی) پوری۔ سکھ پوری۔ لچئین (لوچئی) پیٹھی کی بھری پکوری۔ گھیور۔ جلیبنی (جلیبی) پھینی (فینی) سکرپارے (شکرپارے) سیو سنگھارے (سنگھاڑے کے سیو) کسار۔ گندورن (گندورڑے)۔ کھرما (خرما) پنڈ کھجور۔ بہی۔ اکھروٹ (اخروٹ)۔ ناسپاتی (ناشپاتی)۔ گرُ (گڑ)۔ سکر (شکر)۔ پاپر (پاپڑ)۔ کند۔ میدا کے پیدا (میدے کے پیڑے)۔ مکرند۔ کنج (نیلوفر)۔ چنپک (چنپہ) چنبیلی۔ کرنی (کرنا)۔ کنیر۔ بکلن (مولسری) مچکند۔ کیورا (کیوڑا) کیتکی : جوہیں (جوہی)۔

چرن

چنا۔ چرونجی۔ چونرا (چونلا) کیسرو۔ کرہری۔ گوندگتا۔ کیور۔ کھیرائلی کھیر تاکی۔ بین۔ کرنا۔ کردندا۔ کندورے (کندوری) نیبو۔ نارنگی۔ناپاتی امرتاں (امرتیاں) کیتھ (کیت) وجورین (بجوڑے) کڈھی (کڑھی) پکوری (پکوڑی) بری مونگ ری (مونگ کی بڑیں) میداں کی روٹی (میدے کی روٹی) مانڈہ۔ روٹین مسرین (مصری کی روٹیں) سالن

(سالن)۔ مارو۔ بیگن۔ برے (بڑے) سیم۔ کنکورا (گکوڑا) کریلا۔ مرلیا بھینڈا (بھنڈی) رواسن پھری (روانسا پھلی) چھونکری۔ لیدھری۔ کلی کچنار۔ باکل (باکلا؟)۔ بجورا (بجوڑا)۔ رائیتو (رایتا)۔ لونگ۔ مرچیں۔ دھنا۔ سونٹھی (سونٹھ) رائی۔ دہی۔

سرسوں۔ سوا۔ ساک (ساگ) بتھو (بتھوا)۔ ڈرساگ۔ چنک (چنا) چوک (چوکا) دِود اُرو (دیودار) نیب (نیم)۔ موری (مور) پاشش چنا۔ ددھی (دہی) کیسر۔ مٹھا۔ جیر (زیرہ) دارم (انار)۔ داکھ (انگور) کھارک۔ چھہارا۔

مصنف نے ان کھانوں کا نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس سے میں نے صرف ناموں پر قناعت کی ہے۔ مگر اس تفصیل میں ایسا عنصر بھی تو پایا جاتا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ تمدنی حالت خالص ہندو عہد سے جیسا کہ پرتھی راج کا زمانہ تھا۔ تعلق نہیں رکھتی بلکہ ایسے عہد سے جب ہندو مسلمان عرصے تک ساتھ ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے کی تہذیب و مدنیت سے متاثر ہو کر ملی جلی زندگی کے عادی ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے آثار ہم الفاظ شکر۔ شکر پارے۔ جلیبی۔ خرما۔ نارنگی بہی۔ ناشپاتی۔ مصری۔ میدہ وغیرہ میں دیکھتے ہیں۔ خالص ہندو تمدن میں ان اشیا کا تصور بھی نہیں آسکتا۔ مٹھائیاں اکثر و بیشتر مسلمانی الاصل ہیں جلیبی جس کی قدیم شکل زلابی۔ زلیبا و زلیبیا ہے مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کے اشعار میں زلیبیا آتا ہے۔ چنانچہ: ؎

نان کشکی اگر بیابم نیز راست گوئی زلیبیا باشد

شکر پارہ تو خالص مسلمانی نام ہے۔ مصری نبات وطبرزد کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کی نبات کی ابتدا مصر سے ہوئی۔ اس لیے ہندوستان میں اس کا نام مصری ہی رکھ دیا گیا۔ خربا بھی اور ناشپاتی فارسی ہیں۔ مگر ہندوستان میں ان کا استعمال مسلمانوں کی آمد سے قبل تصور میں نہیں آسکتا۔

جب ہم اس فہرست پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ امر ذہن نشین ہوتا ہے۔ کہ ان الفاظ میں کوئی ایسی ندرت نہیں جو انھیں ٹھیٹ پرتھی راج کے عہد کے ساتھ وابستہ کر سکے۔ آج بھی یہ تمام چیزیں ہماری ضروریات زندگی میں داخل ہیں۔ اور تقریباً اسی طرح بولی جاتی ہیں۔ جیسی کہ فہرست بالا میں۔

اس فہرست میں بعض الفاظ کے آخر میں نون کے اضافے کی بنا پر جو جمع و اضافت کے لیے مستعمل ہے۔ مثلاً جوہین (جو ہی)، رڈین (روٹی)، گندورن (گندوڑے)، سالنن (سالن کا)، مصرین (مصری کا) وغیرہ کی نامانوس شکلوں سے ہمیں مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔

کایستھ اور کھتری

کایستھ اور کھتری ہندوؤں میں وہ قومیں ہیں جنھوں نے اکبر کے عہد سے ٹوڈرمل کے اثرات میں فارسی سیکھنا اور اہل قلم کے زمرے میں ملازم ہونا شروع کیا۔ ایک روایت یہ تبدیلی سلطان سکندر لودھی کے زمانے کی طرف منسوب کرتی ہے۔ اور ڈونگرمل کا نام پہلے ہندو

شاعر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ مگر دفاتر پر ہندوؤں کا دخل اور اقتدار اکبری عہد ہی سے شروع ہوتا ہے۔

راسا کے مصنف کے سامنے چونکہ عہد مغلیہ کی زندگی ہے۔ اس لیے وہ کایستھوں اور کھتریوں کو شہاب الدین کے زمانے میں بھی جب کہ اس کا دار السلطنت غزنین ہے۔ نہ اگرہ اور دلّی حسب دستور مغل مسلمانی ملازمت میں تصور کرتا ہے۔ جس طرح اکبر ٹوڈر مل اور بیربر کو اور شاہجہاں چندر بھان کو بعض سیاسی مسائل حل کرنے کے لیے ہندو راجگان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ اسی طرح تتار خاں شہاب الدین کا وزیر لورک رائے کھتری کو غزنین سے دلّی پرتھی راج کے پاس بھیجتا ہے۔ یہ لورک رائے ایک سے زیادہ مرتبہ غزنین سے دلّی سفارت پر آیا ہے۔ (دھن کتھا اور پہاڑ رائے سمے) نیت راؤ ایک اور کھتری ہے جو اگرچہ بظاہر شہاب الدین کا ملازم ہے۔ موقع پر پرتھی راج کے ساتھ بھی ساز باز کر لیتا ہے۔ (اننگ پال سمے) دھرمائن کایستھ ہے۔ جو دہلی ہی میں مقیم ہے۔ مگر یہاں کی تمام اطلاع شہاب الدین کو غزنین بھیجتا رہتا ہے۔ گویا بادشاہ کا وکیل ہے۔ دھرمائن کا ذکر متعدد داستانوں میں آتا ہے۔ مثلاً دھن کتھا۔ پہاڑ رائے سمے۔ درگا کیدار سمیو۔ بڑی لڑائی رو پرستاو وغیرہ۔ ایک امر عجیب ہے کہ شہاب الدین کے یہ ہندو ملازم خواہ وہ کھتری ہوں۔ خواہ کایستھ سب کے سب جاسوسی پیشہ کرتے ہیں۔ اور دربار دہلی کی خبریں شاہ کے پاس غزنین بھیجتے رہتے ہیں۔

بھاٹ

ایک اور لطف کی بات سنیے۔ جس طرح چند پرتھی راج کا بھاٹ ہی درگا کیدار شہاب الدین کا بھاٹ ہی۔ درگا علم وفضیلت میں کوی چند پر غالب آنے کی مراد دیوی سے مانگتا ہی۔ دیوی جواب دیتی ہو کہ تو اوروں پر غالب آسکتا ہی۔ مگر چند پر غالب نہیں آسکتا۔ اس پر درگا نے التماس کی کہ میں پرتھی راج سے ملنا چاہتا ہوں۔ دیوی نے فرمایا۔کہ ہاں تیری یہ آرزو قبول کی جاسکتی ہی۔ دوسرے دن درگا شاہ کے دربار میں جاکر رخصت مانگتا ہی۔ تتار خاں کہتا ہی کہ دشمن کے گھر جانا قرین مصلحت نہیں۔ خدا جانے کیا افتاد پڑے۔ بادشاہ نے فرمایا کوی چند کو دیکھو نا۔ وہ کبھی غزنین نہیں آیا۔ درگا بھاٹ لاجواب ہوگیا۔ مگر بادشاہ نے اس کی دل شکنی کے خیال سے اجازت دے دی۔ درگا غزنین سے چل کر ڈھائی مہینے میں پانی پت پہنچا۔ جہاں پرتھی راج شکار کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔ راجا نے اُسے عزت کی جگہ بٹھایا اور بڑی دلجوئی کی۔ درگا نے آتے ہی سحر و طلسم میں چند سے مقابلے کی ٹھان لی۔ سب سے پہلے اس نے سحر کے زور سے مٹی کے برتن سے آگ کا شعلہ نکالا۔ چند نے جواب میں ایک گھوڑے کے منہ سے اسیر باد (سلام) کہلوایا۔ اس پر درگا نے پتھر کی ایک چٹان جادو سے متحرک کی۔ اور اس میں ایک انگوٹھی غایب کردی۔ کوی چند نے اپنے علم کے زور سے چٹان کو پانی بناکر بہادیا۔ اور انگوٹھی نکال لی۔ اس کے بعد درگا اور اور عجائبات دکھاتا ہی۔ اور چند ان کے توڑ کرتا

ہی۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوتا ہی کہ چند کوی ان فنون میں اپنے حریف پر فضیلت رکھتا ہی۔ پرتھی راج پانچ روز تک کیدار کو مہمان رکھتا ہی اور بہت سا انعام و اکرام دے کر رخصت کرتا ہی (درگا کیدار سمیو ۵۸ ویں داستان)

مادھو بھاٹ شہاب الدین کا ایک اور بھاٹ ہی۔ اس کے نام پر اُنیسویں داستان ہی۔ یہ شخص اکثر علوم و فنون میں باکمال تھا۔ ایک مرتبہ دلی آیا اور ایک مہینے تک رہا۔ دلی اس کو بہت پسند آئی جاسوسی کے خیال سے پرتھی راج کے دربار میں بھی آنے جانے لگا اور اپنے کمال کا اہلِ دربار پر خوب سکہ جمایا۔ پرتھی راج کی داد و دہش نے اسے مالا مال کر دیا۔

مسلمانوں میں بھاٹ رکھنے کا دستور اسی عہد سے رواج پاسکتا ہی جب وہ ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد اس ملک کے رسم و رواج کے پابند ہونے لگے ہیں۔ یہ خیال کہ شہاب الدین کے پاس درحقیقت ہندو بھاٹ تھے۔ بے حد مضحکہ خیز اور بے بنیاد ہی۔ مگر راسا کا مصنف جس زمانے میں رہتا بستا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان ایک دوسرے سے اثر پذیر ہو کر ایک مخلوط قسم کی زندگی کے عادی ہو گئے تھے جس میں ہندو مسلمانوں کے لیے اور مسلمان ہندوؤں کے لیے لازم و ملزوم بن گئے تھے اور ایک کا دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ راسا کا مصنف اپنے عہد کی زندگی اور اس کے اوضاع کا اس قدر عادی ہی کہ اس کے قلم سے بے ساختہ وہی خط و خال رقم پذیر ہوتے ہیں جو مغلیہ اور اس سے قبل کے زمانے کی ہندوستانی زندگی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً ہیجم کمار کوی چند کے سامنے راجا جے چند

والیٔ قنوج کی تعریف میں یہ دوہا کہتا ہے: ~

بیری کاٹن راج نج۔ ڈنڈھرن پردھان سیوا مانن بھج وین۔ ہندو مسلمان

(چھند ۴۶۹ صفحہ ۱۲۴۷ تنوج سمے ۶۱ویں داستان)

بھلا جے چند کے زمانے میں قنوج کی قلمرو میں مسلمان کہاں آباد تھے جو اس کی تعظیم و تکریم میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو سکتے۔ مگر مصنف کے زمانے میں یہ قول بالکل صادق آتا ہے۔ جب ہندو مسلمانوں کی اور مسلمان ہندوؤں کی رعیت بن کر رہتے تھے۔

مسلمان ہندوستان میں بحیثیت فاتح داخل ہوئے۔ مفتوحین شروع شروع میں تو ان سے غیر متعلق رہے مگر جب انھیں معلوم ہوگیا کہ ان کی آمد ہنگامی نہیں۔ نہ یہ لوگ اس سرزمین سے ٹلنا چاہتے حسب تقاضائے وقت صلح و آشتی کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ خود مختار راجاؤں نے تعلقات قایم کرلیے۔ کمزور رئیس اپنے طاقت ور ہمسایے کے خلاف ان سے امداد کے جویا ہوئے۔ جوں جوں مسلمانوں کو ہندوستان میں رہتے رہتے زیادہ زمانہ گزرتا گیا۔ یہ تعلقات زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتے گئے۔ قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان اپنی تاریخ میں ایسے متعدد واقعات کا آئینہ دار ہے۔ مغل بابر کے خلاف رانا سنگرام عرف رانا سانگا اور حسن خاں میواتی باہم متحد ہوکر ایک ہی محاذ پر جنگ کرتے ہیں۔ اسی بابر کے مقابلے میں راجا بکرماجیت ابراہیم لودھی کے ساتھ پانی پت کے میدان میں مارا جاتا ہے۔ سلاطین گجرات و مالوہ کی تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں ایک ہندو راجا کی خاطر یہ طاقت ور سلطنتیں ایک دوسرے سے دست و گریبان

ہوتیں۔ ان میں مذہبی اختلاف جنگ و صلح کا محرک نہیں تھا۔ جیسا کہ آج کل کے مورخ ہمیں یقین دلاتے ہیں۔ بلکہ اغراض و مقاصد کا اتحاد یہی خصوصیت راسا کے صفحات میں نمودار ہے۔

اٹھائیسویں داستان میں اننگ پال پرتھی راج سے اپنے ملک کے استرداد کا خواہشمند ہے۔ وہ خود فوج کشی کرکے پرتھی راج سے لڑتا ہے۔ مگر شکست کھاتا ہے۔ بالآخر مادھو بھاٹ کو شہاب الدین کے پاس غزنیں بہ غرض استمداد بھیجتا ہے۔ شہاب الدین ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کی امداد کو آتا ہے۔ اور اننگ پال کے شریک ہوجاتا ہے۔ اتحادی پرتھی راج سے جنگ کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے اور یہ بدقسمتی شہاب الدین کے لیے راسا کے صفحات میں نہایت عام ہے۔ سلطان میدان جنگ میں گرفتار ہوجاتا ہے اور اتحادیوں کو شکست ہوجاتی ہے۔

چھتیسویں داستان ہنساوتی وواہ میں چندیری کا راجا پنچائن شہاب الدین سے رن تھنب کے راجا کے خلاف فوجی امداد مانگتا ہے۔ اور شہاب الدین اپنا لشکر اس کی امداد کے لیے بسرکردگی نوری حجاب اور کیلی خاں روانہ کرتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کی شادی غمی و دیگر دستور و رسوم میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اکیسویں داستان پرتھا ویاہ ورنن میں ملتی ہے۔ اس داستان کی رو سے پرتھی راج کی بہن پرتھا بائی راول سمر سنگھ والیٔ چتوڑ سے بیاہی جاتی ہے۔ اس موقع پر شہاب الدین بھی دولھا دلھن کے لیے تحفے بھیجتا ہے۔ جن میں علاوہ دیگر مال و متاع کے پچاس ہاتھی۔ سو گھوڑے اور ایک

سو باندیاں شامل ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تحفے فی الحقیقت شہاب الدین نے راول جی کو شادی کے موقع پر دیے تھے۔ تاریخ کی رو سے راول سمر سنگھ اور پرتھا کی شادی ناممکن ہے کیونکہ راول مذکور پرتھی راج اور شہاب الدین کے زمانے سے ایک صدی بعد ہوتا ہے لیکن مصنف نے شہاب الدین کا جو تحفے دینا بیان کیا ہے تو درحقیقت وہ اس رواج کو اجاگر کر رہا ہے۔ جو اس کے اپنے عہد میں ہندو اور مسلمان باہمی تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ برتتے تھے۔

مسلمانی الفاظ

راسا میں مسلمانی الفاظ پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مصنف فارسی زبان کی مبادیات سے ضرور واقف ہے۔ مسلمانوں کے بعض مذہبی معاملات سے بھی اس کو آگاہی ہے۔ اسے معلوم ہے۔ کہ ان کی مذہبی کتاب کا نام قرآن ہے۔ جسے مصحف بھی کہتے ہیں۔ اس کے تیس پارے ہیں۔ ان میں خدا کے نیک بندے بھی ہوتے ہیں۔ جو تیسوں دن نمازیں پڑھتے ہیں۔ اور غیر شرعی امور کے قریب نہیں جاتے :-

حق احق وست جن نہیں کاج تینج بیس پنج دن کریں نواج

(چھند ۲۴ صفحہ ۵۲۱ سلکھ جدھ تیرھویں داستان)

پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔ اور سیپارے تورات دن پڑھتے رہتے ہیں :-

نیں نیاج سائیں سے پنج بکت (وقت) سیپارے تیس پڑھیں دِن رُت

(چھند ۷۹ صفحہ ۲۳/۱۴ حسین کتھا نویں داستان)

تسبیح کا استعمال مستحسن سمجھتے ہیں۔ پیر کے چادر چڑھاتے ہیں۔ مُلّا اذان دیتا ہے۔ قاضی نماز پڑھاتا ہے۔ جو لوگ مذہب کے لیے مارے جاتے ہیں شہید کہلاتے ہیں اور زندہ جاوید ہیں۔ گوری کی وجہ تسمیہ دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گور یعنی قبر کے معنوں سے واقف ہے۔ مسلمانوں کی جنگی اصطلاحات و اسلحہ سے کافی آشنا معلوم ہوتا ہے مثلاً آتش۔ سلح۔ تیغ۔ زرہ۔ کمان۔ تیر۔ ترکش۔ گرز۔ تفک۔ ہدف۔ نشان چوگان۔ حشم۔ سوار۔ لگام۔ پیلوان (پیلپان) عراقی۔ تازی۔ نوبت۔ شہنائی۔ نفیری۔ چنگ۔ دمامہ وغیرہ۔ الفاظ تیر و تیغ اس کے ہاں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اسی طرح اعداد میں سہس کے ساتھ ہزار بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ باغ و باغبان کے لیے انہی فارسی الفاظ باغ و باغبان پر قناعت کرتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے مسلمانی الفاظ کافی تعداد میں لا سکتا ہے۔ یہ مثالیں ملاحظہ ہوں :ـــ

جا سو یہاں سہاب دین سلتان پیگمبر پرور دگار الہ کریم کوار (کبار)
سلتان جلال سکندر جایا سلتان شہاب دین الہ آیا

(چھند ۱۴۱ صفحہ ۲۶/۱۸ ۲۱ بڑی لڑائی)

دیگر ـــ

میں نفیر سلتان آپ کہی پیچھے قاضی بہت بھاکھ جو کہے ہوئے حاجی کنفار
جو امید جیسے ہوئی راج دوئی اللہ نبد کوئی گمان جن کرد کہے کا یا یہ گندی

(چھند ۷۶۶ صفحہ ۲۲۳/۱۹ بڑی لڑائی)

اس رزمیہ کے بعض الفاظ سے پایا جاتا ہے۔ کہ وہ استعمال ہند کے ذیل میں آتے ہیں۔ استعمال ہند سے مراد غیر ہندی الفاظ کی وہ خاص صورت ہے جو ہندوستان میں اختیار کر لی گئی ہے۔ مثلاً حمائل کو جمیل کہا جاتا ہے۔ (چھند ۲۹ ص ۶۶۶ ح ۶) اور پالان کو پلان (چھند ۶۵ ص ۵۸۵ ح ۸) وقت کا بخت بن گیا ہے۔ (چھند ۷ ۹ ص ۴۰۳ ح ۴) اسی طرح رسالت رسال (چھند ۹ ۱۴۹ ص ۷۴۲ ح ۵) یعنی سوغات بن گیا۔ اور خواص حجام کے معنوں میں آیا۔ (چھند ۸۰ ۵ ص ۵۸۵ ح ۹) اسی طرح نماز کو 'نیاج' کی شکل میں بدل دیا ہے۔ کاغذ 'گگد' بن گیا ہے۔ چھند ۸۵ ص ۹۳ ح ۸)

بعض ترکیبیں ایسی بھی ملتی ہیں، جو نیمے ہندی اور نیمے فارسی ہیں۔ مثلاً پلنگ پوش (چھند ۴ ۵ ص ۵۵۵ ح ۶) اسی طرح جم جور ہے جس میں جم (موت) ہندی اور جور فارسی زور کی بگڑی شکل ہے اور جور کا بھی اسی پر قیاس کیا جائے۔ بہر حال یہ ترکیبیں اس عقیدے کی تائید نہیں کرتیں کہ یہ رزمیہ پرتھی راج کے عہد کی تالیف ہو سکتا ہے۔ بعض وقت ایسے فارسی مرکبات بھی ملتے ہیں، جیسے سرتاج (چھند ۱ ص ۵۱۱ ح ۱۳) نیل ماہی۔ (چھند ۴ ۶ ۵ ص ۱۶۲ ح ۱۴) یعنی دریائے نیل کی مچھلی۔ جنگلی جوان (چھند ۳ ص ۱۴۵۰ ح ۹) زرد وزن (زردوز) اور زرکشی۔ (چھند ۵۰ ص ۸۴۷ ح ۶) کسادہ (کشادہ کشادہ

(چھند ۱۲۶ ص ۹۰ ح ۸) اور راہ بے راہ (چھند ۹۵ ص ۲۱۴ ح ۴)

کوچ بر کوچ۔ کوچ در کوچ اور کوچا کوچ ایک فارسی روز ہے۔ مصنف نے بادنیٰ تغیر اس پر تصرف کر لیا ہے۔ مثال سے چلا کوچ پر کوچ گھڑی (چھند ۷ ۲۹ ص ۲۱۲ ح ۷) دیگر؛ - در کوچ

کورچ اتریے سندھ (چھند ۱۴۵ صفحہ ۶۱۸ ح ۶) دیگر: ؎

اتی کوچہ کورچ دلن کھریں جل پنتھ جاے سوم ترین

(چھند ۱۶۵ صفحہ ۶۲۱ ح ۶)

ذیل کے چھند میں کھیت پڑنا، کھیت رہنے کے مفہوم میں آیا ہے: ؎

کھیت پرے تتار ساہ گوری گی ستیا

(چھند ۱۹۲ صفحہ ۶۲۵ ح ۶)

سر دھننا ایک اور محاورہ ہے۔ چنانچہ: ؎

سر دھنت پتی ساہ دھاہ سنی سیتا سقی

(چھند ۲۹ صفحہ ۹۵۱ ح ۹)

"وہ پانی ملتان گیا"

وہ پانی ملتان گیا۔ ایک ضرب المثل ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اب وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ استاد ذوق ؎

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تاب حسن اے ذوق! پانی اب تو وہ ملتان بہ گیا

پرتھی راج راسا میں یہی ضرب المثل یوں آئی ہے ؎

چامر چھتر رکھت تکھت لینو سرتانی اوترو سے ساہاب گیو ملتانہ پانی

(چھند ۵ ۲۲ صفحہ ۲۴، ح ۷)

اس ضرب المثل کی تشریح میں یہ کہانی بیان کی جاتی ہے۔

ایک دن گورکھ ناتھ ریداس بھگت کے پاس آیا۔ پیاس لگ رہی تھی۔ پانی مانگا۔ ریداس پانی لینے گیا۔ اس وقت گورکھ ناتھ کو خیال آیا۔ کہ ریداس تو ذات کا چمار ہے۔ میں اس کے ہاتھ کا پانی کیونکر پی سکتا ہوں۔ جب ریداس پانی لایا۔ اس نے اپنے تو نبے

میں بھروالیا ۔ مگر پیا نہیں ۔ إدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور رخصت ہوا
پھر کبیر کے پاس جا بیٹھا ۔ اور اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوگیا۔
اس وقت کبیر کی بیٹی کمالی آئی ۔ اور وہ پانی اٹھاکر پی گئی ۔ پیتے ہی
اکاس لوک ۔ مرت لوک اور پتال لوک کے تمام اسرار اس پر منکشف
ہوگئے ۔ جب گورکھ ناتھ کو معلوم ہوا کہ اس پانی کے پینے سے
کمالی میں یہ وصف پیدا ہوگیا ہے ۔ ہاتھ ملنے لگا ۔ دوبارہ ریداس
کے پاس جاکر پانی مانگا ۔ ریداس کشف کے ذریعے سے جان گیا
تھا ۔ کہ گورکھ ناتھ نے اپنے غرور کے سبب سے وہ پانی نہیں پیا تھا
اور اب پھر اسی کی تلاش میں آیا ہے ۔ اسی اثنا میں کمالی کے سسرال
والے بنارس آئے اور کمالی کو ملتان لے گئے ۔ جہاں وہ بیاہی گئی
تھی ۔ اس وقت ریداس نے یہ دوہا کہا ہے

پیاوے تھے جب پیا نہیں تب تم نے ابھمان کیا
بھولا جوگی پھرے دوانہ وہ پانی ملتان گیا

راسا اور ابوالفضل

پنڈت موہن لال وشنولال پنڈیا اپنے مضمون میں جس کا خلاصہ
ہم آیندہ صفحات میں درج کریں گے ۔ لکھتے ہیں کہ "چند چھیند ورنن
مہیما" میں جو سمبت ۱۶۲۹ بکرمی ۱۵۷۲ء مطابق سنہ ۹۸۰ھ کی تالیف ہے ۔ مذکور ہے کہ سمبت ۱۶۲۷ / ۱۵۷۰ء
میں جلال الدین اکبر بادشاہ نے پرتھی راج راسو اپنے دربار کے شاعر
گنگ جی سے سنی تھی ۔

یہ بیان اگر صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ راسا جلال الدین اکبر کے عہد میں موجود تھا لیکن جو تاریخ پنڈت جی دے رہے ہیں وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا تاریخ میں ایک یا دو دہائی کا فرق ہو تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ ہندویات میں اکبر کا شغف اس عہد سے بعد کا قصہ ہے۔

بعض وجوہ ہمارے پاس ایسے ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ راسا اکبر کے عہد میں موجود تھا۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی زمانے میں وجود میں آیا ہو۔ ابوالفضل کے بعض بیانات سے جن کی تفصیل ذیل میں آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اور راسا کے بعض مطالب میں اشتراک ضرور ہے لیکن یا تو راسا اس کی موجودہ شکل میں اس کے پاس نہیں یا کوئی اور تالیف جس کے مضامین راسا سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر بعض امور میں تناقض اس کے سامنے ہے۔ ابوالفضل مسلمانی تاریخ کے ان صحیح بیانات سے جو شہاب الدین کے حالات میں مفصل ملتے ہیں۔ اعراض کر کے غلط ہندی ماخذ کی سند پر کہتا ہے کہ پرتھی راج نے شہاب الدین کو سات مرتبہ شکست دی اور آٹھویں مرتبہ اس سے مغلوب ہوا۔ چنانچہ :-

"ہندی نامہا برگوید ہفت بار (بہ) سلطان پیکار آراست و شکست داد۔ پانصد و ہشتاد و ہشت ہجری نزدیک تھانیسر ہشتم بار در نبرد گرفتار شد (ص ۲۵۸ آئین اکبری مرتبہ بلاکمین) سلطان سے پہلے (بہ) میرا اضافہ ہے جو قلمی نسخے کی سند پر کیا گیا ہے۔

یہ بیان یقیناً راسا کے بیان سے مختلف ہے جس کا دعویٰ ہے کہ شہاب الدین نے بیس سے زیادہ مرتبہ پرتھی راج سے شکست کھائی۔ پکڑا گیا اور زر فدیہ دے کر رہا ہوا۔ ابوالفضل کا بیان ممکن ہے کہ ہمیر رہا کا دے سے

ماخوذ ہو جو کہا جاتا ہی سمت ۱۴۲۶ بکرمی کی تالیف ہی۔ اس کے بعد ابوالفضل گویا ہی:۔

"راجا را صد گونامور ملازم بود۔ ہر یکے را سامنت گفتے شگفت کاری اینان در کالبد گفت درنگنجد وعادت وخرد نپذیرد" یہ اشارہ ہی ان سامنتوں کے ان مبالغہ آمیز اوصاف کی طرف جو راسا میں بھی ان کی طرف منسوب ہوئے ہیں۔ مثلاً سات آدمی باری باری لڑکر شام تک سات ہزار آدمی قتل کرتے ہیں ایک ایک وار میں کئی کئی دشمنوں کی گردنیں اُڑا دیتے ہیں۔ ایک ہی ضرب میں ہاتھی کی سونڈ اُڑ جاتی ہی۔ ان سامنتوں کے سر اگرچہ تن سے جدا ہو جاتے ہیں لیکن دھڑ بدستور جنگ میں مصروف رہتا ہی اور یہ شکل تمام ٹھنڈا پڑتا ہی۔ اسی لیے ابوالفضل کہتا ہی کہ ان قصوں کو عقل قبول نہیں کر سکتی۔ مگر قرینِ عقل مسلمانی تاریخ کے بیان کو ٹھکرا کر ہندو بیان کو ترجیح دینا اور پھر عقل کا سوال اٹھانا ہمارے نزدیک ابوالفضل کی زیادتی ہی۔

اکبر کا یہ زبردست مورّخ اس مشہور قصے سے بھی واقف معلوم ہوتا ہی جس میں جے چند والی قنوج راجسو جگ مناتا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ جے چند اس تقریب کے موقع پر تمام راجاؤں کو دعوت دیتا ہی۔ سب آتے ہیں۔ مگر پرتھی راج شرکت سے انکار کرتا ہی۔ جے چند اس کا مجسمہ تیار کراکر بطور دربان کھڑا کر دیتا ہی۔ پرتھی راج اس توہین پر مشتعل ہو کر پانسو گھڑ چڑھو کے ساتھ ایلغار کرتا ہوا قنوج پہنچ کر اپنا بت اُٹھالے جاتا ہی۔ جے چند کی لڑکی یہ خبر سُن کر پرتھی راج پر نادیدہ عاشق ہو جاتی ہی۔ باپ کو پتہ لگتا ہی۔ وہ گھر سے نکال دیتا ہی۔ پرتھی راج کو ان باتوں کی خبر لگتی ہی۔ وہ

چاندا بھاٹ کو جی چند کے دربار میں جانے کے واسطے آمادہ کرکے خود مع اپنے ساونتوں کے بھیس بدل کر ملازم کی حیثیت سے ساتھ ہوجاتا ہے۔ اور موقع پاکر قنوج کی شہزادی کو لے کر نکلتا ہے۔ پرتھی راج کے وہ سامنت مختلف پہرویوں میں اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک ایک سامنت جی چند کی فوجوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے گوبند رائے گہلوت سد راہ ہوا اور بڑے معرکے انجام دے کر مارا گیا اس نے سات ہزار آدمی مارے۔ اس کے بعد نرسنگھ دیو اور چاندا اور پنڈیر اور سار دھول سولنگی اور پالہن دیو کچھواہہ مع دو بھائیوں کے عجیب وغریب کارہائے نمایاں سرکرکے راہی عدم ہوئے۔ علیٰ ہذا باقی سانتوں پر گزری اور سب کے سب راہ میں کام آئے۔ راجہ مع چاندا بھاٹ اور دو بھائیوں کے اپنی نئی رانی کو لے کر دلّی پہنچ گیا۔

ابوالفضل کی اصل عبارت ذیل میں درج ہے:۔

"چناں برگزارند راجہ جی چند راٹھور فرماں روائے ہندوستان در قنوج دادگری کردی ودیگر راجہا نخستے نیایش بدو نمودی وازفراخی مشرب بسیارے ایرانی وتورانی پرستار بودی۔ (یہ اشارہ ہے مسلمانی فوجوں کی طرف جو جی چند کے ہاں ملازم بتائی جاتی ہیں) سگالش جگ راجسو فراپیش گرفت و در سرانجام آں شد وناگزران اوآنست کہ راجہا بخدمت گری قیام نمایند تادیگ شوئی وآتش فروزی بدینہا بازگردد۔ ونیز دراں انجمن گزین دختر خود را باہمین راجہ پیوند بخشد۔ راجہ پتھورا نیز سگالش رفتن داشت۔ ناگاہ یکے را برزبان رفت۔ باوجود سلطنت چوہان اندیشۂ راجسو اورا سزاوار نبود۔ راجا آتش جمیت برافروخت وبازماند۔ راجا جی چند

بہ لشکر کشی رو آورد۔ کارزدیدگان درازی کار و نزدیکے ساعت گزاردہ باز آوردند و بچارۂ انجام این جشن پیکر راجا تیھور را از طلا ساختہ بدربانی نشاندند راجا ازیں آگہی برآشفت و با پانصد گزیدہ مرد بطرز ناشناسان رہ نوردید و ناگہانہ بداں ہنگامہ درپیوست۔ آں تمثال را برداشت۔ فراوان مردم راجان بشکردہ بباد یہ پیمائی بازگردید۔ دختر راجہ کہ آمادۂ دیگرے بود از شنید داستان مردانگی شیفتۂ تیھورا شد و تن بدان نداد۔ پدر رنجیدہ از شبستان بیرون آورد و از برائے او منزلے جداگانہ برساخت تیھورا ازیں آگہی برشورید و بخواہش پیونداو برگشت و بدیں قرار گرفت کہ چاندابا د فروش کہ از دمسازان باربیست؟ بہ عنوان نیایش گری پیش جے چند رود و راجا با برخی گزیدہ مردم بآئین ملازمان ہمراہ باشد۔ شوق اندیشہ بکردار آورد و بدیں طلسم ہوش مندی و جادوے مردانگی جویائے آرزومند را برگرفت و بہ شگرف کاری و تیز دستی بملک خود بازگردید و آں صد سامنت را بہ گوناگوں لباس ہمراہ داشت۔ یکے پس از دیگرے استادہ فوجہا برشکست۔ نخستیں گو بند رائے گہلوت بہ جنگ ایستادہ کارنامہا بجا آوردہ فرو شد ہفت ہزار کس درآویزۂ او بہ سیلاب تیغ در شدند۔ سپس نرسنگھ دیو و چاندا و پندیر و سارد ہول سولنکی و پاہن دیو کچھوا ہہ با ہر دو برادر اولیں روز یکے پس از دیگرے شگرف کارہا کردہ نقد زندگی بہ مردانگی سپردند۔ و آں ہا دو مردمان کارزار ہمہ درراہ فرو شدند و راجا با چاندا باد فروش و دو برادر او عروس بہ دہلی آورد و جہانے بہ شگفت زار افتاد۔

(صفحہ ۵۳۲)

میں اس تمام بیان کا راسا کے بیان سے بہ خوف طوالت مقابلہ

نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ راسا میں جزویات اور آرائشی حصے کی اس قدر بھرمار ہے کہ اس سے ایک سیدھا سادا مسلسل بیان لینا ایک داستان لکھنے کے مترادف ہے۔ اس لیے میں پہلے دن کی جنگ کے بعض خط و خال یہاں نقل کر دیتا ہوں تاکہ ناظرین ان کا فرق خود ملاحظہ کر لیں۔ اس کے لیے راسو سار کو میں نے اپنا رہبر بنا لیا ہے اور بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔

"سات ہزار ملیچھ فوج نے جن کے افسر میر ہمام اور میر گردان تھے سامنتوں پر حملہ کیا۔ ان کی روک تھام کے لیے گوبند رائے گہلوٹ دونوں ہاتھوں میں دو تلواریں لے کر آگے بڑھا اور دو دستہ شمشیر زنی شروع کر دی۔ اور دم بھر میں کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ آخر میر ہمام خان سے اس کا مقابلہ ہوا۔ میر نے اس پر تومر (گرز یا نیزہ) کا وار کیا اور چاہتا تھا کہ کمان ڈال کر کھینچ لے۔ گوبند رائے بروقت اچھل کر الگ ہو گیا اور وار خالی دیا۔ اس پر میر نے بالک کا ہاتھ مارا۔ لیکن بجائے زیر ہونے کے اپنے دشمن پر جھپٹا۔ میر نے ایسا نیزہ مارا کہ کلیجہ کے پار نکل گیا۔ راجپوت نے اس پر بھی کونت کا ہاتھ مارا۔ اتنے میں میر نے اس کا سر اڑا دیا۔ سر تو گر گیا مگر دھڑ نے آفت مچا دی۔ کٹار کے ایک ہی وار میں میر کو تو مردۂ صد سالہ بنا دیا۔ اس کے بعد چار اور میر دن کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اتنے میں آراس (آرائش) کا زنبور کلیجے میں لگا اور گہلوٹ کا تن بے سر لاش بن کر گر پڑا۔ مسلمانی فوج اب زور باندھ کر آگے بڑھی۔

ادھر سے پجون رائے نے مورچہ لیا۔ اس کے مقابلے کو پانسو مسلمان سپاہی بڑھے۔ یہ دیکھ کر کیہر رائے۔ کنٹھیر پرمار۔ پیپار رائے بڑھیار۔ بھوہار رائے چندیل۔ بھوپ کچا رائے چالک۔ اور داہیما نرسنگھ

راے۔ پانچ سامنت پیدل ہوکر اس کی امداد کو آئے۔ اور حریف کو للکارا
خوب ہتھیار چلا۔ گھسان کا معرکہ رہا۔ آخر میں پجّون راے کا سر کٹ کر الگ
جا گرا۔ مگر دھڑ نے وہ کار نمایاں کیا جسے دیکھ کر دیوتا بھی عش عش کرنے لگے۔
اس نے دم میں ساری مسلمان فوج کو تتر بتر کر دیا۔ پجّون راے کے ختم
ہوتے ہوتے تیسرا پہر ختم ہو چکا تھا۔

اب حریف کی طرف سے باگھ راے بگھیلا اور میر کمود خاں نے ساونتوں
پر یورش کی۔ اس طرف چند پنڈیر نے ہتھیار کیا۔ اور مست ہاتھی کی طرح
دشمن کی فوج میں گھس گیا۔ ہزاروں میروں کو کاٹتا چھانٹتا میر کمود خاں کے
مقابلے میں آیا۔ میر نے اس کے بھالا مارا۔ اِدھر سے چند نے سیل چلایا۔
دونوں کے وار بھرپور پڑے اور دونوں کا کام تمام ہو گیا۔

پنڈیر کے کھیت رہتے ہی اِدھر سے کرمبھ راے نے اور اُدھر سے
باگھ راے بگھیلے نے ہتھیار سنبھالے اور دونوں ایک دوسرے کے
مقابلے پر ڈٹ گئے۔ پہلے تلواروں سے لڑے جب تلواریں ٹوٹ گئیں
کٹاریں پکڑیں اور وار چلے۔ اس گھسان میں پجّون راے کا سیرن میر
سے سامنا ہو گیا۔ سیرن نے پجّون راے کے سینے میں نیزہ پیل دیا۔
جس سے پجّون راے بے جان ہو کر زمین پر گرا مگر گرتے گرتے حریف
کے تلوار کا ہاتھ مارتا گیا۔

پجّون راے کو گرتا دیکھ کر نرسنگھ راے داہیما سیرن کے مقابلے
میں آیا۔ سیرن نے پہلے تو اس پر بان (تیر) چلایا لیکن جب وہ بان
کو خاطر میں نہ لایا تب اس نے تلوار کا وار کیا۔ اتنے میں نرسنگھ کا ہاتھ
بھی چل چکا تھا۔ الغرض دونوں ڈھیر ہو گئے۔

کرمبہ رائے کے مرنے پر اس کا سگا بھائی پلھن میدان میں اترا۔ اور خوب دادِ شجاعت دے کر آخر کار ہلاک ہوا۔

اس کے بعد پجّون رائے کا فرزند ملے سنگھ چار تلواریں باندھ کر حریف پر دوڑا۔ کرمبہ کے خاندان کے اور دو چار بھائی بیٹے اس کے ساتھ تھے۔ اس بہادر نے ایسی صف شکنی کی کہ دشمن کی فوج نے بھی اس پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے۔ اس نے جس سوار کے ہاتھ مارا زرہ بکتر سمیت کاٹ کر گرا دیا۔ ایک ہی ہاتھ میں کئی کئی زبردست جوانوں کی گردنیں کاٹ دیتا تھا۔ میرا اور سامنت دونوں اس کی دلاوری کی داد دیتے تھے۔ زخمی پجّون رائے بھی اپنے فرزند کی بہادری دیکھ کر پھولوں نہیں سماتا تھا۔ اس کے ساٹھ گہرے زخم آئے تب کہیں بے جان ہو کر گرا۔

اب دشمن نے اس جماعت پر ہاتھیوں کو ریل دیا۔ کنہ چوہان اسی وقت تلوار لے کر ان ہاتھیوں کی طرف جھپٹا۔ وہ ان سینکڑوں ہاتھیوں سے اس طرح لڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی پہلوان اکھاڑے میں اپنے ٹھوں کو زدور کراتا ہو۔ زبردست ہاتھی اس کی شمشیر کا زخم چکھ کر چیخ اُٹھتے۔ کالے کالے ہاتھیوں میں اس کی تلوار بادلوں میں بجلی کی طرح کوندھ رہی تھی۔ ان کے زخموں سے خون جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس خونی دریا میں کٹی سونڈیں مگرمچھ اور ڈھالیں کچھوے معلوم ہوتی تھیں۔ ادھر کنہ یہ قہر ڈھا رہا تھا۔

اُدھر سارنگ رائے سولنکی غنیم کی فوج کے سر تن سے جدا کر رہا تھا۔ جس میر پر اس کا ہاتھ پڑا۔ سر خربوزے کی طرح کٹ کر دور جا گرا۔

آخر کئی دشمنوں نے مل کر اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ اتنے میں اندھیرا بھی ہو چکا تھا اور جنگ ختم ہوئی۔

آج کی جنگ میں دشمن کے سات ہزار مسلمان۔ دو ہزار گھوڑے اور بہت سے ہاتھی کام آئے اور ادھر صرف سات سامنت کھیت رہے رات کے وقت لاشیں اٹھائی گئیں۔ اور نرسنگھ رائے داہیا گوبندرائے گہلوٹ۔ چند پنڈیر۔ سارنگ رائے سولنکی۔ پاہن رائے سا ملا۔ سور ملے سنگھ وغیرہم کی لاشیں جب سامنے لاکر رکھی گئیں تو پرتھی راج روتا ہوا زخمی پجّن رائے سے لپٹ گیا۔ گوبندرائے ابھی تک سسک رہا تھا۔

ابوالفضل کا بیان بظاہر راسا کے بیان پر مبنی مانا جا سکتا ہے لیکن اگر غور کی جائے تو ان میں کافی اختلاف موجود ہے۔ آئین اکبری میں گوبندرائے اور راسا میں گوبندرائے ہے جو بقول ابوالفضل تنہا سات ہزار آدمی قتل کرتا ہے۔ راسا میں یہ تعداد ساتوں ساونتوں کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔ آئین میں چند پنڈیر ایک فرد واحد کو دو شخص مانا گیا ہے۔ یعنی چاندا علیحدہ اور پنڈیر علیحدہ آئین میں سار دھول سولنکی راسا میں سارنگ رائے سولنکی ہے۔ آئین میں نرسنگھ دیو راسا میں نرسنگھ رائے ہے۔ آئین کی رو سے ان سات ساونتوں کے یہ نام ہیں:

(۱) گوبندرائے گہلوٹ (۲) نرسنگھ دیو۔ (۳) چاندا۔ (۴) پنڈیر۔ (۵) سار دھول سولنکی۔ (۶) پاہن دیو۔ (۷) برادر پاہن دیو (۸) برادر پاہن دیو۔ اس طرح آٹھ ساونت بنتے ہیں اور ابوالفضل سات بتاتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ چاندا پنڈیر ابوالفضل کے نزدیک ایک شخص ہے جس کو اس کے مرتب نے دو شخص بنا دیا۔

اور آئین کے مذکورہ بالا متن میں چاندا اور ٹینڈیر کے درمیان واد غلط لایا گیا ہے۔ لیکن راسا کا متن بھی ایسے نقائص سے پاک نہیں۔ راسا کے تفصیلی بیان میں یہ ساونت مارے جاتے ہیں۔

(۱) گوبند رائے گہلوت (۲) پچن رائے (بار اول) (۳) چند پنڈیر (۴) پچن رائے (بار دوم) (۵) نرسنگھ رائے۔ (۶) کرمبہ (۷) پلہن۔ (۸) ملے سنگھ (۹) سارنگ رائے سولنکی۔ مگر مقتولین کی فہرست میں صرف چھ نام ملتے ہیں یعنی (۱)، (۵)، (۳)، (۹)، (۷)، (۸) یہاں ہم سمجھتے ہیں کہ فہرست میں پجّون رائے کی شمولیت جس کو راسو سار میں دو مرتبہ مقتول دکھایا گیا ہے۔ بالکل غیر ضروری ہے۔ وہ قتل نہیں ہوتا اور آیندہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف زخمی ہوتا ہے۔ باقی نام آئین اور راسا میں تقریبًا مماثل ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ آئین میں پالہن کے دو بھائیوں کے نام نہیں دیئے گئے جو راسو میں موجود ہیں یعنی کرمبہ اور ملے سنگھ۔

ابوالفضل اپنا سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اس واقعہ کے ایک سال بعد سلطان شہاب الدین نے جےچند والیٔ قنوج کے ساتھ دوستی کرلی اور لشکرے کر لڑنے آیا۔ اور پرتھی راج کا بڑا علاقہ فتح کرلیا۔ پرتھی راج اپنی نئی رانی پر اس قدر فریفتہ تھا کہ اس کو دنیا و ما فیہا کا مطلق ہوش نہ تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ شہاب الدین کی آمد کی اس کو اطلاع دے سکتا آخر اراکین دولت نے جمع ہو کر چاند اکو ساتوں ڈیوڑھیوں سے پار کرکے حرم سرا میں بھجوایا۔ وہ پرتھی راج کو ہوش میں لایا۔ پرتھی راج اپنی گزشتہ فتوحات پر مغرور حسب معمول تھوڑا سا

لشکر لے کر میدانِ کارزار میں جا دھمکا۔ لیکن اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ اس کے دل چلے سامنت پیوند خاک ہوچکے تھے ادھر معاملاتِ سلطنت بالکل ابتر و درہم تھے اور جے چند جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر اس کی امداد کرتا رہتا تھا۔ اُلٹا اس کے دشمن کا مددگار ہوگیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرتھی راج نے بُری طرح شکست کھائی۔ گرفتار ہوا اور شاہ اسے غزنین لے گیا چنانچہ آئین :۔

"از بخت برگشتگی راجہ بداں ہمیں بانو شیفتہ شد و از ہمہ واپرداخت۔ چوں سالے بریں گزشت سلطان شہاب الدین ازیں داستان باراجہ جے چند طرز دوستی پیش نہاد۔ سپس لشکر ہا فراہم آوردہ بہ پیگار برآمد۔ بسیارے جا بہ گرفت۔ کس رایارائے گزارش چہ کہ دسترس نبود۔ آخر اولیائے دولت فراہم آمدہ چاندار اازمہفت درگزرانیدند و ادبحرم سرا درشدہ لختے راجا را بہ شورش در آورد۔ او از غرور فیروزی بسان ہربار قدرے لشکر فراہم آوردہ کارزار پیش گرفت۔ چون دلاوران والاپسیچ دریں مرتبہ نبودند و کارسلطنت از رونق افتادہ بود و جے چند کہ ہموارہ کمک می کرد۔ برخلاف پیشین مددگار غنیم شد۔ دریں ناوردگاہ راجا گرفتار آمد و سلطان دستگیر کردہ بہ غزنین برد" (صـ۳۲۵)

اس بیان کا اکثر حصہ اگرچہ معتبر تاریخ کی رو سے بے بنیاد ہے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر بھی ابوالفضل ہندو روایت کی خوشہ چینی میں مصروف ہے۔ اس کے بعد ابوالفضل اسی قصّے کو لے بیٹھتا ہے جس میں اندھا پرتھی راج چاند بھاٹ کی نشان دہی سے آواز پر تیر مار کر سلطان کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ یہ روایت راسا میں بھی موجود ہے۔

"چانداازحقیقت منشی و وفاداری بہ غزنین شتافت و سلطان راملازمت نمود و نوازش یافت و بہ پختہ کاری راجا رادریافت و در زندان دمسازی نمود۔ گفت چناں بخاطر می رسد کہ من نزد سلطان تیراندازی ترا برگویم۔ او میل تماشہ خواہد کرد۔ درآں زمان کارراورابساز۔ قرار داد بجاے آمد سلطان راتیر دوز گردانید۔ ہواخواہان راجا و چاندراازہم گزرانیدند (صــــ ۵۳۲ آئین اکبری)

سلطان کی سات مرتبہ شکست کا قصہ اگرچہ ابوالفضل نے ہندو روایت کی بناپر تسلیم کرلیا ہے مگر بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ سلطان معزالدین محمد بن سام کے سوانح حیات میں ان شکستوں کے لیے کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا۔

جے چند کے لشکر میں مسلمانی فوجوں کا موجود ہونا بھر بیان واقع نہیں معلوم ہوتا۔ ایسے ابتدائی زمانے میں قلب ہندوستان میں مسلمانوں کا پایا جانا غیراغلب ہے۔ سواحلی مقامات پر البتہ مسلمان موجود ہیں۔ لیکن ہندو رزمیہ کا یہ بیان صدائے بازگشت ہے۔ اس عہد کی جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوکر ہندوؤں کے ساتھ ملی جلی زندگی کے عادی ہوگئے ہیں اور فوجی خدمات کے لیے عام طور پر پسند کیے جاتے ہیں۔

سلطان شہاب الدین کا اندھے پرتھی راج کے تیر سے مارے جانے کا قصہ بھی قطعی غلط ہے۔ کیونکہ سلطان موصوف حسب بیان طبقات ناصری ملاحدہ کے ہاتھ سے غزنین جاتے وقت منزل دمیک پر مارا جاتا ہے۔ قطعۂ ذیل جو کسی ہمعصر شاعر کے قلم کا نوشتہ ہے۔ طبقات میں محفوظ ہے۔

شہادت ملک بحر و بر معز الدین   کز ابتدائے جہان مثل او نیامدیک
سوم ز غرۂ شعبان بسال شش صد دو   فتادہ در رہِ غزنین بمنزل دمیک

طبقات سے بھی قدیم سند ہمارے پاس فخر مدبر کی سلسلۃ الانساب کی ہی جو بعہد قطب الدین ایبک تالیف ہوتی ہی اور جس کا دیباچہ ڈینی سن راس نے تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے نام سے ۱۹۲۷ء میں چھاپا ہی۔ اس تالیف میں بھی سلطان کا قتل منزل دمیک میں بتایا گیا ہی۔ چنانچہ :-

"وچوں بمنزل گاہ دمیک رسید حکم و تقدیر ایزدی عز اسمہ کہ در ازل رفتہ بود و ترقی زیادت غازی بحق شہید شد و برحمت خداے پیوست" (ص ۲۹ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ۱۹۲۷ء طبع رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن)

راسا اور میراں سید حسین

راسا سے اقتباس

ذیل میں راسا سے اصل اقتباس جو میراں سید حسین سے متعلق ہی۔ دھیر پنڈیر پرستاد چونسٹھویں داستان سے لے کر حوالۂ قلم کیا جاتا ہی۔ وہو ہذا -

"روشن علی فقیر   گار متا اجمیرن
دہی مول لے چکھت   ہوا کھٹا وپے بھیرن
گجتر یاں یگار   جائے دربار ستابن
ہڈی بخشی گنہی   کاٹی انگوری بن جابن
مکاں سوجاہے فریاد کری   میراں سید حسین اگ
نیت خداے مدہت کرن   یہ اکھی من دھری آگ (چھند ۱۶۷)

مرجانا حق ہے جگ رہے گی کہاں
سا برسوں کا جینا تھوڑائی ہے بھلاں (چھند ۱۶۸)

(در بحر متقارب مثمن سالم)

کہے دین کجّن پرس سے قرآن کروں رد بدن سبیں ہندوان
نمے پیر پیغمبرن تھان مکّاں رہا بن نامن جگن چیار چکّان
دنن ست ہوتے سو بیواہ اڈے کرن کنکنن سیہرا بندھی چڈھے
تنن من ایکن چوالیس یارن چلے سنگ سوداگرن روپ دھارن
چلن پنتھ کے اچھ اچھے اتنگا ٹلے نا وجیول تیرو یگن وہنگا
دربّاف جر دوج جر کسّ جھولن رہے بنک چکھن ڈھنکے مکھ تولن
اسے اشولیّن دھرا ہندوان دیو آئے ڈیرا اجمیر تھان
دربّار جائے کہیو میر کھیرن سنن مکھ اُٹھے رہے ہتھ جورن
ہیں ہیری لیایو کھندھائی سگدھن روی ارتھ کے کنہ ددہی متھی کدھن
سئے کرن آنا ہی پت آین سبیں چھوری پیرن ترنگا دکھاین
کھوری اک دیاں چابکی راہ گیرن رنگوال چلے نہ ہلے سریرن
دمانک کو دنت ناچنت تھالن زکھے پرکھے ہرکھے بجھ آلن
تہن منگی دامن کرے قول بولن لہے پن ترسیں ہدیرن ہیری مولن
جما جور منڈے سوا لکھ دامن لیے کما گدرن کا یتھن انک تامن
کرے چھاپ آپن بلائے حضورن سنن مان چھوا آن رکھے گرورن (۱۷۴)
گیو سنبھری ناتھ دسے ہتھ ہیرا کرے جوک سکیو نہیں تتھ میرا
اجیپال جوگی کرامات اگن اٹھے ہتھ ناہیں مند کینی نگن
نواجن گدارے دین سنگ جتن گئے دیو ہند دل کے کچھی تتن (۱۷۷)

کرن کافرن جواہاں موت دیجے ۔ سورت کینی دہی پیر ہو جے
تہن کارن اپنے ہتھ اپن ۔ کیے سیں بیگن چلو پٹ دھین
اِلّا محمد رسول (اللہ) اِلّا ۔ کلّما پڑھے جور کنو ٹھیلا
ملے آپ بیں سن مکھن دست چومیں ۔ اِسے سیر جوانن بھلے دوئی ہم مے
تمن کھنج بجوُ جیی کڈھی ۔ چلے گھریں کو چرن سہس اڈھے

چو آلیو ں یار ۔ کڈھ ننگی سسیرن
کر کڈھے سراپ ۔ چڈھیں تنگی سرمیرن
ہندو مسلمان ۔ جڑت ہی گئے گھن پایل
چھو آنا آنا نرند ۔ جیت امبھو اجرایل
کنی لین بھن ہوئی متیر ۔ امر کھیو صاف دھر
تہی تھان آسے دربیں اک ۔ ڈھواج موندی نبدھی گھر (۱۸۱)
سواسیر دن مان ۔ آن تہن اچھارت
رج کنکر کری دد ۔ دھور پڑ یاں بہارت
جمارات دے سین ۔ میرایہ کین حکمن
تم اور چڈھی ہی ۔ سوامن سداکنمن
اجمیر پیر تم پرگٹ ہو ۔ کنک دیس کے اترے
ہندواں پان گھٹی ہی انجی ۔ اہن کول ہم پریت رے (۱۸۲)

(چھند ۱۶۷ تا ۱۸۲ صفحہ ۲۰۵۲ حصہ ۱۸ پرتھی راج راسا)

یہاں ہم راسا کے بیان بالا پر تبصرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ تاتار[illegible] وزیر شہاب الدین سے کہتا ہے:-

فقیر روشن علی

"جس وقت فقیر روشن علی نے دلّی جاکر دہی جھوٹا کر دیا اور اس قصور پر وہاں کے راجا نے اس کی اُنگلی کٹوا دی روشن علی نے مکے شریف میں جاکر فریاد کی۔ درگاہ رسالت میں اس کی فریاد قبول ہوئی۔ نادان راجا کی سزادہی کا حکم دیا۔ تعمیل میں خواجہ میراں شاہ سوداگروں کے لباس میں روانہ ہوے۔ میراں صاحب کے پاس بہت سے قیمتی گھوڑے تھے۔ اُن کی آمد کی خبر پاکر دلّی کے راجہ نے سارے گھوڑوں میں انتخاب ایک گھوڑا خرید لیا اور حضرت میراں شاہ نے جو قیمت مانگی وہی قیمت دی۔ اس لیے حضرت میراں شاہ کا اس وقت تو کچھ بس نہ چل سکا۔ وہاں سے چل کر اُنھوں نے اجمیر کے دیوتا اجیپال کے مقام پر نماز پڑھی اور اذان دی۔ جس سے وہاں کے سب ہندو دیوتا بھاگ گئے۔ اس وقت اس کافر سردار نے طیش میں آکر فوج کشی کی۔ اُدھر تو ہندو سپاہی لڑتے تھے۔ ادھر صرف آپ کے چالیس یار مقابلا کرتے تھے۔ جنگ کے اختتام پر اور تو سب بچ گئے مگر حضرت صاحب نے شہادت پائی۔ اس حادثے سے آپ کے ساتھیوں کو بڑا قلق ہوا۔ اسی شب ان کے ایک ساتھی نے خواب میں دیکھا کہ ایک پیر مرد اس سے کہتا ہے کہ تم لوگ ہرگز رنج نہ کرو۔ میراں صاحب اجمیر کے دلی مانے جاکر پوجے جائیں گے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہندو خوار ہوں گے اور اسلام کا بول بالا ہوگا۔ پس اے خداوند نعمت کوئی تعجب نہیں اگر یہ وہی وقت آگیا ہو اور دین کے پھیلانے کی عزت آپ ہی کے نام پر ہو۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ فوج کشی کرکے کافروں کو قتل کیا جائے۔"

گویا تاتار خاں اس پیش گوئی کی بنا پر شہاب الدین کو لشکرکشی کا مشورہ دیتا ہے۔ راسا میں اس قصہ کا ایراد کئی امور پر روشنی ڈالتا ہے ایک تو یہ کہ راسا کا مصنف مسلمانوں کی روایات و معتقدات سے اس سے بدرجہا زیادہ واقف ہے جس کا وہ راسا میں اظہار کرنا پسند کرتا ہے ایسی قریبی واقفیت پرتھی راج کے دربار کے کسی آدمی کو مسلمانوں کے متعلق بہت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ اگرچہ یہ اطلاع ناخواندہ اور جاہل طبقے کے مسلمانوں کی صحبت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جس کو صحیح تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہندوستان میں ایسے قصے بہت عام ہیں جن کے راوی درگاہوں کے مجاور اور پیرزادے ہوا کرتے ہیں اور اپنی دکان فروشی کے واسطے ایسے افسانے تراش لیا کرتے ہیں چنانچہ یہ قصہ بھی اسی ماخذ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔

رسالۂ کلیم میرے پاس اردو میں ایک منظوم اور مطبوعہ رسالہ ہے جس کا ناظم کوئی شخص کلیم تخلص ہے۔ اس رسالے کا افتتاحیہ ہے: ؎

سراسر جو شکل الف ہے قلم　　ہے وحدت کے عالم کا گویا علم

اور مصنف کا تخلص اس شعر میں آتا ہے: ؎

الٰہی یہی ہے دعائے کلیم　　کرم کر بحق رسول کریم

یہ رسالہ اب سے پچاس ساٹھ سال قبل لکھا گیا ہوگا۔ کلیم ایک فارسی کتاب مجالد الکفار کی سند پر روشن علی اور میران سید حسین کے حالات بیان کرتا ہے۔ سبب تالیف یہ کہتا ہے کہ جب میں خواجہ اجمیری کی زیارت کے واسطے اجمیر پہنچا اور وہاں میرے کلام کی شہرت ہوئی

غلام علی ابن روشن علی جو میران شاہ کے زمرۂ خدام سے تعلق رکھتے ہیں میرے پاس ایک فارسی تاریخ کی کتاب لائے جس میں میران حسین کے حالات بالتفصیل مذکور تھے۔ چونکہ آپ کے حالات معلوم کرنے کا مجکو مدت سے اشتیاق تھا اس لیے میں اس تالیف کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ موصوف نے مجھ سے خواہش کی کہ تم اس کو اُردو زبان میں نظم کردو۔ گویا یہ رسالہ مجاہد الکفار کے بیانات پر مبنی ہے۔

مجاہد سے لکھتا ہوں یہ مثنوی ہے یوں اس سے تاریخ کی آگہی

اس رسالے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب راجا پرتھی پت اجمیر میں گدی نشین ہوا اس نے اپنی شہرت کے قیام کے لیے قلعۂ تارا گڈھ پر جس کی بلندی سات کوس ہے رات کے وقت روشنی کرانی شروع کی۔ یہ روشنی دور دور سے نظر آتی۔ ایک رات روشن علی فقیر نے اپنے وطن شہر بخارا میں یہ روشنی دیکھی اسے غیرت آئی کہ ہندوستان جو دارالکفر ہے وہاں کفر کی روشنی پھیلی ہوئی ہے روشنی کی تلاش میں یہ درویش اپنے وطن سے راہی ہوا اور سلطان محمود کے کسی حملے میں شریک ہوکر وارد ہندوستان ہوا اور گھوگھرا میں جو اجمیر سے دو کوس جانب مشرق واقع ہے قیام کیا۔ وہاں سے اجمیر پہنچا اور انا ساگر کے پاس جو شہر کا دروازہ ہے دھونی۔ مادی۔ شہر میں نئے فقیر کے دھونی رمانے کا چرچا ہوا۔ لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ راجا کے ایک سامنت نے آکر اسے ڈانٹا کہ تو نے پنگھٹ کے راستے میں دھونی رما کر آمد و رفت میں مزاحمت پیدا کردی۔ درویش نے جواب دیا ہم لوگ آزاد ہیں جہاں چاہیں بیٹھیں۔ تو ٹوکنے والا کون۔ سامنت نے کہا تو مجھے نہیں جانتا۔ میں نے بڑے بڑے سرکشوں کا بل نکال دیا ہے۔

اس پر روشن علی جلال میں آیا اور بولا۔ اے بدزبان! چلا جا تیری اسی میں خیر ہے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔ اسی وقت ایک شعلہ آگ میں سے نکل نکل کر سامنت کی طرف جھپٹا۔ سامنت سہم کر فرار ہوا۔ دوسرے دن روشن علی نے بازار میں جاکر دھونی رما دی۔ ایک گوجری دہی لے کر ادھر سے گزری۔ درویش نے پوچھا تیرے برتن میں کیا ہے؟ اس نے جواب دیا، دہی ہے۔ اور راجا پرتھی پت کے رسوڑے (باورچی خانہ) لے جا رہی ہوں۔ درویش نے پوچھا تجھے روزانہ کیا دیا جاتا ہے؟ گوجری نے کہا دو اشرفیاں ملتی ہیں۔ فقیر نے کہا اشرفیاں مجھ سے لے اور دہی مجھے دے دے بشرطیکہ میٹھا ہو۔ گوجری بولی۔ میرا دہی میٹھا ہے۔ روشن علی نے اشرفیاں دے دیں اور دہی رکھ لیا۔ جب انگلی ڈال کر چکھا تو معلوم ہوا کہ کھٹا ہے۔ درویش نے کہا یہ دہی کھٹا ہے۔ میں نہیں لیتا۔ میری اشرفیاں واپس کر دے۔ اس پر گوجری نے جاکر راجا سے شکایت کی۔ راجا نے حکم دیا کہ جس انگلی سے فقیر نے دہی چکھا تھا قلم کر دی جائے چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ فقیر نے بد دعا دی کہ راجہ! جس طرح تو نے میری انگلی قطع کرائی ہے اسی طرح تیرا راج بھی منقطع اور مستاصل ہو۔

حالات شاہ میراں جی

فقیر روشن علی ہندوستان سے روانہ ہوکر مشہد مقدس پہنچا اور شاہ میراں سے فریاد کی۔ شاہ میراں ابھی کم سن تھے۔ ان کی شادی کتخدائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میراں جی نے اپنی شادی ملتوی کر دی اور راجا کی تادیب کے واسطے روانہ ہو گئے۔

میراں جی کا نام شاہ سید حسین ہے اور سید ابراہیم کے فرزند

ہیں جو مشہد مقدس کے محدث تھے۔ ان کی والدہ کا نام بی بی ہاجرہ تھا۔ یہ جابر کے سید محمد کی دختر نیک اختر تھیں۔ ان صاحبزادی کے علاوہ سید محمد کے دو فرزند نرینہ سید تقی اور سید نقی تھے جو شاہ حسین کے اولیا ہوئے۔ سید شہاب الدین جو چودہ ہزاری کرکے مشہور رہیں۔ ان کے رشتے کے ماموں تھے۔ یہ سید جلال الدین سیستانی کے فرزند تھے۔ سید شہاب الدین کی بھی ایک بہن سید ابراہیم مخدوم سے بیاہی گئی تھیں۔

جب میراں صاحب ہند کی طرف چلے۔ ان کے ساتھ دس ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادے تھے۔ ابوطیب سلطان محمود کے حکم سے ان کے ساتھ ہو لیے۔ ان کے علاوہ سید شہاب الدین اور سید تقی و سید نقی بھی ہمراہ تھے۔ ہمدان سے سید علی اپنے خویش و اقارب کے ساتھ اور بلخ و بخارا۔ نہاوند و کرمان سے متفرق لوگ ان کے ہمراہ ہو لیے۔ یہ لشکر ۳۹۱ھ میں شہر ہمدان سے روانہ ہوا۔ الغ خاں مع شاہی فوج کے سلطان محمود کے حکم سے ان کے ساتھ ملحق ہو گیا۔ سب سے پہلے اس لشکر کا مقابلہ کوہ ہندو (کذا) کے پاس راجا چپال کی فوج سے ہوا۔ راجا کو شکست ہوئی اور گرفتار کر لیا گیا۔ اس موقع پر ملتان سے تازہ مجاہد آکر شریک ہو گئے۔ اسی مقام سے میراں صاحب نے الک (کذا) خاں کو سلطان محمود کے واسطے تحائف دے کر رخصت کر دیا۔ الک خاں کو رخصت کرنے کے بعد یہ لوگ سندھ کا ارادہ کرتے تھے مگر راستے میں انھوں نے شہر ملتان کا محاصرہ کیا۔ یہاں کے راجا کا نام انند تھا جو راجا چپال کا فرزند تھا۔ جنگ میں وہ قید کر لیا گیا۔ اسی معرکے میں محدث ابوطیب شہید ہوئے۔ اب میران نے ہندوستان

کا رُخ کیا۔ اس وقت ان کی فوج میں ساٹھ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے تھے۔ یہ لشکر پانی پت پہنچا۔ ان دنوں چند پال پانی پت کا راجا تھا۔ یہاں بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں ہندوستان کے کئی راجاؤں نے چند پال کا ساتھ دیا۔ مگر فتح مسلمانوں کے پرچم پر لہرائی۔ پانی پت سے لشکر دشت پوکھر کی طرف بڑھا۔ پوکھر پہنچنے تک ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ میراں صاحب کو وضو کے واسطے کہیں پانی نہ ملا۔ اس پر آپ نے اپنا نیزہ زور سے زمین پر مارا۔ خدا کی قدرت سے پانی کا چشمہ اس مقام سے جاری ہو گیا۔ ایک راجا جو جذام کے مرض میں مبتلا تھا۔ شکار کی تلاش میں ادھر سے گزرا۔ چشمہ دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا جب پانی میں ہاتھ ڈالا۔ خدا کے فضل سے اس کی کوڑھ جاتی رہی۔ تب تو اس نے چشمے میں پورا غسل کیا اور اس مہلک مرض سے شفائے کامل حاصل کی۔ اس نے چشمہ کی تعمیر کا حکم دیا۔

جب میراں صاحب وارد اجمیر ہوئے۔ انا ساگر پر قیام فرمایا۔ وہ مقام گھوڑوں کے تاجروں کی فرودگاہ ہے۔ اہل شہر یہی سمجھے کہ گھوڑوں کے سوداگروں کا قافلہ ہے۔ شدہ شدہ یہ خبر پرتھی پت کو پہنچی۔ اس نے حکم دیا کہ عمدہ عمدہ گھوڑے چھانٹ کر ہمارے لیے لاؤ۔ اس کے آدمی گھوڑے دیکھنے آئے لیکن انھیں حضرت میراں کی سواری کے خنک کے سوا کوئی گھوڑا پسند نہ آیا۔ بولے آپ یہ گھوڑا ہمیں دے دیں۔ میراں صاحب نے فرمایا۔ یہ خاص میری سواری کا گھوڑا ہے۔ فروخت کے واسطے نہیں ہے۔ جب راجا کے آدمیوں کا اصرار حد سے زیادہ گزرا۔ آپ نے یہ شرط ٹھہرائی کہ جب میرا گھوڑا ٹاپ

مارے۔ زمین میں اس کا سم جس قدر دھنسے تم اس قدر حصہ سونے چاندی سے بھر دینا۔ بس یہی اس کی قیمت ہوگی۔ یہ شرط اُنھوں نے منظور کرلی۔ جب گھوڑے نے ٹاپ ماری۔ قدرت الٰہی سے زمین کا وہ حصہ شق ہوگیا اور بڑا غار بن گیا۔ راجا کے آدمیوں نے شرط کی تکمیل میں بے شمار زر و سیم اس میں ڈالا مگر غار نہ بھرنا تھا نہ بھرا۔ آخر وہ لوگ عاجز آگئے۔ تب آپ نے فرمایا۔ گھوڑا تم کو دے دیا جاتا ہے لیکن اگر وہ از خود ہمارے پاس چلا آیا تو تم کو واپس نہیں دیا جائے گا۔ یہ شرط اگر منظور ہو تو گھوڑا لے جاؤ۔ اُنھوں نے یہ شرط مان لی۔ گھوڑا لے کر چلتے بنے اور اصطبل میں لے جاکر احتیاطاً زنجیروں میں کس دیا۔ جب آدھی رات گزری۔ گھوڑے نے زنجیریں توڑ دیں اور قلعے سے نکل کر سیدھا میراں صاحب کے خیمے میں آگیا۔ صبح کے وقت راجا کو گھوڑے کے غائب ہونے کا حال معلوم ہوا۔ حیران رہ گیا۔ میراں صاحب کے پاس آدمی بھیجے۔ اُنھوں نے آکر دیکھا کہ گھوڑا موجود تھا۔ جب راجا کو علم ہوا کہ میراں صاحب اس سے جنگ کرنے آئے ہیں۔ اس نے کہلا بھیجا کہ مجھ میں آپ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے اور جو خدمت چاہئے کرنے کو تیار ہوں۔ حضرت میراں نے اس سے مسلمان ہونے کی خواہش کی۔ راجہ نے جواب میں اپنے فرزندوں کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ پہلے آپ کوئی کرامت دکھائیں، پھر ہم سے مسلمان ہونے کی درخواست کریں۔ ہمارے شہر کا جو تالاب ہے اس کا بند اکثر اوقات ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ ایسا بند بندھوا دیجیے جو نہ ٹوٹ سکے تب ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ میراں نے کہلوایا۔ اگر واقعی بند بندھوانا اور اسلام لانا منظور ہے تو میرے

پاس کچھ بیل اور آٹا بھجوا دو۔ راجا نے حسب المطلب یہ سامان بھجوا دیا۔
میراں نے بیلوں کو ذبح کروایا اور حکم دیا کہ ان جانوروں کی ہڈیاں
اور کھال بند کی جگہ ڈال دیں۔ جب راجا کو بیلوں کے ذبح کیے جانے
کی اطلاع پہنچی سخت طیش میں آیا اور خود میراں صاحب کی خدمت میں
آیا۔ میراں صاحب نے فرمایا۔ راجا! تمھارا بند تیار ہوگیا۔ اب حسب
وعدہ مسلمان ہو جاؤ۔ راجا نے کہا مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ بند پہلے
بندوں کی طرح کثرت بارش سے نہیں ٹوٹے گا۔ آپ نے فرمایا ع ہاتھ کنگن
کو آرسی کیا ہے۔ آزمائش کرو۔ آپ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اسی
وقت ابر چھا گیا اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ دم کے دم میں
جل تھل ہوگیا۔ پانی تالاب کے بند پر سے گزر گیا۔ مگر بند پر مطلق اثر نہ ہوا
راجا یہ کرامت دیکھ کر دنگ رہ گیا مگر اپنی خفت مٹانے کے لیے بولا کہ
آپ نے میرے ساتھ یہ بڑی چوٹ کی کہ بیلوں کو علی الاعلان ذبح کرا دیا۔
جس سے میری سخت توہین ہوئی۔ اب آپ کو چاہیے کہ بیلوں کو فوراً
زندہ کر دیں ورنہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیں میراں صاحب نے
جواب دیا۔ تمھیں یاد ہوگا۔ تم نے ایک درویش روشن علی کی انگلی کٹوا دی
تھی تم اس درویش کی انگلی جڑوا دو۔ میں تمھارے بیل زندہ کر دوں گا۔
لیکن اگر تم نے اس کی انگلی درست نہ کی تو یاد رکھو کہ تم کو بھی امان نہیں ملے گی
میرے ساتھ غازیوں کا لشکر ہے۔ بالآخر جنگ کی ٹھنی۔ لشکر اسلام کے
سردار سید شہاب الدین تھے۔ مجاہدین نے زور کر کے قلعہ سنبل گڈھ فتح
کر لیا۔ راجا اور اس کے دونوں فرزند جنگ میں کام آئے اور ہندو
بھاگ نکلے۔ اس اثنا میں راجا کے خویشوں میں سے ایک عورت

سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھبرائی پھر رہی تھی جضرت میراں کی دفعتاً اس پر نگاہ پڑی - آپ کا تقوی اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ نا محرم عورت کو دیکھتے ہی آپ کو شرم آگئی اور آپ نے جلدی سے اپنے منہ پر نقاب ڈال لی۔ یہ موقع پاکر کافروں نے چاروں طرف سے آپ پر یورش کی اور شہید کر ڈالا - رجب کی اٹھارھویں کو یہ سانحہ پیش آیا - روشن علی درویش نے بھی خوب داد شجاعت دی اور جام شہادت نوش کیا - علیٰ ہٰذا آپ کے ماموں سید تقی و سید لقی نے بھی شہادت پائی - ان کا واقعہ انیس رجب کو ہوا -

کلیم کے بعد یہ قصہ اردو میں بہت مقبول ہوا - مختلف لوگوں نے اس پر رسائل لکھے - مثلاً "تاراگڈھ کی لڑائی مع جنگ نامۂ میراں سید حسین" جسے شیخ وزیر حسین تاجر کتب محلہ گڑھیا - دہلی نے چھاپا - سال طباعت اور مصنف کا نام درج نہیں - تعداد صفحات ۸

ایک اور رسالہ "موسوم بہ تاقعہ مشہد کی چڑھائی سنبل گڈھ کی لڑائی" من تصنیف دوست محمد خاں متخلص بدوست نقشہ نویس اجمیری - مشین پریس آگرہ میں طبع ہوا - سال طباعت تحریر نہیں - تلاش سے ایسے اور رسائل دریافت ہو سکتے ہیں -

روشن علی فقیر کا قصہ جو اوپر مذکور ہوا اگرچہ ضمنی امور میں راسا سے مختلف ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ روایت ہے جس پر راسا کے بیانات کا دارومدار ہے - راسا میں آرائشی حصہ اس سے حذف کر دیا گیا ہے -

تنقید رسالہ - یہ قصہ جو تاریخی بیانات کی تردید و تنقیص کرتا ہے صریحاً

درگاہی مجاوروں کی ایجاد ہے۔ اس میں کرامت کا جس قدر عنصر ہے وہ اسی ماخذ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ میراں سید حسین کا ایک بڑا لشکر لے کر ہمدان سے روانہ ہونا سلطان محمود کا انغ خاں یا الکخاں (الغ خاں ؟) کو اپنی فوج دے کر ان کے ساتھ کرنا میراں کے لشکر کی تعداد کا ساٹھ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل تک پہنچ جانا ایسے خط و خال ہیں جو صرف میراں صاحب کی عزت و عظمت کا سکہ ہمارے قلوب پر بٹھانے کے واسطے کارفرما ہیں جن میں اصلیت کا کوئی شائبہ نہیں۔ خود سلطان محمود اپنے کسی حملے میں اتنی بڑی فوج لے کر افغانستان کی بلندیوں سے ہندوستان کے میدانوں میں نہیں اترا۔ جنگی نقطۂ نظر سے اس کا حملۂ سومنات سب سے شاندار کارنامہ ہے۔ لیکن اس یورش میں بھی اس کی فوج کی تعداد میراں صاحب کی فوج کی تعداد سے ایک تہائی بھی نہ تھی۔ ہمارے نزدیک سارا قصہ الف سے لے کر یے تک بے سر و پا یادہ دوا ہی ہے۔ راجا پرتھی پت کے قلعے کی بلندی سات کوس ہے۔ اس بلندی پر وہ روشنی کرتا ہے جو بنجارا میں روشن علی کو نظر آتی ہے۔ وہ اس کی تفتیش میں بنجارا سے چل کھڑا ہوتا ہے۔ راجا کے حکم سے اس کی انگلی کاٹی جاتی ہے وہ اپنی فریاد لے کر مشہد مقدس سید ابراہیم محدث کے فرزند میراں سید حسین کے پاس پہنچتا ہے۔ میراں نہ کسی ملک کے والی ہیں نہ کسی والیٔ ملک کے فرزند ہیں۔ اس کی فریاد پر لبیک کہتے ہیں۔ مشہد کے ذکر سے ہمیں خیال ہوتا ہے کہ قصہ بہت ممکن ہے شیعہ حلقوں میں اختراع ہوا ہو مؤرخ فرشتہ نے سید حسین مشہدی کو شیعہ بیان کیا ہے۔ ورنہ کوئی

وجہ نہیں کہ روشن علی غزنی۔ بخارا۔ بغداد چھوڑکر مشہد کا رُخ کرتا ہی خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا میراں صاحب ایک لشکر جرّار لے کر ہندوستان آتے ہیں۔ مجاہدین کا یہ لشکر کس قدر لاأبالی ہی کہ براہ راست اجمیر جانے کی بجائے اول تو راجہ جیپال سے معرکہ آرا ہوتا ہی۔ ہمیں تو غریب راجہ کا کوئی قصور معلوم نہیں۔ زاں بعد اس کے فرزند ملتان کے راجا انند سے زور آزمائی کرتے ہیں۔ شکر ہی کہ سندھ کا ارادہ ملتوی ہوگیا ورنہ سندھ والوں کی بھی شامت آجاتی۔ ملتان سے رخصت ہوکر مجاہدین پانی پت آکر تھمتے ہیں اور راجہ چند پال کو زیر و زبر کرتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہی کہ ہندوستان کے مورخوں نے پانی پت کی اس عظیم الشان جنگ کا جو میراں صاحب نے لڑی کہیں چرچا تک نہیں کیا۔ اب بخط مستقیم یہ لشکر لشکر پہنچتا ہی اور ہندوؤں کا مقدس تالاب بیک جنبش قلم بلکہ بیک جنبش نیزہ حضرت میراں کی کرامت کی یادگار بنا دیا جاتا ہی۔

ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ راجہ جیپال کون ہی اور محمود کے عہد میں ملتان کا راجہ انند کہاں سے آگیا؟ مورخین کا بیان ہی کہ محمود کے عہد میں ملتان پر ملاحدہ کا قبضہ تھا اور محمود ان کے آخری حاکم ابوالفتح کو گرفتار کرکے غزنین لے گیا اور ملتان پر اپنا قبضہ جمالیا۔ قصے میں انند کو جیپال کا فرزند بتایا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ قصے کے بانیوں کو یہاں سہو ہوگیا ہی۔ جیپال غالباً جیپال ہی اور انند اننپال ہی جو جیپال کا فرزند تھا۔ اسی قسم کی ایک اور غلطی قصے کے بانیوں نے وہاں کی ہی۔ جہاں الغ خاں کو الغ یا الک خاں مرقوم کیا ہی۔

سب سے عجیب بات یہ ہی کہ اتنا بڑا لشکر ایک درویش کی

جو انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہوا ہے۔ کٹی انگلی کا بدلا لینے کے لیے
سنہ ۳۹۱ھ میں ہمدان سے روانہ ہوتا ہے اور تیرہ سال خاک چھاننے کے
بعد سنہ ۴۰۴ھ میں اجمیر پہنچتا ہے۔

قصے کے واضعین ہر عہد کی خصوصیات اور اوضاع و اطوار سے
واقف نہیں تھے ورنہ سید شہاب الدین کو چودہ ہزاری لکھنے کی غلطی کے
مرتکب نہیں ہوتے کیونکہ یہ دو ہزاری پنج ہزاری اور دہ ہزاری مناصب
اکبری ایجادات سے ہیں۔ اسی طرح روشن علی نام کی ترکیب ہرگز ہرگز
قدیم نہیں۔ روشن علی۔ گلشن علی۔ دلدار علی وغیرہ طرز کے نام گیارھویں
صدی ہجری میں رواج پاتے ہیں اور بخارا کی بجائے ہندوستان
میں زیادہ مقبول ہیں۔

کلیم کا بیان ہے کہ اجمیر کے دو راجا ہیں ایک پرتھی پت جو سلطان
محمود غزنوی اور میراں سید حسین کا معاصر ہے۔ دوسرا پرتھی راج جو
سلطان شہاب الدین اور خواجہ معین الدین چشتی کا ہم عصر ہے۔

خزینۃ الاصفیا

بے سروپا واقعات کے اس الجھے سوت میں
ہمیں صرف سام کا ایک تار معلوم ہوتا ہے اور وہ
میراں سید حسین ہیں۔ صوفیوں کے تذکروں میں ان کا نام میر سید حسین
خنگ سوار ہے۔ خزینۃ الاصفیا میں جو صوفیوں کے حالات میں ایک معتبر
تالیف ہے مرقوم ہے کہ وہ سادات مشہد سے ہیں اور اپنے آبائی سلسلے
کے مرید ہیں اپنے حال کے اخفا کے لیے دنیاداروں کی زندگی بسر کرتے ہیں
سلطان معزالدین محمد بن سام کی معیت میں بہ نیت شہادت ہندوستان
آئے۔ فتح ہند کے بعد جب شاہ نے قطب الدین ایبک کو دہلی میں

متعین کیا۔ میر حسین خنگ سوار کو بھی اس کی رفاقت میں چھوڑا قطب الدین نے انھیں اجمیر کا حاکم مقرر کیا۔ اجمیر میں انھیں شیخ معین الدین حسن سجزی کے ساتھ بڑی عقیدت ہوگئی اور آپ کی صحبت میں اپنا اکثر وقت گزارتے۔ چونکہ اکثر ہندو میر حسین کی ترغیب و کوشش سے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر دائرہ اسلام میں داخل ہوتے تھے اس لیے ہندوؤں کو آپ کے ساتھ عداوت قلبی پیدا ہوگئی۔ وہ آپ کی گھات میں رہتے اور موقع کے منتظر تھے، جس دن سلطان قطب الدین ایبک کی وفات کی خبر شہر میں پہنچی۔ اسی دن آپ کی فوج جو قلعے میں رہا کرتی تھی مضافات میں جا چکی تھی اور آپ قلعہ تارا گڈھ میں صرف چند آدمیوں کے ساتھ تھے۔ دشمنوں کو رات کے وقت موقع مل گیا وہ ہجوم کرکے چڑھ دوڑے اور میر ممدوح کو مع ان کے متعلقین و توابعین کے شہید کر دیا۔ صبح ہونے پر جب یہ اطلاع شہر میں پہنچی۔ خواجہ معین الدین اپنے مریدوں کے ساتھ قلعے میں تشریف لائے اور آپ کی تجہیز و تکفین کی۔ بقول صاحب معارج الولایت آپ کی شہادت ؁ میں ہوئی (خزینۃ الاصفیا ص۲۵۵-۲)

اب ظاہر ہے کہ میراں سید حسین مشہدی المشہور بہ خنگ سوار ایک تاریخی بزرگ ہیں اور اجمیر کے پہلے حاکم جو ہندوؤں کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

تاریخ فرشتہ تاریخ فرشتہ میں ان کے متعلق خواجہ معین الدین چشتی کے حالات میں عبارت ذیل ملتی ہے:-

ذیل ملتی ہے:-

"وسید السادات سید حسین مشہدی المشہور بہ خنگ سوار کہ شیعہ مذہب بود وبصلاح وتقویٰ آراستہ درسلک اولیاء اللہ انتظام داشت وسلطان قطب الدین ایبک اورا داروغہ آں بلدہ (اجمیر) ساختہ بود قدوم شیخ را باعزاز واکرام تلقی فرمود وچوں از علم تصوف واصطلاحات صوفیہ بہرۂ تمام داشت صحبت خواجہ را نعمت شگرف دانستہ اکثر اوقات بہ مجلس شریف حاضر می شد وبسیارے از کفار اجمیر بہ برکت انفاس آں پیر طریقت بہ شرف ایمان مشرف گشتند وآنانیکہ ایمان نیاوردند محبت خواجہ را در دل جائے دادہ پیوستہ فتوح بے حد وعد بحضرت او می فرستادند"

(صفحہ ۳۷ جلد دوم نول کشور)

سیر العارفین

لیکن سب سے قدیم وہ روایت ہے جو سیر العارفین جمالی میں ملتی ہے وہو ہذا:-

"حضرت سلطان قطب الدین ایبک خدمت سید السادات حسین مشہدی را در آں مقام بداروغگی گزاشتہ بود۔ سید مذکور دولت اقدام ونعمت صحبت ایشاں (شیخ معین الدین حسن سجزی) را غنیمت شمرد وبیشترے از کفار آں دیار از برکت آثار آں زبدۃ الابرار بہ تشریف ایمان مشرف شد وبیشترے کہ ایمان نیاوردند فتوح بیحد وبعد بحضرت ایشاں می فرستادند"

ان بیانات سے صاف روشن ہے کہ سید حسین خنگ سوار قطب الدین کے مقرر کردہ حاکم اجمیر تھے۔ اب ان کا دو صدی پیشتر سلطان محمود غزنوی کے عہد میں پیر روشن علی کی کٹی انگلی کی حمایت میں ہندوستان آنا من قبیل محالات ہے۔ مشکل یہ آنپڑی ہے کہ ہماری تاریخ کے معلوم و مشہور

ماخذ روشن علی اور اس کی کٹی انگلی کے قصے سے بالکل ناواقف ہیں جس سے یہ قیاس لگانے کی کافی وجہ پیدا ہوجاتی ہو کہ روشن علی کا افسانہ بہت بعد میں وضع ہوا ہو۔ اگر اس میں کچھ بھی قدامت ہوتی تو کم ازکم صوفیہ کے تذکروں میں کہیں نہ کہیں اس کا ضرور ذکر آجاتا

جواہر فریدی جواہر فریدی تصنیف ۱۰۳۳ھ میں سید حسین مشہدی کا ذکر شیخ معین الدین کے تاہل کے سلسلے میں ملتا ہی چنانچہ:-

"بہ ثبوت پیوستہ کہ حضرت خواجہ اول بار از اجمیر بہ دہلی رفت و باز آمد ایشاں را تاہل واقع شد و آں چناں بود کہ سید وجیہ الدین محمد مشہدی کہ عم سید حسین مشہدی داروغہ خطہ اجمیر بود دخترے داشت در کمال عفت و عصمت بہ بلوغ رسیدہ می خواست کہ در حبالہ کسی بزرگ زادہ در آرد ہیچ کس را درخور کمال و لائق حال نمی یافت کہ بدو پیوندی فرماید اکثر دریں تامل و تفکر می ماند۔ ناگاہ شبے از شبہا حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ را در خواب دید کہ می فرماید فرزندم وجیہ الدین اشارت از حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم چنین است کہ دختر عفت نشان خود را با خواجہ معین الدین چشتی بسپارد در حبالہ او در آر۔ سید وجیہ الدین مذکور حسب الارشاد دختر خود را بہ حضرت ایشاں نکاح کرد" (ص ۱۶۲ جواہر فریدی۔ وکٹوریا پریس لاہور ۱۳۰۱ھ)

تقریباً یہی بیان کتاب چشتیہ بہشتیہ تصنیف مخدوم علاء الدین ثانی برناوی تالیف ۱۰۶۵ھ اور روضۂ اقطاب از محمد بولاق مؤلفہ ۱۱۲۴ھ نیز مفتاح العارفین از عبد الفتاح بن محمد نعمان میں ملتا ہی جس سے ثابت ہی کہ شیخ معین الدین نے میران سید حسین خنگ سوار کی چچا زاد بہن بی بی

عصمت دختر سید وجیہ الدین مشہدی سے نکاح کیا تھا۔ یہاں شیخ معین الدین
کے تاہل کی داستان معرض بحث میں نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ سید
حسین خنگ سوار خواجہ معین الدین چشتی ولی الہند کے معاصر ہیں۔

مونس الارواح

اسی نقطۂ نظر سے جہاں آرا بیگم بنت شاہ جہاں بادشاہ
کی تالیف مونس الارواح سے ایک اقتباس ذیل
میں درج کیا جاتا ہے:-

"حضرت پیر دستگیر وقتی کہ متوجہ اجمیر بودند از لاہور بہ دہلی رسیدند
چندگاہ در آنجا اقامت نمودند۔ چوں ازدحام و ہجوم خلق بر ایشاں بسیار شد
بہ جانب اجمیر متوجہ گشتند و در آں مقام سعادت فرجام اگرچہ فی الجملہ رونق
اسلام بود اما کفار فجار غلبہ داشتند۔ سلطان قطب الدین خدمت داروغگی
آں خطۂ شریفہ را بہ سید حسین کہ در عرف ایشاں را خنگ سوار میگویند فرمودہ
بود۔ سید مذکور عطیۂ قدوم سعادت لزوم حضرت پیر دستگیر را دولت عظمیٰ
دانستہ ہمیشہ در صحبت فیض بخش آں حضرت بسر می برد و از برکت مقدم
شریف آں حضرت بیشترے از کفار نابکار آں دیار را بہ تشریف ایمان و
اسلام مشرف گردانید و ہر کس کہ ایمان نمی آورد بہ طریق جزیہ نذر و نیاز بسبب
حضرت پیر دستگیر می فرستاد چنانچہ تا ایں وقت رسم فرستادن نذر و نیاز از اولاد
آں ہا بہ روضۂ متبرکہ آں حضرت برحال است و ہر سال بہ زیارت روضۂ
منورہ آں حضرت می آیند و سر نیاز بر آں آستان قدسی نشان می نہند۔"

سیر الاقطاب

اوپر کی روایت میں اس وقت تک کوئی گنجلک اور
تضاد و تخالف نہیں لیکن کتاب سیر الاقطاب [illegible] جو
میں بہ عہد شاہ جہاں بادشاہ تالیف ہوتی ہے۔ اس کا مصنف شیخ الہ...

بن شیخ عبدالرحیم بن حکیم بینا روایت ہذا کو بالکل نیا پیچ دے دیتا ہے جس سے واقعات میں بہت کچھ الجھن اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ الہ دیا اپنے بیان کا کوئی حوالہ نہیں دیتا مگر کہتا ہے کہ جب شیخ معین الدین مدینہ رسول میں حاضر ہوئے ایک روز روضۂ مبارک کے پاس آپ پر عجیب حالت طاری ہوئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ دربار رسول میں حاضر ہیں۔ میں مصنف کے اصل الفاظ نقل کرتا ہوں۔

"دیدند کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم می فرمایند کہ معین الدین تو معین دین مائی ولیکن ترا بہ ہندوستان باید رفت۔ در آنجا مقامی است اجمیر نام۔ آں جا از فرزندانم سید حسین نام بہ نیت غزوہ و جہاد رفتہ بود۔ اکنوں او شہید شدہ است و باز آں مقام بدست کفار آمدہ بہ یمن قدومت در آنجا اسلام آشکار خواہد شد و کافران مقہور گردند۔ پس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اناری بد خواجہ داد و فرمود کہ دریں نگاہ کن تا بہ بینی و بدانی کہ ترا کجا باید رفت۔ حسب الحکم خواجہ در انار نظر کرد از شرق تا غرب آں چہ بود ہمہ بدید و شہر اجمیر و کوہ ہائے او بہ خوبی نظر کرد۔ التماس فاتحہ نمود و استمداد از آں درگاہ رشک عرش طلب نمودہ متوجہ ہندوستان گردید و ہمگی چہل مرد ہمراہی اختیار کردند تا بعد چندگاہ بہ ہندوستان تشریف ارزانی فرمود۔" (۱۲۴)

گویا اس ہدایت و بشارت کے زیر اثر آپ ہندوستان تشریف لائے۔ سید حسین سے مصنف کی مراد وہی سید حسین خنگ سوار ہیں۔ گویا یہ ابتدائی کوشش ہے جس میں سید حسین کو شیخ معین الدین سے اقدم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اس روایت کے اس حصے سے جو زمانہ

رویا و کرامت و سحر و طلسم سے تعلق رکھتا ہے۔ اعراض کرکے کہتا ہوں کہ جب شیخ اپنے چالیس ہمراہیوں کی معیت میں اجمیر پہنچ کر اناساگر پر ٹھہرتے ہیں اس وقت ایک شخص آکر آپ کو (بالفاظ مصنف) اطلاع دیتا ہے:-

"القصہ چوں آں حضرت بہ اناساگر سکونت نمود شخصے بعرض رسانید کہ یا حضرت ایں ہماں مقام است کہ میر سید حسین خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ وقتیکہ بتسخیر ایں دیار آمدہ بود درینجا بسر می برد و ایں حوض را ہماں مرتضوی انتساب بنا نمودہ حضرت خواجہ فرمود الحمد للہ تعالیٰ کہ بر ملک برادر خود متصرف شدم (صفحہ ۱۲۵)"

اس کے بعد مصنف شیخ معین الدین کے تاہل کے سلسلے میں اسی قدیم روایت کو دوہراتا ہے اور خود سید وجیہ الدین کو اجمیر کا حاکم بیان کرتا ہے

"میر سید وجیہ الدین مشہدی در اجمیر حاکم بود۔ دخترے داشت پاک و پارسا بی بی عصمت نام۔ چوں بہ حد بلوغ رسید پدرش می خواست کہ در نکاح شخصے در آرد" (صفحہ ۱۳۲) بالآخر شیخ معین الدین سے بی بی عصمت کا نکاح ہوتا ہے

"پس عقد نکاح بستند و بی بی عصمت را کہ وے عمہ میر سید حسین خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ است بخانہ آوردند و بعد ہفت سال از پیدائش آں حضرت رحلت نمودند۔ (صفحہ ۱۳۵)

سیر الاقطاب کے متعلق مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ شیخ معین الدین کے تعلق میں یہ تالیف کئی افسانوں کی واضع ہے مثلاً اجے پال جوگی اور شادی دیو کا افسانہ۔ اس تالیف میں اور بھی ایسا مواد ہے جو اس سے اقدم تالیفات میں نہیں ملتا لیکن ان امور کی تفصیل ہماری موجودہ بحث سے خارج ہے۔ ہمارے لیے اسی قدر جاننا کافی ہے کہ مصنف سید حسین خنگ سوار کو بجائے شیخ معین الدین کا معاصر ماننے کے شیخ سے اقدم

ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور سید کو ایک نئی تحریک جہاد کا بانی اور شہید بتاتا ہے بلکہ نہایت ہوشیاری سے یہ قصہ خود شیخ معین الدین کی زبان سے ادا کرتا ہے۔

بہرحال اس روایت کی ابتدائی شکل وہ ہے جو ہم سیر الاقطاب میں دیکھتے ہیں اور تکمیل یافتہ شکل وہ ہے جو راسا اور کلیم کے منظوم رسالے میں نظر آتی ہے۔

تذکرۃ الابرار والاشرار مزید تلاش سے واضح ہوتا ہے کہ روایت ہذا اپنی قدیم تر شکل میں ہندوستان سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ افغانستان سے اور سلطان محمود سے منسوب ہے نہ میران حسین خنگ سوار سے۔ اخوند درویزہ ننگرہاری ان مشہور علما سے ہیں جنھوں نے دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اپنی مجاہدانہ جدوجہد اور عالمانہ وعظ و تذکیر سے افغانستان میں پیر روشنائی کی مذہبی تحریک کو رواج عام میں آنے سے روک دیا تھا۔ موصوف اپنی قابل قدر تصنیف تذکرۃ الابرار والاشرار میں اس روایت کی قدیم شکل بالفاظ ذیل حوالۂ قلم کرتے ہیں:۔

"آوردہ اند کہ یکے از مسلمانان در ہند رفتہ بود۔ زنے را دید کہ جغرات می فروخت۔ انگشتے را در آوردہ تا بچشد۔ زن کافر در حال دیگچہ را بر زمین زد و بشکست و فریاد بحاکم کافر رسانیدہ کہ مسلمان جغرات مرا مردار ساخت نعوذ باللہ من کفرہم۔ بعد از انصاف کافرانہ ایشان مصلحت آں دیدند کہ انگشت مبارک آں مسلمان را بریدند۔ آں مسلمان عرض حقارت اسلام و مسلمانان را درمیان ہندو ہندوان بحضرت سلطان محمود غازی رسانید۔

آں زماں بر سلطان فکر ایں مہم اسلام فرض شد۔ بعد از اہتمام لشکر و تجہیز
عسکر حضرت سلطان از راہ کابل بہ ہند در آمدہ چند بار در محاربہ کفار فتح یافتہ
آخر الامر کفار تغلب نمودہ سلطان شکست یافتہ باز بولایت و مملکت خود
رسیدہ۔ آخر الامر مصلحت آں دیدہ کہ چوں مردم افغانان مسلمانان اہل سنت و جماعت
اند و مردم باہیبت و طائفۂ باشجاعت و صلابت اند۔ ہمراہ گیرد۔ پس چناں کہ
رسم افغانان است ہر کہ بہ طریق عجز و حقارت در خانہاے ملکان ایشاں در
آید و دیگ ایشاں را بر دیگدان بار کند ایشاں تمام اولس جان و مال بازند
تا ہم آں کس را کفایت کنند۔ سلطان نیز ہمیں روش بجاے آورد و بعد
ازاں از اولس افغانان چہار دہ ہزار سوار و چہار دہ ہزار پیادہ ہمراہ
شدند و یگاں یگان زن را ہمراہ خود ساختہ چہ افغانان را قاعدہ است
درہیجے کہ با زنان روند۔ البتہ خود ہا را بہ کشتن قرار دہند و نیت گریز و فرار
نہ کنند و اگر ہم میسر شود ہماں جا آبادان شوند و مردم آں حدود را کم نہ سازند
بعضے را بہ کشتند و بعضے را بردہ کنند و بعضی را رعیت عاجز سازند۔ پس از راہ
ملتان بہند در آمدند تا بہ توفیق اللہ تعالیٰ فتح ہند میسر شد۔ ازاں باز افغانان در ہند
ماندند۔ بعضے را در قندہار ماندند و بعضے بہ ہند رفتند و بعضے باطراف دیگر
پریشاں شدند"

تذکرۃ الابرار عہد جہانگیر بادشاہ کی تالیف ہی۔ اس عہد میں یہ روایت
مذکورۂ بالا صورت میں مشہور ہی۔ درویش چراغ علی کا نام اس روایت میں
مذکور نہیں۔ راوی کا صریح مقصد افغانوں کی کلاہ عزت میں طرۂ افتخار لگانا
ہی نہ حضرت خنگ سوار کی شہرت کو منظر عام پر لانا۔

رسالۂ اسرائیلیہ یہی روایت رسالۂ اسرائیلیہ میں بھی ملتی ہی جو افغانوں کے دعوے بنی اسرائیلیت کے سلسلے میں ایک تفتیش ہی۔ یہ رسالہ میجر ہربرٹ ایڈورڈ ڈپٹی کمشنر و سپرنٹنڈنٹ اضلاع قسمت پشاور کی فرمایش پر مولوی محمد علی خاں نے ۱۲۷۴ھ میں تالیف کیا ہی۔

مصنفین طبقات اکبری و منتخب التواریخ کے مقابلے میں ابوالفضل کا میراں صاحب کے ساتھ منکرانہ رویہ اسلام کے ساتھ اس کی عام بداعتقادی کی روش کے عین مطابق ہی مگر میراں صاحب کے ماننے والوں کی کسی زمانے میں کمی نہیں تھی۔ خواجہ صاحب کے بعد وہ اجمیر کے سب سے بڑے ولی مانے جاتے ہیں۔ ہر سال رجب کی ۱۶ سے ۱۸ تک ان کا عرس رہتا ہی جس میں ہزاروں مرد عورت زیارت کو آتے ہیں۔ نذریں چڑھاتے ہیں۔ مرادیں مانگتے ہیں۔ ہندو بھی شریک ہوتے ہیں۔

میراں صاحب کی درگاہ میراں صاحب کی درگاہ کا دروازہ بلند دروازے کے نام سے موسوم ہی جو غالبًا اسم بامسمی ہی۔ اس کی بلندی چونسٹھ فٹ اور چوڑائی سترہ فٹ ہی۔ یہ دروازہ اسمٰعیل قلی خاں نے ۹۷۶ھ میں بعہد اکبر تعمیر کرایا تھا۔ 'کاخ دلکشا' سے بہ حساب ابجد تاریخ برآمد ہوتی ہی جو ذیل کے قطعہ میں درج ہی۔ قطعہ

بعہد پادشاہ آسمان قدر	پناہ ملک و ملت ظل یزداں
جلال الدین محمد اکبر آں شاہ	کہ دارد در نگیں ملک سلیماں
بدیں درگہ کہ ہم چو کعبہ آمد	سوادش عین نور و نور اعیاں
بنا فرمود ایں ایوان عالی	کریم الذات اسمٰعیل قلی خاں
'زکاخ دلکشا' تاریخ اتمام	اگر خواہد کسی می یابد آساں

جلال الدین اکبر بادشاہ ایک خاص حصۂ عمر تک حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ساتھ کمال عقیدت رکھتا تھا اور ہر سال آپ کے مزار کی زیارت کے لیے اجمیر آیا کرتا تھا۔ اس تقریب سے کئی مرتبہ میراں صاحب کے مزار پر بھی حاضر ہوا ہے۔

گنج شہدا کی چار دیواری وزیر خاں نے بہ عہد جہانگیر ۱۰۲۲ھ میں کھڑی کرائی۔ درگاہ میں دو دیگیں ہیں۔ پہلی دیگ خود جہانگیر کی بنوائی ہوئی ہے۔ دوسری ملا مداری کی یادگار ہے جو غالباً وزیر ریاست گوالیار تھا۔ اس دیگ پر یہ قطعہ کندہ ہے:-

صرف زر ملا مداری کرد در تعمیر دیگ	باد نامش در جہاں روشن بہ مثل آفتاب
بختور رہتہ اسکے چندش نمودہ اہتمام	گفت ہاتف سال تاریخش جہاں شد فیضیاب

'جہاں شد فیضیاب' مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۶۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔

مزار پر جو عمارت مع گنبد د کلس طلائی ہے اعتبار خاں خواجہ سرا نے جہانگیر کے عہد میں بنوائی ہے جیسا کہ قطعۂ ذیل سے معلوم ہوتا ہے:-

شاہنشہِ زمانہ جہانگیر بادشاہ	کاندر زماں او شدہ آسودہ دل جہاں
سال دہم زعہد جلوس مبارکش	شد فتح ملک رانا ازاں شاہ کامراں
وقتے کہ اندر اجمیر آں شاہ گنج بخش	بر تخت زر نشستہ بداز فتح شادماں
بود از ہزار افزوں بست و چہار سال	گیتی ز عدل و دادش چوں روضۂ جناں
بر روضۂ مقدس سید حسین کرد	ایں پنجرہ ز صدق و صفا اعتبار خاں

معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے اپنے اقتدار کے دور میں میراں صاحب میں خاص دلچسپی لی ہے۔ روضۂ شریف کے غرب میں سات در کا دالان سنگ مرمر کا جو نہایت خوش وضع ہے گماشجے راو سیندھیا نے ۱۲۲۷ھ میں تیار کرایا

اس کی تاریخ تعمیر اس قطعہ سے برآمد ہوتی ہے:-

معدن نور منبع اسرار ہست درگاہ شاہ خنگ سوار
ساخت دالان کہ ہست رشک بہشت راؤ کمانجی سیندھیا بوقار

در رشک بہشت، مادۂ سال ہے۔ دو سال کے بعد اسی کمانجی راؤ نے احاطہ بھی تیار کرایا جس کا قطعۂ تاریخ یہ ہے:-

کمانجی راؤ چوں کردہ بنائے مکان پر فضا بر کوہ محکم
پئے تاریخ جستم گفت ہاتف احاطہ تا قیامت باد دائم

دیگر مقامات پر درگاہیں

یہاں اس قدر اور عرض کیا جاتا ہے کہ میراں صاحب کی شہرت قلعہ تاراگڑھ اور اجمیر تک ہی محدود نہیں بلکہ دور دور پھیلی ہوئی ہے۔ راجپوتانہ گزٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے نام پر ایک درگاہ بجنور میں بھی تعمیر ہوئی ہے۔ ایک درگاہ شہر بوندی کے قلعہ والی پہاڑی سے ملحق مغربی پہاڑی پر موجود ہے، جسے بوندی کے کسی معتقد راجا نے بنوایا تھا۔ سرکاری رپوٹ کا بیان اجمیر کے اس پہلے مسلمان حاکم کے تعلق میں نہایت غیر ذمہ دارانہ اور گمراہ کن ہے مگر چونکہ اس کو سرکاری حیثیت مل گئی ہے اس لیے اوروں نے بھی اعتبار کر کے اس کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ نارتھ انڈین نوٹس اینڈ کویریز (شمالی ہند کے تعلیقات و استفسارات) کے ستمبر ۱۸۹۱ء کے پرچہ میں صفحہ ۱۰۸ پر نمبر ۲۰۷ و بہ عنوان 'میراں صاحب جادوگر' یہی روایت عیناً نقل ہوئی ہے۔

گیت میراں سید حسین

ذیل میں ایچ۔ اے روز کی تالیف 'پنجاب کے قبائل اور اقوام' جلد اول صفحہ ۶۶۶ سے ایک گیت جس کا عنوان 'گیت میراں سید حسین دلی' ہے درج کیا جاتا

د۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گیت گزشتہ صدی میں بہت مقبول تھا وہو ہذا:

شیخ مصاحب بزرگ تھے دانا میراں سید حسین ناں چاڑھیا دوگانہ
شیخ صاحب لیلے مسلاہ خاصی پوشاک منگائی
چیرا ہرا بھیرا تھا جامہ پٹکا ہرا کمرسے بھاری
ہری ڈاب تلوار نال جی سو کمر بیچ لٹکائی
گینڈے کی کھال پر ہرا پھول جی روغن کی چمکے سیاہی
خاصہ کٹار پر ظالم دھار جی کوتھی مینے کی ہری لگائی
تکے ہرے بھرے تھے ترکش تیس سن چاتر چیترائی
نیزہ ہرا ہری تھی برخ (برق) ہری بھوندی سی ناں جہاں نائی
خان کا گھوڑا ساز سب زین ہرا جی اور سر کلغی ہری سہائی
ہرا پوشش اور بکتر پوش جی اور میراں کے سنگ چلتے سو زرہی
میراں بھئے اسوار جنگ کے اوپر سانگ ہری فوج بنائی
کافر بہت ترک تھے تھوڑے میراں سید حسین سیدھے کیے گھوڑے
میراں نے سیدھے کیے گھوڑے باجے طبل اور تکورے
علی علی کرکے جوڑے رن میں لڑتے نا راسورے

میراں کی چلی حال اسواری

فوجوں گڈ بڈ بہیں حال لیا تیغے کو نکال
لڑتے آپا میں سہال رن میں پھیلا ہے گلال

رن کی سنو بیس تیاری

رن میں ہوتے لاگی ترولیا پٹھے رجھوتاں ماری گولی
ایسی مچی جیسی ہولی بھیگی رکتوں میں چولی

چھوٹ رکت بھری پچکاری

اُٹھی آندھی تو گمبھیر اڑتی ریتا جوں عبیر
چھوٹے بلچھی اور تیر ڈوبا لوہو میں شریر

وہاں پڑا جدھ اک بھاری

رن میں کودا اک شیخ مولیٰ رکھتا اس کی ٹیک
تارا سنگھ آیا دیکھ اس نے برچھی ماری پھیک

تارا نے سمٹ سانگ جب ماری

زخم شیخ ابو نے کھایا اور ان کو مولیٰ نے بچایا
سوتے تیغے کو لگایا کاٹ تارا کو گرایا

راجا کے لگا زخم تن کاری

گئی کافر کی جان اور جلتا دوزخ کے درمیان
لڑا میراں کا جوان ہوا مولا لہر وان

راجا کی بھاگ گئی فوج ساری

خبردار خبریں دیں راجا یہی عرض ہے میری
کھیت رکھا میراں جی کے ہاتھ دھن دھن سید اور سادات
لڑتے گزری ساری رات کہی ہلکارے نے بات

راجا کی گھونگھٹ فوج کھا گئی ساری

جب تارا مارا گیا میراں فتح کری کرتار
خبر بھئی پرتھی راؤ کو سن اُلٹی کھائی پچھاڑ
کوئی لاوے لوتھ اٹھا کے یوں حکم آپ راجا کرا
راجا فرماوے بھائی کو بلاوے

ارے آئی رے بھائیا مانو بات ہماری
تارا مارا جا دے نا تجھے لاج آوے
ارے آئی رے بھائیا لوٹی با نہ ہماری
نہیں اوتار لیں گے اسی جگت میانے
بار بار جنموں نہیں تمھاری . . . .
اس زندگی سے ہی مرنا خاصا ارے آئی رے بھائیا کروں تیاری
راجا سن لیجے مجھے حکم دیجے گروں جاے رن میں کروں مار بھاری
راجا فرمایا ڈنکا دلوایا آئی سن کر فوج سمٹ کر ساری
آئے راجپوت وکتنے راجا ہنکے فیل اسوار بڑے بڑے چھتر داری
پانچوں ہتھیار راجا آپ ساجا ترکش تیر تلوار اور ڈھال کاری
دیا ٹوپ سر پر لیا پہن بکتر راؤ کمر کے بیچ میں کھونسا کٹاری
راجا آپ ہیرا لاؤ ہاتھی میرا جس پر جھول کنچن کی ہی جھلکاری
کشنا چڑھا بیٹھ ہاتھی کی اور کرکو دامیگل اسواری
کشنا ہاتھی پر چڑھا یاد سنبھو کو کرا
تھا وہ غصہ میں بھرا ہولا آگے کو بڑھا
راجا لیے کٹک فوج دل بھاری
من میں یاد شنبھو کو کرے جب کشنا ہاتھی پر چڑھے
بھائی کا بدلا لیجو جاے کے یوں حکم آپ راجا کرے
پرتھی بات کرے بھائی سے تم جاے ترک کو مارو
اس کو مارو اس کی لشکر لوٹو یوں راجا جواب مہکارد
کشنا بات کہی بھائی جو بدھنا لکھا لیلا ڑو

قسمت کے لکھے ہوں گے سو ہی جو رچا آپ کرتار و
راجا بے یقیں نہیں سمجھے دین رے وہ راجا بڑا اگن دار و
اس کے سہس ہاتھی کور ہیں سنگ بے شمار اسوار و
بڑی بڑی توہیں راجا جیتوا کے لیے کھنچیں بان سب نیار و
راجا پہنچا جائے کٹک دل اندر جہاں لوتھوں کی پڑے کرار و
چیل اور گدھ مری رہے رے اور لے شمبھو کا نام سانگ جا گاڑو
راجا پہنچا آن جہاں تھا میدان جی اور ہاتھی پر سے کتنا کھڑا للکارو
ای مسلمان میراں سلطان لوٹ کہاں ان کیوں نہ لڑو آن جی

جن نے مارو بیر ہمار رو

خبر دار خبریں دی کھڑے کہیں میراں سے حال
رن میں مردوں طبل بھرے بجائے سنو زید علی کے لال
خبر دار جاسوس نے خبریں دیں اجی اجی میراں آیا چڑھ راجہ
چڑھے حال للکار کے آپ میراں ہی گا خنگ چڑھنے کا دن آج
میراں نے فرمایا خنگ کو منگایا جس پر زین کنچن کی شکل ساجہ
چڑھیں شیخ شہاب اور ستنجاری چڑھیں رومی حلبی و ایران سیاری

چڑھیں حال للکار کے دین کا جہ

میراں پہنچے آن جہاں تھا میدان جی گئے بھاگ کافر جب ہمت ہاری
جہاں رن کھمبھا گاڑا سید وہیں ٹھہرا بھرے سورے سورن کے کافر بھاگے
راجا پہنچا آن جہاں تھا میدان جی اور ہاتھی پر سے کھڑا کتنا للکارے
میراں کھڑے سر لکھ دیتے جواب شیر سر لکھ آوتے کیا ہے گیدڑ کی تاب
میراں کو دیکھ راجا کہنے لاگا ابھی ہے بالی عمر نادان

سکے کو پھر جائیو تو کہا ہمارا مان

لو کہا مان میرا سلطان جی — یہاں ناحق جان گنوا یو
میں ماروں تمہیں لاج آئے مجھ کو — یوں راجا جواب سنایو
میراں کلموں لکھ جھڑیں پھول جی — میراں سن کے بات مسکایانو
راجا تجھ کو ماروں تیرے گڑھ کو لوٹوں — ای نہیں دین نبی کا مانو
اتنا سخن سنا راجانے — وہ غصہ جوڑ دل کھانو
راجانے اپنی فوج کو لیا بلائے — راجپوت راؤ کیا رانو
مین پوری چوہان بندیلا — رہے ان کے بیچ لے چانو
میراں کو چاروں طرف سے لیا گھیر کے — جیسے بدلی میں چاند چھپانو
میں کہاں تک صفت کروں سید کی — جن کی ثنا کیں جگت بکھانو
جس وقت میراں پکڑیں شمشیر کو — راجا کی ساتوں صورت گھلانو
پکڑ شمشیر لے دست میں — سورن کے بیچ میراں کھرو
ارے راؤ کلمہ سن لیجو — سو حال کلمہ لکھ سے بھرو
ارے راؤ کلمہ لینا مان کہا — پڑھو حال کلمہ میراں فرمایا رے
راجا سن پاوے غصہ جی میں لیاو — ان نے اپنی فوجوں کو بلوایا رے
راجا حکم کیا توپیں داغ دینا — دھواں دھار غبار سر پانیاں رے
عشق فلک توپیں چھوٹیں دن رات — دھن دھن جن باں کرکے گولہ آئیاں رے
سکا تا کھا کر کے ہوائی تو باں چھوٹیں — جیسے کھک اور سور مچایاں رے
تن من کا فر جو گرے وہاں تو گولی رہے — جیسے اندر برست جھڑلایاں رے
میراں سید حسین لیے کمان دستوں — غصہ کر کر کے کڑکائیاں رے
میراں کے تیر چھوٹے آکر ان پڑے — سانانا ناں کرکے وہ پھین نیاں رے

لاگا تیغا چلنے سن کے کار بھاگے ٹوٹے تیر تلواروں جھن نائیاں رے
نیزہ کھود بکتر وہاں توگریں کٹ کٹ لاگا تن میں زخم وہ جھل کا نیاں رے
سور بیر لڑے رن کے درمیان جی اور چھاتی سے چھاتی بھڑکائیاں رے
جوگن لال کارے شمبھو سانگ گارے وہ کنٹا راو پر نوبت آئیاں رے

پرتھی راج، پرتھا بائی اور راول سمرسی کے فرامین و اسناد

چند تحریروں کے نقلیں "تلاش ہندی مخطوطات" کی سالانہ رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۰۰ء مرتبہ جناب شیام سندر داس بی۔ اے، آنریری سکریٹری ناگری پرچارنی سبھا بنارس، شائع کردہ گورنمنٹ یو۔ پی، طبع الہ آباد سنہ ۱۹۰۳ء سے ماخوذ ہیں۔ ان کے متعلق جناب مرتب کا دعویٰ ہے کہ یہ تحریریں پرتھی راج اس کی بہن پرتھا بائی اور بہنوئی رانا سمر سنگھ کے فرامین ہیں جو اچارج ریکیس کے نام جاری ہوے ہیں۔ یہ اچارج اس زمانے کا ایک طبیب تھا جس کو پرتھی راج نے اپنی بہن پرتھا بائی کی راول سمر سنگھ کے ساتھ شادی کے موقع پر جہیز میں دیا تھا۔

ان فرامین سے جن کی مجموعی تعداد دس ہے۔ میں نے چھ کا انتخاب کر لیا ہے نقلوں کے علاوہ ان کا ترجمہ بھی یہاں دے دیا ہے۔ ان میں تین پرتھی راج کے ہیں جن پر اس کی مہر بھی مع سمت ۱۱۲۲ درج ہے جو غالباً اس کی گدی نشینی کا سال ہے۔ ایک پروانہ پرتھا بائی کا اور دو پروانے سمر سنگھ

کے ہیں۔

پرتھی راج راسا میں جو غیر بکرمی سمت دیا گیا ہے وہی سمت ان فرمانوں اور پروانوں میں بھی موجود ہے جو بکرمی سمت سے نوّے اکانوے سال کم ہے۔ چنانچہ اسی سمت کی تائید میں پنڈت وشنولال موہن لال پنڈیا نے (جن کا تبصرہ آگے آتا ہے) ان فرامین کو سب سے پہلے شایع کیا تھا۔ سیام سندر داس ان کے مقلد ہیں۔ پنڈیا جی اس کو انند وکرمی سمت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

جس طرح راسا کے بیانات غیر تاریخی اور خیالی ہیں اسی طرح یہ فرامین بھی وضعی اور جعلی ہیں۔ پرتھی راج کا زمانہ سمت ۴۹-۱۲۳۶ بکرمی ہے اور راول سمر سنگھ کا زمانہ سمت ۵۸-۱۳۳۰ بکرمی ہے۔ چونکہ ان میں پوری ایک صدی کا بُعد ہے۔ اس لیے پرتھی راج کی بہن کی شادی سمر سنگھ سے نہیں ہو سکتی اور رشکیس کا وجود بھی جو پرتھا کے جہیز میں دیا جاتا ہے فرضی ٹھہرتا ہے۔

ان فرامین کا خط پرتھی راج کے عہد کا نہیں ہے بلکہ مروجہ خط سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ ان کی زبان بھی جدید ہے۔ پہلے پروانے میں یہ الفاظ مسلمانی ہیں:۔

دائجے (دہیز۔ جہیز) ناکی۔ جنانہ (زنانہ) بروبر (برابر) جاکر۔ جما کھاتری (جمع خاطر) پروانا (پروانہ)۔

تیسرے فرمان میں یہ الفاظ ہیں:۔

ہدستھان (ہندوستان) تکھت (تخت) ہک (حق) سابت (ثابت) اولاد۔ جما کھاتری (جمع خاطر)۔

چوتھے میں:۔

کھاس (خاص)، روکا (رقعہ)، ہاجر (حاضر)۔
پانچویں میں :۔
ہجور (حضور) کھاس (خاص) روکا (رقعہ) کاگد (کاغذ)، ہکم (حکم) تاکیـد۔
چھٹے میں :۔
ہندوستھانم (ہندوستان) تکھت (تخت) دوا۔ آرامن (آرام) روپیا (روپیہ) کھرچا (خرچہ) کھجانن (خزانہ) ماف (معاف) ہکم (حکم)۔
ساتویں میں :۔
آدا دان (آبادان) جماکھاتری۔
ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الفاظ رواج ہند کے ماتحت آکر مقامی شکل بلکہ بعض اوقات نئے معنے اختیار کر لیتے ہیں مثلاً دہیز کا دایجا۔ معاف کا ماف۔ آرام کا آرامن بن جانا۔ تاکید بہ معنی نشانی، ہجور (حضور) رؤسا و راجگان کے لیے خطابی اصطلاح ہے۔ "روپیہ" سکے کے معنوں میں بہ حیثیت اصطلاح اکبر کے عہد سے ملتا ہے۔ اور سنہ ۷ جلوس ضرب آگرہ کے سکے میں پہلی مرتبہ نمودار ہوتا ہے۔ اس کی عبارت ہے۔
طرف اول :۔
خورداد ۴۷ الٰہی "روپیہ" ضرب اگرہ
طرف دوم :۔
"اللہ اکبر" جل جلالہ۔
رقعۂ خاص، مغلوں کے عہد میں خاص اصطلاح تھی جس سے مراد ہے شاہ وقت کا اپنا دستخطی رقعہ ہوتا تھا۔ "سہی" (صحیح) پھر مغلی عہد کی یادگار ہے

جو فرامین حکمراں وقت کے مصدقہ ہوتے تھے ان کی پیشانی پر صاد علامت صحیح بنا دیا جاتا تھا۔ ہندی میں تقلیداً "سہی" لکھا جانے لگا۔

"زنانہ" راجپوتی حرم سرا کے واسطے اسی وقت استعمال میں آیا ہوگا جب مسلمانوں کی تقلید میں راجپوتوں نے پردے کی رسم اختیار کر لی ہے۔ "باجی صاحب" کی ترکیب بالکل جدید ہے۔ "صاحب" کا یہ استعمال زمانۂ حال سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی حالت "کا" اضافت اور "گا" علامت مستقبل کی ہے۔

ذیل میں ان فرامین کی اردو نقل اور ترجمہ دیا جاتا ہے:-

(۱) سہی

سوستی سری سری چترکوٹ مہاراج دھراج تپ راج سری سری راول جی سری سمرسی جی بچنا تو دانا آچارج ٹھاکر رسیکیس کس سے۔ تھانے دلی سوں دایجے لایا۔ انڑے راج میں ادکھد تھاری لیوے گا۔ ادکھد اوپرے ماکی تھانکی ہے۔ اوجنانا میں تھارا بنس را ٹال اد دوجو جاوے گا نہی اور تھاری بیٹھک دلی میں ہی جی پرمانڑے پر دھان برو بر کا رڑ ریوے گا۔ اور تھارا بنس کا سپوت کپوت وے گا جی نے گام گوڑھو انڑے راج میں کھائیا پائیا جاے گا اور تھارا چاکر گوڑا کو نامو کوٹھار سوں ملا جاے گا۔ اور تھوں جا کھاتری رئیجو۔ موئی میں راج تھان بادجو۔ انڑے پروانا ری کوئی النگڑن کرے گا جی نے سری ایکلنگ جی کی آنڑ ہے۔ دوبے پنچولی جانکی داس۔ سمو ۱۱۳۹ کاتی بدی ۳

ترجمہ:- حسب الحکم سری سری فرمانرواے چتوڑ مہاراج دھراج سری سری راول جی سری سمرسی جی اچارج رسیکیس تمھیں دلی سے جہیز

میں لائے۔ اس حکومت میں تمہاری دوا لی جائے گی۔ دواخانے پر تمہارا قبضہ رہے گا۔ زنانے میں تمہارے خاندان کے سوا کوئی دوسرا نہیں جا سکے گا۔ جیسے دلی میں تمہاری نشست وزیر کے برابر تھی۔ اسی ضابطے کے مطابق یہاں رہے گی اور تمہارے خاندان کے افراد خواہ لایق خواہ نالایق سب کی حیثیت برقرار رہے گی اور سب کو گاؤں گھوڑے مرحمت ہوں گے۔ تمہارے ملازموں اور گھوڑوں کی چندی سرکاری کوٹھیار سے ملا کرے گی۔ ہر طرح خاطر جمع رکھو۔ موضع موئی میں اپنا گھر بار باندھ لو۔ جو شخص اس پروانے کی نافرمانی کرے گا اس پر سری ایکلنگ جی کی لعنت ہو۔ ذریعۂ دوبے پنچولی جانکی داس۔ مورخہ کاتک بدی ۳ سمت ۱۱۳۹

(۳)

سری
پوروے دیش ہی پت
پرتھی راج دلی نریس
سموت ۱۱۲۲
بیساکھ سد ۳

سہی

سری سری دلی تم مُہنم راجانم دھراجنم ہدستھانم۔ راج دھانم سنبھری نریس پورب دلی تکھت سری سری مہانم راجم دھراجنم سری پرتھی راج سوستھانم اچارج ریکیس دھنتر تم۔ ایرں تم کو بائی سری پرتھو کورن کے ساتھ ہتلیوے چترکوٹ کو دیا۔ تمہارا ہک چھوڑان کے راج میں سابت ہے۔ تمہاری اولاد کا سپوت کپوت ہوگا جو چھو ان

کی پول آوے گا جنم کو بھائی سی طرح سمجھے گا۔ تمھارا کارمن نہی گئے گا۔ تم جما کھاتری سے بائی کے آتم رہجو۔ ہدے سری لکھ ددے پنچولی ہڈمن راکے۔

ملک الشرق
پرتھی راج
والی دہلی سمت ۱۱۲۲
بیساکھ سد ۳

صحیح

ترجمہ :- از سری سری راجۂ راجگان سری پرتھی راج والی دہلی دارالسلطنت راجۂ راجگان سانبھر مشرقی ہند۔ بنام اچارج رسیکیس دھنونتر۔ چونکہ تم کو بائی سری پرتھو کور کے ساتھ جہیز میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ لہذا تمھارا حق سرکار چوہان میں ثابت ہے۔ تمھاری اولاد کا سپوت کپوت جو بھی چوہان کی ڈیوڑھی پر آئے گا اس کے ساتھ بھائی کا سا سلوک کیا جائے گا۔ تمھارے اعزاز میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ تم دل جمعی سے بائی کے ساتھ رہنا برسالت پنچولی ہڑمن را۔ سمت ۱۱۴۲ اساڑھ سد ۱۳

(۴)

پوروے دیشس بھی پت
پرتھی راج دلی نریشس
سمت ۱۱۲۲ بیساکھ سد ۳

سہی

سری سری دِلیِن بہاراجنم دھیراجنم سری سری پرتھی راجنم کی

آگنا پوچھے۔ اچارج بھ۔ ریکیس نے چترکوٹ پوچھے۔ آپا سری کا کا جنم ہیا . . . ہوئی چھے سو کھاس ردکو بانچنے اہاں ہاجر ویجے سمت ۱۱۴۵ چیت بد ۷۔

ملک الشرق
پرتھی راج والی دہلی
سمت ۱۱۲۲ بیساکھ سد ۳ ر

صحیح

ترجمہ:۔ سری سری راجۂ راجگان دہلی سری سری پرتھی راج کا فرمان پہنچے۔ اچارج بھائی ریکیس کو چتوڑ پہنچے۔ یہاں سری کاکا جی کو بڑی تکلیف ہوگئی ہے لہذا تم اس رقعۂ خاص کے پڑھتے ہی یہاں حاضر ہو جاؤ۔ سمت ۱۱۴۵ چیت بد ۷۔

(۵)

سری سری چترکوٹ بائی صاحب سری پرتھو کنور بائی کا بانزٹر گام موئی اچارج بھائی ریکیس جی بیج جو۔ اپرن سری دلی سوں بھائی سری لنگری راؤ آئے ہے جو سری دلی سوں وی ہجور کو وی کھاسا رد کا آیو ہے جو مارو بی بدا روا کی سیکھ دی ہے نے ولی کا کا جی رے کھید ہے جو کا (گدبا چیت) چلا آد جو۔ تھانے ما آگے جانڑو یڈے گا۔ بتھاں کے واسطے ڈاک بیٹھی ہے۔ سری ہجور . . . بی ہکم دے کیو ہے جو تھے تاکید سوں آد۔ جو تھارے مندر کو و یادکا مارتھ اپار —— کرانگا دلی سوں آ آپا چھے کراں گا اور تھے سویرے دن اٹھے آنگھ سو۔ سمت ۱۱۴۵ چیت سد ۱۴۔

ترجمہ:۔ چتوڑ کی بائی صاحب سری پرتھو کنور بائی کا سلام ہوئی کے اچارج بھائی ریکیس جی کو معلوم ہو اس کے بعد سری دلی سے بھائی لنگری راے آیا ہے نیز دہلی سے حضور کا خاص رقعہ پہنچا ہے چنانچہ مجھ کو بھی دلی پہنچنے کی اجازت دے دی گئی ہے دلی میں چچا جان کے زیادہ تکلیف ہوگئی ہے لہذا یہ کاغذ پڑھتے ہی چلے آنا۔ تمھیں ہم سے پہلے وہاں پہنچنا ہوگا۔ تمھارے واسطے ڈاک بیٹھ گئی ہے۔ سری حضور بھی حکم دے گئے ہیں کہ تم شتابی سے آؤ۔ تمھارے مندر کے بیاہ کی رسم مجھے ابھی ادا کرنی تھی۔ اب دلی سے واپسی پر ادا کی جائے گی اور تمھیں صبح یہاں دن غروب ہو۔ سمت ۱۱۴۵ چیت سدی ۱۳۔

(۹)

سری
پروے دیش ہی پت
پرتھی راج دلی نریش
سمت ۱۱۲۲ دیساکھ سد ۳

سہی

سری سری دلیش مہاراجم دھراجم ہندوستھانم راجم دھانم سنبھری نریس پورب دلی تخت سری سری مہاجم راجم دھراجنم سری پرتھی راج سوسا تھنم اچارج ریکیس دھنتری اپرن تم نے کاکا جی نم کی دوا کی آرامم بھیو جن کے رو جن میں رو کڑ روپیا (۵۰۰۰) ترے آہاتھی گھوڑے کا کھر چا پسرا آویں گے۔ تھانم سے انن کو کوئی ماف کریں گے جن کو نبر کرکے ادھکاری ہو دیں گے سہی۔ دو وے

ہکم ہڈمنت رار ۔ سمت ۱۱۴۵ ورکھے اساڑھ سد ۱۳ ۔

ملک الشرق
پرتھی راج والیِ دہلی
سمت ۱۱۲۲ ویساکھ سد ۳

ترجمہ :۔ از سری سری مہاراج دھراج پرتھی راج والی دہلی تخت گاہ سانبھری راجگان مشرقی ہندوستان بنام اچاج رج رسیکیس دھنتر۔ تم نے چچا جان کا علاج کیا انھیں آرام آگیا۔ اس کے انعام میں پانچ ہزار زرِ نقد عطا کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہارے ہاتھی گھوڑوں کا خرچ خزانے سے علیحدہ ملے گا۔ جو شخص اس عطیے کے اجرا کی مخالفت کرے گا۔ دوزخ نصیب ہوگا۔ برسالت ہڈمنت رار سمت ۱۱۴۵ ورکھے اساڑھ سد ۱۳ ۔

(۷)

سہی

سری سری چترکوٹ مہاراج دھراج تپے راج سری راول جی سری سری سمرسی جی وچناتو۔ دائما اچارج ٹھاکر رسیکیس کس سے گام موئی روکھیڑو تھانے باکی دو۔ لگ بھوگ معوں دیا۔ آوادان کرجیو۔ جاکماتری سے آوادان کرجیو۔ تھارے ہے۔ دوبے گھوا کن ناتھ سمت ۱۱۴۵ جیٹھ سد ۱۳ ۔

صحیح

ترجمہ :۔ حسب الحکم مہاراج دھراج والی چتوڑ راول جی سری سری سمرسی جی۔ اچارج ٹھاکر رسیکیس کو معلوم ہو۔ موضع موئی کا

کھیڑا تم کو معافی بمع بار عیت اور پیدا وار سمیت دیا۔ اس کو خوب آباد کرو۔ اور پوری دل جمعی کے ساتھ آباد کرو۔ تمھارا ہی ہی۔
دو بے گھوا مکن ناتھ۔ سمت ۱۲۵۱ جیٹھ سد ۱۳۔

آتشیں اسلحہ

راسا کو جدید تصنیف ماننے کے لیے ایک دلیل ہمارے پاس یہ بھی ہی کہ اس میں متعدد مقامات پر توپ و تفنگ، گولوں، گولیوں، گولندازوں زنبوروں اور ہتھنال وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ یہ تالیف ایک ایسے زمانے کی یادگار ہی جب آتشی آلات ہندوستان میں عام استعمال میں آ رہے تھے۔

ایلیٹ کا بیان پیشتر اس کے کہ اصل کتاب سے ان آلات کی شناہی مذکور ہوں ایلیٹ کا ایک بیان جو اسی سلسلے میں ہی، یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ کہتا ہی:۔

"اگر ہم ہمعصر ہندو بھاٹ چند پر یقین کریں تو معلوم ہوتا ہی کہ توپ کے گولے ان ایام میں مستعمل تھے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات آتی ہی کہ متاخرین کے مذاق کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے کسی نے ان عبارتوں میں تحریف و الحاق کر دیا ہی۔ قنوج کھنڈ کے ایک سو پچاسویں چھند میں تاتار خاں شہاب الدین کو مسلح ہونے اور آتشیں اسلحہ کے تیار رکھنے کے واسطے کہتا ہی۔" اس چھند میں ایلیٹ کو فارسی لفظ آتش پر شبہ ہوتا ہی۔ ورنہ باقی عبارت اس کے نزدیک پرانی ہی۔

دوسو ستاونویں چھند میں توپوں اور ان کی آواز کا بیان ملتا ہے جو دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ ایلیٹ اس عبارت کو زمانۂ حال کی تحریف تسلیم کرتا ہے کیونکہ اس میں توپ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

چار سو سولھویں چھند میں رائے گووند کا قتل ایک زنبورک کے ذریعے سے ہوتا ہے جس کو ایلیٹ شتر نال کا مرادف مانتا ہے اور حاشیے میں اضافہ کرتا ہے کہ مسٹر بیمز جنھوں نے چھند کا خاص مطالعہ کیا ہے جب انگلستان آئے ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ عبارتیں ان کے مخطوطے میں نہیں۔ (ایلیٹ کی تاریخ جلد ششم ص۴۷۶ ضمیمہ از ایلیٹ بذیل "ہندوستان میں بارود کا قدیم استعمال"۔

ایلیٹ کا بیان راسا کے کسی مخطوطے پر مبنی ہے۔ یہ عبارتیں ممکن ہے کہ بیمز کی نگاہ سے بچ گئی ہوں۔ ایلیٹ کے زمانے کے بعد راسا بنارس میں طبع ہوا ہے اور بیمز کے علی الرغم یہ عبارت راسا میں موجود ہے۔

راسا میں توپ اور بندوق کا ذکر

راسا میں کافی مقامات پر توپ و بندوق وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ایلیٹ کا یہ خیال کہ یہ عبارتیں ممکن ہے کہ الحاقی ہوں ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق نہیں۔ ذیل میں راسا کی داستانوں سے بعض ایسی مثالیں منقول ہیں جن میں آتشیں اسلحہ کا ذکر موجود ہے:-

(۱) میواتی مغل کتھا داستان ہشتم ص

ہتھناری دھاری آتس انت   سوبر زور انراد ڈے

ص۲۷۵ ح ۴ چھند ۳۲

(۲) میواتی مغل کتھا داستان ہشتم ص

تیر تبک ترواری تچھ نکرے اُراورن
چھند ۳۵ صفحہ ۳۷ ح ۴

(۳) انگ پال سمے ۲۸ ویں داستان سے
ناری گوری آتس کوٹ پارس بھرگھایئے
چھند ۶۰ صفحہ ۲۵۹ ح ۸

(۴) حسین کتھا نویں داستان سے
چلے دھربان سوسڈدے ڈھٹھ اُگیں ہتھ ناری ابھول گرٹھ
چھند ۱۰۲ صفحہ ۴۰۴ حصہ چہارم

(۵) حسین کتھا نویں داستان سے
چھپ خاں گج گھی ڈنمر ہتھناری گربان اسنبر
چھند ۱۲۵ صفحہ ۴۰۸ حصہ چہارم

(۶) بھولا راے سمے بارھویں داستان سے
آگبان کمان سستراین سرسستر کامے تیراین
چھند ۱۵۱ صفحہ ۴۲۲ حصہ پنجم

(۷) بھولا راے سمے بارھویں داستان سے
ہیے ہیے گئے نہ سوربر دکھ بھیانک دیو
جنبورا ہنمیر سول بھربھارتھ رت تیو
چھند ۲۴۵ صفحہ ۵۰ حصہ پنجم

(۸) سلکھ جدھ تیرھویں داستان سے
بجی رن رنگ سرنگی بھیری دھری ہتھناری چھتیس وھیری
چھند ۲۴ صفحہ ۵۲۵ حصہ پنجم

(۹) پدماوتی سمے بیسویں داستان سے

بال نال ہتھنال   تپک تیر سرب سجے

چھند ۲۴۵ صفحہ ۱۳۵ حصہ ششم

(۱۰) ششروِرتا ورنن پچیسویں داستان سے

سرناوک بندوک   ہترت جن بَن برجے

چھند ۵۲ صفحہ ۶۶ حصہ ہفتم

(۱۱) ششروِرتا ورنن پچیسویں داستان سے

تب راجن ترنگ تجی   گہی ڈِڈھ تپک سو کندھ

چھند ۶۲ صفحہ ۶۸ حصہ ہفتم

(۱۲) ششروِرتا ورنن ۲۵ ویں داستان سے

گرہ کری تپک سو راج   مرگ چھتی دھر چلیے

چھند ۷۰ صفحہ ۶۹ حصہ ہفتم

(۱۳) ششروِرتا ورنن ۲۵ ویں داستان سے

دل سنوہ تج چلیے   تپک گہی ترتیج

چھند ۶۱ صفحہ ۶۸ حصہ ہفتم

(۱۴) ریواتٹ سمے ۲۷ ویں داستان سے

ستھناری گور جنبور گھن   ڈھوُں بانہ اَبھنتی رکھ

چھند ۱۷ صفحہ ۸۹ حصہ ہشتم

(۱۵) ریواتٹ سمے ۲۷ ویں داستان سے

نار گوری جنبور   گوہک بربان اگھاتن

گجی بگت پرتھی راج   چیت کر لیوا اکو لاتن

چھند ۱۲۷ صفحہ ۹۰ حصہ ہشتم

(۱۶) اننگ پال سے ۲۸ ویں داستان سے

چھٹے نال گولا ہوائی چھٹکن   نکھتر منوں جانی تٹے ٹھنکن

چھند ۱۱۰ صـ ۹۲۵ حصہ ہشتم

(۱۷) گھگھر کی لڑائی ۲۹ ویں داستان سے

دلی پتی آکھیٹ چڑھی   کوہ کبان ہتھنا ری

چھند ۴ صـ ۹۴۵ حصہ نہم

(۱۸) گھگھر کی لڑائی ۲۹ ویں داستان سے

سواگیں ہتھناری اپار سجن   تن دیکھت کائر دور بھجن

تن پٹھ ہزار اونت چلے   چھہ ریت جھرنت کری تہلے

چھند ۱۶ صـ ۹۴۸ حصہ نہم

(۱۹) کانگرہ جدھ پرستاو ۳۵ ویں داستان سے

ہی گے رتھ مچتر نگ   گوری جنبور ناری سرنگ

چھند ۵ صـ ۱۰۴۶ حصہ نہم

(۲۰) درگا کیدار ۵۰ ویں داستان سے

چھٹیں ہتھناری دو ۶ دل گوم دیومتہ مچیں   اوڈبر آتس جھار جھارہ دھوم دھوندھر سچیں

چھند ۲۲۷ صـ ۱۵۴۲ حصہ سیزدہم

(۲۱) جنگم کتھا ۶۰ ویں داستان سے

دھری چھتی وڈھ ٹیک ہٹپ   ہکیے ویا دہی دراہ

چھند ۵۲ صـ ۱۵۷۲ حصہ چہاردہم

(۲۲) قنوج سے ۶۱ ویں داستان سے

لکھ گولندا ج دگولانڈنہ   لکھ اک نال پھر چے

چ ۵۱ صـ ۱۹۴۳ ح ۱۴

(۲۳) قنوج سمے ۶۱ ویں داستان سے

تیر تپک سر پر بہت گھت پرند گمان
بر دائی تہاں لرن کوں حکم مانگے چہو آن

چھند ۱۸۶۲ صفحہ ۱۸۶۱ حصہ شانزدہم

(۲۴) دھیر پنڈیر ۶۴ ویں داستان سے

پرے بھیر کنبی رنن جیت رٹھی پرے بندھ کندھن ہتھن نار جھٹی

چھند ۲۵۲ صفحہ ۲۰۹۵ حصہ ہیزدہم

(۲۵) بڑی لڑائی ۶۶ ویں داستان سے

جنور بھور ہتھیاری بھار آتس (آتش) جرت ادبھوت پار

چھند ۹۲۴ صفحہ ۲۲۶۳ حصہ نوزدہم

میں بخوف طوالت صرف انہی مثالوں پر قناعت کرتا ہوں۔ الیٹ نے صرف قنوج سمے میں ان آلات کے ذکر سے یہ خیال کرلیا کہ کسی نے مذاق حال کے ساتھ تطابق دینے کے لیے ان بعض مقامات میں یہ تبدیلی کردی لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہوتا کہ تمام کتاب میں آتش فشاں آلات کا مذکور آتا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ کسی اور نتیجے پر پہنچتا۔

اس موقع پر قدرتاً ہمارا ذہن اس سوال کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ ہندوستان میں آلات آتش بازی کا کس عہد سے رواج ہوتا ہے۔ یہ سوال اگرچہ مختصر ہے۔ مگر حقیقت میں اس کا جواب بغیر ایک لمبی تحقیقات کے جو کتب تواریخ و لغات کی ورق گردانی سے تعلق رکھتی ہے، نہیں دیا جاسکتا۔ صفحات ذیل اسی تحقیقات پر مبنی ہیں۔

مغربیوں کا بیان

مغربی مورخین بارود کی ایجاد کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ قدیم اہل یونان و ہندو چین و روما غالباً اس مصالحے سے واقف تھے کیونکہ ان کی تصنیفات سے کسی ایسے مصالحے کا پتہ چلتا ہے۔ ورجل کی کتاب اینیڈ کا اقتباس جس میں ایلس کے بادشاہ کو جوپیٹر نے برق و رعد کی تقلید کے جرم میں مار ڈالا ہے۔ اس عقیدے کی تائید میں نقل کیا گیا ہے۔ ڈاین کیسیس اپنی تاریخ روما میں کالیگلا کے ذکر میں بیان کرتا ہے کہ اس نے ایسی ایجاد کی تھی جس میں برق و رعد کی خاصیت تھی اور جس سے پتھر پھینکے جاتے تھے۔ فلاسٹریس دوسری صدی عیسوی کا مصنف ہندوستان کے دوآبے میں رہنے والی کسی قوم کے ذکر میں گویا ہے کہ اگر اسکندر اعظم ان کے ملک پر فوج کشی کرتا تو کبھی فتح نہیں پا سکتا۔ اس لیے کہ یہ لوگ میدانِ جنگ میں آکر اپنے دشمنوں سے لڑنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ شہر کی دیواروں پر سے طوفان اور صاعقہ باری کے ذریعے سے ان کو برباد کر دیتے ہیں۔
بقول الفنسٹن منوجی نے آتشیں تیروں کے استعمال کی ممانعت کی ہے۔ آئین جنٹو میں مرقوم ہے کہ رئیس کو کسی خدع آمیز آلہ یا زہری اسلحہ یا توپ اور بندوق یا کسی اور قسم کے آتشیں حربوں سے جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ اس فقرے میں آتشیں حربہ سنسکرت لفظ اگنی استر، کا اور توپ شت اگھنی، کا بقول ہالہیڈ ترجمہ ہے۔ یہ ایسا حربہ تھا جس سے سو سو آدمی دفعتاً ہلاک کیے جا سکتے تھے۔
کیٹیسیس کا بیان ہے کہ دریائے سندھ کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگ ایسا تیل تیار کرتے تھے جو گھڑوں میں بھر کر لکڑی کی عمارت

پر پھینکا جاتا تھا جس سے آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے اور صرف مٹی ہی سے بجھ سکتا تھا۔ وہ صرف بادشاہ کے لیے تیار کیا جاتا تھا اور دوسرے آدمیوں کو اس کے رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ایلین ایک اور مصنف اس آتش سیال کے متعلق مزید معلومات دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس تیل سے نہ صرف لکڑی جلتی تھی بلکہ حیوان و انسان بھی جل جاتے تھے اور ہندوستان کا بادشاہ اس کی مدد سے شہر اور قلعے فتح کرتا تھا۔ مٹکوں میں بھر کر غنیم کے قلعے کے دروازوں پر ڈال دیا جاتا تھا۔ دروازے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے۔ فلاسٹرٹس اس تیل کے متعلق کہتا ہے کہ وہ کسی جانور سے نکالا جاتا تھا اور یہ جانور صرف بادشاہ ہی رکھ سکتا تھا۔ یہ جانور غالباً مگرمچھ ہے۔

ہم ہندوستان میں ایک آتش بست تیر کے استعمال کا بھی مذکور پڑھتے ہیں جو بانس کی نال سے پھینکا جاتا تھا۔ مجمل التواریخ میں جو کسی سنسکرت کتاب سے ۱۱۲۶ء میں عربی میں ترجمہ ہوئی ہے۔ راجہ ہل کے قصے میں لکھا ہے کہ برہمنوں نے راجہ کو، جب کشمیر کی فوجیں چڑھ آئیں یہ مشورہ دیا کہ مٹی کا ایک ہاتھی بنا کر اپنی فوج کی ہراول میں رکھے الغرض جب کشمیر کی فوج آئی ہاتھی پھٹا اور اس کے شعلوں سے کشمیری فوج کا بڑا حصہ ہلاک ہو گیا۔ چینیوں کے بیانات سے بھی پایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں لڑھکنے والے گھوڑوں کا بھی لڑائی میں، جب زمین موافق ہوتی استعمال تھا[۱]۔

---

[۱] یہ بیان ایلیٹ کے مضمون سے ماخوذ ہے۔

فردوسی کی روایت ایرانی روایت سے پتہ چلتا ہو کہ ان متحرک گھوڑوں سے سکندر اعظم نے فور ہندی سے جنگ کے وقت کام لیا ہو فردوسی نے شاہنامے میں یہ قصہ یوں لکھا ہو کہ جب فور ہندی کو سکندر کی لشکرکشی کی اطلاع ملی وہ فوج لے کر مقابلے کے واسطے نکلا جس میں سب سے پہلی صف ہاتھیوں کی تھی سکندر سے کہا گیا کہ ہاتھیوں کی جنگ بڑا کٹھن کام ہو۔ گھڑچڑھے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاتھی گھوڑے کو سوار سمیت سونڈ سے اٹھا کر دور پھینک دیتا ہو۔ اس پر سکندر نے اس جانور کی شکل دریافت کی لوگوں نے اس کی تصویر کاغذ پر آتار کر بتائی۔ اس نے حکم دیا کہ موم کا ایک ہاتھی بنایا جائے جب اس کو ہاتھی کا اندازہ ہوگیا۔ اس نے مجلسِ مشورت منعقد کی۔ رومی ایرانی اور مصری لوہار بلوائے گئے۔ انھوں نے حسب ہدایت ایک مجوف گھوڑا اور سوار لوہے کا تیار کیا۔ خول کی درزیں میخوں سے بندکیں اور گاڑی کے ذریعے سے چلایا۔ خول میں نفت سیاہ بھر دی گئی۔ سکندر نے یہ آلہ پسند کیا اور حکم دیا کہ اس نمونے کے ایک ہزار گھوڑے تیار کیے جائیں۔ ایک ماہ کے اندر یہ گھوڑے تیار ہوگئے۔ جب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ آہنی گھوڑوں کو غنیم کے ہاتھیوں کے مقابل رکھا گیا۔ ان میں آگ لگا دی گئی جب گھوڑے بڑھائے گئے اور ہاتھیوں تک پہنچے۔ ان کی سونڈیں آگ سے جلنے لگیں۔ ہاتھی واپس بھاگے۔ ادھر سے سکندر کی فوج نے حملہ کر دیا۔ فور کو شکست ہوگئی یہاں فردوسی کے اشعار بھی نقل کر دیے جاتے ہیں ؎

چو آگاہ شد فور کامد سپاہ — گزین کرد جا از در رزم گاہ

بدشت اندروں لشکر انبوہ گشت — زمیں از پی پیل چوں کوہ گشت
سپاہی کشیدند بر چار میل — پس پشت گردان و در پیش پیل
ز ہندوستان نیز کارآگہاں — برفتند نزدیک شاہ جہاں
بگفتند او را بسے رزم پیل — کہ او اسپ را افگند بر دو میل
سواری نیارد برابر شدن — نہ چوں شد بود روے باز آمدن
کہ خرطوم او از ہوا برتر است — زگردوں مرا او را زحل یاور است
بقرطاس بر پیل بنگاشتند — بچشم جہاں جوے بگذاشتند
بفرمود تا فیلسوفان روم — یکے پیل کردند بیشش ز موم
چنیں گفت کاکنوں بپاکیزہ راے — کہ آرد یکے چارۂ ایں بجاے
نشستند دانش پژوہاں بہم — ہمی چارہ جستند از بیش و کم
یکے انجمن کرد از آہنگراں — ہر آنکس کہ بودند از ایشاں سراں
ز رومی و مصری و از پارسی — فزوں بود مردان چہل بارسی
یکے بارگی ساختند آہنیں — سواری ز آہن ز آہنش زیں
بمیخ و بمس درز با دوختہ — سوار و تن و بارہ افروختہ
بگردوں ہمی راندے بیش سیاہ — درونش بیاگند نفت سیاہ
سکندر بدید آں پسند آمدش — خردمند را سودمند آمدش
بفرمود تا زاں فزوں از ہزار — ز آہن بکردند اسپ و سوار
ازاں ابرش و بور و خنگ و سیاہ — کہ دیدہ است ہرگز ز آہن سپاہ
سر ماہ را کار شد ساختہ — وزو چارہ گر گشت پرداختہ
از آہن سپاہی بگردوں براند — کہ جز با سواران جنگی نماند
چو اسکندر آمد بنزدیک فور — بدید ایں سپہ آں سپہ راز دور

خروش آمد و گرد رزم از دو روے
برفتند گردان پرخاش جوے
باسپ و بنفت اندر آتش زدند
همه لشکر فور بر سر زدند
اندر آتش برافروخت نفت سیاه
بجنبید ازاں کاہنیں بد سپاہ
چو پیلاں بدیدند ازایشان گریز
برفتند بالشکر از جائے تیز
زلشکر بر آمد سراسر خروش
بزخم آوریدند پیلاں بجوش
چو خرطوم‌هاشان بر آتش گرفت
بماندند از آن پیل باناں شگفت
همه لشکر هند گشتند باز
هماں ژنده پیلان گردن فراز
سکندر پس لشکر بدگماں
همی تاخت برسان باد دماں

(شاہنامہ جلد سوم ص۹۵، بمبئی ۱۲ھ)

مغربی محققین کو پورا پورا شبہ ہے کہ سکندر اعظم کو ہندوستان میں کسی نہ کسی آتشی حربے سے ضرور سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ کونٹس کرٹیس مؤرخ کے ایک فقرے سے اس قسم کا مطلب مفہوم ہوتا ہے۔ بعض مصنفین اس رائے پر مصر ہیں کہ قدیم برہمنوں کے پاس گرجنے والی اور چمکنے والی کلیں ضرور تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ مہابھارت، ہری ونس اور سری بھاگوت وغیرہ تصنیفات میں آتشیں حربوں کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔

میں اس موقع پر پروفیسر ولسن کی رائے بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ سوال کہ آیا قدیم ہندو بارود یا اس قسم کے کسی بھڑک اٹھنے والے مصالحے سے واقف تھے، تاریخی لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے۔ ان کی طبی تصنیفات سے ثابت ہے کہ وہ بارود کے منفرد اجزا سے ضرور واقف تھے کیونکہ یہ اشیا ان کے ہاں کثرت سے

پائی جاتی ہیں مگر ہم صرف اس بنا پر کہ اس کے متعلق کسی واضح بیان سے دوچار نہیں ہوسکے ہیں اس کے وجود سے انکار بھی نہیں کرسکتے کیونکہ ہمارا علم ان کے ادبیات کے متعلق ابھی تک ناقص حالت میں ہے۔"

ادھر ایلیٹ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ کسی نہ کسی قسم کا آتشیں حربہ ہند قدیم میں ضرور رائج تھا جو بھڑک اٹھنے والا تھا اور اس کی آتشگیری کا وقت اور طریقہ استعمال کرنے والے کی مرضی پر موقوف تھا قصہ مختصر ایسے متحرک آلے استعمال ہوتے تھے جو دروازوں عمارتوں اور دیگر آلات سے پیوست ہوکر فاصلے سے ان میں آگ لگائی جاسکتی تھی ظن غالب ہے کہ شورہ جو باروت کا جزو اعظم اور اس کے بھڑکنے کا موجب ہے اس ترکیب میں شامل تھا۔ بہرحال یہ تباہی کا آلہ صحیح تاریخی دور کی آمد سے قبل ہی رواج سے جاچکا ہے اور یہ تسلیم کرنے کے واسطے ہمارے پاس کافی وجوہ ہیں کہ مسلمانوں کے حملے کے وقت صرف ایسے محرق آلے معلوم تھے جو سادہ ہونے کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ رال یا نفط کے اجزا سے مرکب تھے۔

یہ بعض اور اسی قسم کے دیگر بیانات جو ٹائمز انسائیکلوپیڈیا اور ایلیٹ کے مذکورہ بالا مضمون میں محفوظ ہیں۔ ہمیں اس عقیدے پر آمادہ نہیں کرسکتے کہ ہند قدیم میں باروت کا رواج تھا یا اس کی نفوذی طاقت سے اہل ہند واقف تھے۔ اگر ان کے پاس کوئی آتشی آلہ تھا تو وہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ضایع ہوچکا ہوگا۔ کیونکہ مسلمانی فتوحات کے دوران میں جس میں ہندو اور مسلمان فوجیں ہندوستان میں باہم معرکہ آرا ہوئی ہیں۔ کسی ایسے غیر معمولی آلے کا ذکر نہیں ملتا جس

سے مسلمان نا آشنا تھے۔ ہندو اگر کسی مصالحے سے واقف تھے تو کیا ضروری ہے کہ وہ بارود ہو۔ ظن اغلب ہے کہ وہ نفت ہو جس کے چشمے ہندوستان کے مختلف مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

مسلمانی عہد لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم مسلمانی عہد کا جائزہ لیں جس کے متعلق ہماری معلومات زیادہ یقینی اور قطعی ہے۔

مسلمانوں نے اپنی جنگوں میں انہی آلات سے کام لیا جو ان ایام میں عام طور پر رائج تھے۔ جنگ کی تاریخ میں حصار کشائی ہر زمانے میں ایک مشکل مسئلہ رہا ہے جس کی عقدہ کشائی کی ہر عہد میں کوشش کی گئی ہے بیسیوں آلے اور کلیں ایجاد ہوئیں۔ من جملہ ان کے منجنیق۔ دبابہ۔ کبش عرادہ۔ چرخ۔ خرک اور رعد تھے۔ نفت کا عام رواج تھا اور جب تک توپ بندوق نے آکر دستور جنگ میں انقلاب پیدا نہ کر دیا یہی آلات مسلمانی عہد میں برابر استعمال میں آتے رہے۔ منجنیق کے علاوہ پچھلی چاروں اصطلاحیں فارسی میں رائج ہیں۔

منجنیق آلاتِ قلعہ کشائی میں منجنیق کا استعمال نہایت قدیم ہے۔ قدیم فنیقی اسے استعمال میں لائے ہیں۔ ان سے یونانیوں اور اسرائیلیوں نے اخذ کی اور پھر دنیا کی دیگر اقوام میں پھیل گئی۔ عرب اس کی ایجاد نمرود کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ سنہ ۲۰۰ ق۔م میں جزیمہ پادشاہ حیرہ نے اس سے کام لیا ہے جب رسول اللہ نے طائف کا محاصرہ کیا۔ طفیل ابن محمد دوسی بت خانۂ ذی الکفین کے انہدام کی غرض سے بھیجا گیا۔ چار دن بعد اپنے چار سو آدمیوں کے ساتھ واپس آکر

مع منجنیق و دبابہ رسول خدا سے ثابت ہو گیا۔

محاصرۂ مکہ سنہ ۶۳ھ میں جب یزید کی فوجوں نے مکے کا محاصرہ کیا تاریخ طبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دو منجنیقیں نصب کی گئی تھیں۔ پہلی خانہ کعبہ پر اور دوسری صفا و مروہ پر۔ منجنیق انداز ملک حبش کا رہنے والا ایک حبشی تھا۔ ماہ صفر میں تمام مہینے سنگ اندازی جاری رہی۔ ۳ ربیع الاول کو آگ لائی گئی جس کو روئی کی گٹھریوں میں رکھا گیا اور گندھک بھی رکھ دی گئی۔ اب گٹھریاں منجنیق سے کعبے میں پھینکی گئیں۔ غلاف کعبہ میں آگ لگ گئی اور جل گیا دیوار سیاہ ہو گئی اور کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آگ کو بجھا سکتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ جب روئی کے پلندے میں آگ لگا کر پھینکا جا رہا تھا تو کل بگڑ گئی اور پلندہ منجنیق پر ہی جلنے لگا۔ محاصرین نے بہت کوشش کی کہ آگ بجھا دیں مگر ممکن نہ ہوا۔ یہ اسی روز کا واقعہ ہے جس روز شام میں یزید کا انتقال ہوا۔

منجنیق عروس محمد بن قاسم نے جب سنہ ۹۳ھ میں دیبل پر حملہ کیا اس کے پاس ایک منجنیق تھی جس کا نام عروس تھا اسے کام میں لانے کے واسطے پانسو آدمی درکار تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اس قسم کی منجنیقوں کا نام عروس رکھ دیا گیا۔

منجنیق ارمانوس الپ ارسلان سلجوقی ۴۵۵ھ و ۴۶۵ھ اور ارمانوس قیصر روم کی جنگ میں جس میں قیصر گرفتار ہوتا ہے رومیوں کے پاس ایک عظیم الشان منجنیق تھی جس پر بارہ سو آدمی کام کرتے تھے۔ وہ آٹھ حصوں میں منقسم تھی اور اس کی باربرداری کے لیے

ایک سو جانور درکار تھے ۔ اس منجنیق سے ایک من سے زاید وزن کا پتھر پھینکا جاتا تھا ۔

چینی منجنیق

چنگیز کی اولاد میں منگو قاآن ۶۴۶ھ (۱۲۴۸ء) اپنے عہد سلطنت میں ملاحدہ کی طرف ہلاگو کی پیش قدمی کے وقت چین میں اپنا آدمی بھیج کر وہاں سے منجنیقی اُستاد اور نفط انداز ملواتا ہے ۔ چنانچہ اس کی خدمت میں ایک ہزار چینی خاندان منجنیق سازوں کے پہنچتے ہیں جو ہلاگو کے ساتھ جاتے ہیں عطا ملک جوینی اپنی تاریخ میں رقم پرداز ہیں :-

" و بجانب ختاے ایلچی را بہ طلب اُستادان منجنیقی و نفط اندازان رواں کردند از خطاے یک ہزار خانہ ختائی منجنیقی آوردند کہ بہ زخم سنگ سوراخ سوزن را منفذ جل می ساختند و تیرہاے منجنیق باحکام پی و بشیم استوار کردہ چنانک چوں از حضیض عزم اوج کند راجع نگردد ۔ (ص ۳۰ جہاں گشای جوینی ، جلد سوم)

ملک طالب منجنیقی

جب قوبلای خان ۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) کی فوج نے چین کے شہر سایان فو کا محاصرہ کیا لشکر کی تمام کوشش شہر کی تسخیر میں ناکام رہی ۔ اس موقع پر بھاری منجنیقوں کی ضرورت تھی جو مغولی لشکر میں ناپید تھیں ۔ اس وقت ملک طالب منجنیق ساز نے جو دمشق اور بعلبک سے آیا تھا اپنے فرزندوں ابوبکر و ابراہیم و محمد کے ساتھ بڑی منجنیقیں تیار کیں ۔ رشید الدین فضل اللہ کا بیان ہے :-

" و پیش ازاں در ختائی منجنیق فرنگی بزرگ نبود و ایں ملک طالب

منجنیق ساز کہ از بعلبک و دمشق آنجا رفتہ بود و فرزندان او ابو بکر و ابراہیم و محمد متعلقان او ہفت منجنیق بزرگ ترتیب کردند و ردے بہ فتح آں شہر نہاوند۔“ (ص ۱۳۵ جامع التواریخ، طبع بلوشے)

ملک کامل کا منجنیقی

ہلاگو ۶۵۴ھ (۱۲۵۶ء) نے جب ایران کی طرف پیش قدمی کی اس کے لشکر میں ہزار خانہ دار منجنیق سازوں اور نفط اندازوں کے تھے۔ میا فارقین کا جب اس کی فوجوں نے محاصرہ کیا تو کہا جاتا ہے کہ ملک کامل والی میا فارقین کے پاس ایک ماہر کامل منجنیقی تھا جس کی نشانہ بازی سے مغولی فوجوں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ مجبور ہو کر انھوں نے بدرالدین لولو کے منجنیقی کو جو اپنے فن میں یکتا مانا گیا تھا بلوایا اس نے قلعے کی منجنیق کے مقابلے میں اپنی منجنیق نصب کردی۔ دونوں استادوں نے بیک وقت پتھر چلائے جو ہوا میں آکر ٹکرائے اور ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر گر پڑے۔ مورخ مشہور خواندامیر کے الفاظ ہیں:۔

”ملک کامل را منجنیقی بود کہ از زخم سنگ او خیمہ در بنا زندگانی سپاہ ایل خاں می افتاد مغولان در دفع او چارہ جوی گشتہ منجنیقی بدرالدین لو لو را کہ او نیز مہارت کامل حاصل داشت طلب نمودند چوں آں شخص بپای ثبوت رسید منجنیقی در برابر منجنیق شہر نصب کردہ آں دو استاد بیک بار سنگ ہا از منجنیق کشادہ دادہ۔ ہر دو سنگ در فضاء ہوا بہم باز خوردہ ریزہ ریزہ شد۔ مردم اندرون و بیرون از حداقت آں دو ہنرمند متعجب گشتند۔“

(حبیب السیر ص ۲۵ جزو اول از جلد سوم طبع بمبئی ۱۸۵۷ء)

موصل کے منجنیقی

غازان خاں نے سنہ ۶۹۹ھ میں فتح کرمان کے وقت موصل سے منجنیقی استاد بلوائے جنھوں نے شیراز میں تین زبردست منجنیقیں تیار کیں۔ یہ منجنیقیں لے جاکر قلعۂ کرمان کے گرد لگادی گئیں اور برج شاہ ملک کے گرنے سے قلعہ مسخر ہوگیا۔ اس کی تفصیل تاریخ وصاف میں جس کی عبارت سے بعض فقرے حذف کردیے گئے ہیں حسب ذیل ہے:-

"حکم یرلیغ شد تا از موصل استادان منجنیقی راکہ صاحب مہارت.... ... و قلعہ گشا بودند تعیین کردند و بشیراز آمدند و سہ عدد منجنیق بروج ہیئت جوزاکفۂ شہاب طناب .... ترتیب دادند و عازم کرمان شد۔ پس مدت دہ روز منجلسان مجلس کارزار بقلاخن منجنیق .... اہل کرمان راعیش سنگ انداز درصورت انداز تقلیم کردند۔ بہرسنگی کوہ فرسای کلہ قلہ قلعہ را می شگافتند و اجزا ے حصار را در زلزلہ می آوردند و ولولۂ چوں خروشیدن رعد در نہاد سکان می انداخت .... تا برج شاہ ملک راکہ با برج حمل خیال مسامتہ می بست با قرارۂ زمین موازی گردانیدند۔" (صـ۳۴۳)

حصراوی منجنیقی

غازان خاں کے افسر قتلغ شاہ نوئین نے جب قلعۂ دمشق کا محاصرہ کیا تو غازانی لشکر میں ایک مشہور منجنیقی تھا جس کا نام حصراوی تھا۔ حاکم دمشق نے جو حصراوی کے کمال سے واقف تھا اس کے سر کے لیے ایک ہزار دینار کے انعام کا اشتہار دے دیا۔ اس انعام کے حاصل کرنے کے لیے اہل قلعہ میں سے ایک شخص قلعہ سے نکل کر بہ تبدیل لباس مغلوں کے لشکر میں داخل

ہوتا ہے اور ایک رات موقعہ پاکر حصرادی کے گھر میں گھس جاتا ہے۔ جیسے ہی حصرادی گھر میں قدم رکھتا ہے اس کا سر کاٹ کر اور لے کر قلعے میں پہنچ جاتا ہے اور انعام موعود حاصل کرلیتا ہے۔ وصّاف کی عبارت یہ ہے:-

"استادی منجنیقی حصرادی نام در علم جرثقیل کامل و ماہر شدہ التزام نمود کہ از چوب صورتی مبنی از معنی دالقت مانیہا ومخلت، کہ در عرف لغت منجنیقش خوانند برکار کند و قلعہ را بآسانی مستصفی و متخلص گرداند بہ تحصیل و ترتیب اخشاب، و آلات مشغول گشت و نزدیک شد کہ عمل باتمام رسد۔ حافظ قلعہ مردے زیرک جہاندیدہ بود و دقت صنعت و حذاقت آں شخص دریں حرفت معلوم داشت با قوم خود مشاورت پیوست کہ احوال بریں منوال است کہ اگر او ستیز نماید اجزاے کوہ بجبائیات سنگ منجنیق زیر و زبر بل ریزہ ریزہ کند و ایں قصہ ہمگنان را محقق است ہرکس کہ براے استبقاے ناموس محضنہ اسلام و استیفاے شوبات در عرصات یوم القیام شر اورا مندفع گرداند صرۂ زر کہ محتوا بہ ہزار دینار اورا باشد . . . . . از زمرۂ اشیاع شخصی صاحب شطارت بود از بالاے قلعہ بہ شیب آمد و متفحص کار و متنہز زمان اقتدار شد۔ شبے معاقصۃ خود را مجہول وار در خانۂ او انداخت و در گوشۂ مختفی بود۔ استاد کہ اشاد ال بر عمل کردہ بود بخانہ معاودت می کند۔ پاے در خانہ نہادن ہماں بود و زخم بر مقتل خوردن ہماں۔ چنانچہ مقتضی مہوز بیباکی باشد سر اورا بر میدارد عورات و اطفال غلغلہ و نفیر کناں اوبا کارد مسلول قصد فرار می کند . . . . با دوسرے یکے سر خویش بہ سلامت یافتہ بر دوش و یکے سر دشمن بریدہ از گوش تا گوش بہ قلعہ مراجعت

می کند. ساکنان قلعہ غلغلہ بقلعۂ افلاک می رسانند و در بہاے سرے ... ہزار دینار با ہزار آفرین نثار کردند و سر او را بر سر نیزہ از سر ستیزہ برافراشتند" (صلہ ۳۴۸)

حصرادی کی موت نے قلعۂ دمشق کو مغلوں کی دست برد سے بچالیا اور وہ محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک ماہر منجنیقی اپنے کمال فن کی بنا پر ان ایام میں قلعوں کی تباہی و بربادی کے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

فتح عکہ سنہ ۶۹۰ھ میں ملک اشرف والی مصر نے فرنگیوں سے طرابلس فتح کر کے عکے کا رخ کیا۔ یہ شہر بھی فرنگیوں کے قبضے میں تھا۔ اہل قلعہ کو اپنی فوج اور جنگی ذخائر پر بڑا ناز تھا۔ فصیل پر سے ملک اشرف اور مسلمانوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور مذہبی پیشواؤں کی تبریک کے بعد منجنیقوں سے گولہ باری۔ ناوک اندازی اور تیر باراں کرنے لگے۔ آگ اور نفط کے قارورے پھینکے۔ چنانچہ وصاف:۔

"برفع ورجع دعا، جاثلیق ونصب عماد منجنیق ورشق ناوک وبلارک وچرخ دور پرتاب وقذف قواریر نفط و آتش پرتاب معیب و مرتاب شدند"

ایک دن فرنگیوں نے جنگ کے دوران میں انتہائی قساوت سے کام لے کر ایک مسلمان قیدی کو جو مدت سے ان کے ہاں قید تھا۔ پتھر کی جگہ منجنیق میں رکھ کر محاصرین میں پھینک دیا۔ اس کی لاش جس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے مسلمانوں کی فوج کے درمیان گری۔ ملک اشرف کو قلعہ والوں کی اس وحشیانہ حرکت پر سخت طیش آیا اور اس نے

قسم کھائی کہ جب تک قلعہ فتح نہ کرے گا دم نہ لے گا:۔

ناگاہ روزے در اثنائے محاربت آں مدابر اسیری را از مسلمانان که در حبس ابدی داشتند بعوض سنگ در منجنیق نہادہ پرتاب کردند۔ ہنوز در فضا ہوا بود کہ ابعاض او کالعہن المنفوش، متلاشی گشت۔ بعد ازاں ملک اشرف را از مشاہدۂ آں حالت وقوف بر استخفاف وجبارِ ایشاں نائرہ حفائظ بباد عصبیت دین افروختہ شد۔ بمؤکدات ایمان وشداد مواثیق تمسک جست کہ تا خاک عکہ برباد فنا ندہد وبآب تیغ آتش قہر در ایشاں نزند دست از محاربت و پاے از مثابرت کشیدہ ندارد"۔

(ص۳۵۱ وصاف)

چنانچہ اس نے نقب زنوں کو حکم دیا کہ کئی موقعوں پر نقب لگائیں جو خندق سے گزر کر فصیل کے پائیں تک پہنچ جائے حفر شدہ مقام میں ستون کھڑے کر دیں اور لکڑیاں بھر دیں۔ ادھر اس نے حکم دیا کہ لکڑی کے مربع مستطیل گھر یا خانے تیار کریں۔ ان کے پہیے لگا دیں۔ اور سیڑھیاں چاروں طرف جما دیں اور چھت کی گائے کی کھالوں سے پوشش کر دیں تاکہ تیر اور پتھر اس پر کارگر نہ ہوں۔ ان خانوں میں تیراندازوں اور نفط اندازوں کو بٹھا دیا اور کشتیوں کی طرح دھکیل کر آگے بڑھایا۔ اس کے بعد حکم ملا کہ ہر فوجی ایک ایک توبرہ ریت بھر کر لائے توبروں کی گنتی دو لاکھ ہوئی۔ ان کی ریت سے خندق پاٹ دی گئی ان امور کو سر انجام دینے میں بارہ دن لگے۔ اس وقت تک نقب زن بھی اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ جمعہ کی شب کو نقبوں میں آگ دی۔ قلعے کی دیوار اور برج زمین پر گر پڑے۔ مصری فوج بڑھنے

دھا وا کیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔ (حاشیہ ۳۵۲ وصاف)

منجنیق گرداں

قلعہ بھٹنیر کے محاصرے کے وقت امیر تیمور نے خیمے سے نکل کر بغرض تسخیر قلعہ کا معائنہ کرنے لگا قلعے میں ایک گھومنے والی منجنیق نصب تھی۔ جیسے ہی امیر باہر آیا۔ اس منجنیق سے ایک پتھر امیر پر پھینکا گیا۔ پتھر آکر شاہی خیمے کے بالکل قریب گرا اور لڑھک کر خیمے میں چلا گیا۔ امیر کو محصورین کی اس بے باکی پر سخت طیش آیا۔ اسی وقت قلعہ کو امرا پر تقسیم کر کے محاصرے کا حکم دے دیا۔ بیس منجنیقیں قلعے کے چاروں طرف لگا دی گئیں۔ ان میں سے ایک اسی مقام پر لگائی جہاں پتھر آکر گرا تھا۔ اس منجنیق سے جب پہلا پتھر پھینکا گیا سیدھا جا کر قلعے کی منجنیق کے لگا جس سے وہ ٹوٹ گئی۔ شرف الدین یزدی نے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"دوران حال صاحبقران بے ہمال احتیاط قلعہ می فرمود بہ منجنیق گرداں کہ درمیان آں ساختہ بودند و برافراختہ سنگے گران از ہوائے بغی و طغیان بجانب آں حضرت انداختند و آں سنگ بہ نزدیک خیمۂ خاص برزمین خورد وازاں جا لغزیدہ باندرون خیمہ افتاد شعلۂ خشم خسروانہ ازاں جرأت و بے باکی برافروخت و بر لیغ قضا مضا صدور یافت کہ اطراف قلعہ را بر امرا بخش کردہ حصار را مرکز وار درمیان گیرند بہادران ممالک ستان قلعہ کشاے بامتثال امر مبادرت نمودہ بیست منجنیق ازجوانب حصار نصب کردند ازاں جملہ یکے درہماں موضع کہ سنگ ایشاں فرود آمدہ بود و اول سنگے کہ ازاں انداختند بہ نیروے دولت قاہرہ بر منجنیق اندرون آمد و آنرا برہم شکست و امثال چنیں اتفاقات

از اظہار امارات نصر عزیز و نستیج مبین تواند بود" صفحہ ۲۵۵ جلد دوم ظفرنامہ - طبع کلکتہ)

منجنیقوں کی شکل

منجنیقوں کا ذکر اگرچہ تاریخ میں کثرت سے ملتا ہے۔ مگر ان کا مفصل بیان میری نظر سے نہیں گزرا جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ ان کی شکل و شباہت کیا تھی۔ اور کس طرح کام کرتی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ باوجود تلاش مجھے کوئی ایسا بیان نہ مل سکا۔ ہم اس عہد سے اس قدر دور نکل آئے ہیں کہ اس زمانے کی ادنے ادنے شے ہمارے لیے ایک معمے کا حکم رکھتی ہے۔

النکتی لاہوری

لاہور کے شاعر ابو عبداللہ روزبہ ابن عبداللہ النکتی نے جو سلطان مسعود شہید غزنوی ۴۲۱ھ و ۴۳۲ھ کے عہد کے شاعر ہیں چند ابیات منجنیق کی چیستان میں جس کا ان ایام میں کافی رواج تھا حوالہ قلم کیے ہیں۔ ان اشعار سے اس کل کے بعض خط و خال معلوم ہوتے ہیں اور پورا حلیہ ذہن میں نہیں آتا۔ النکتی کا بیان ہے کہ ایک طرف سے وہ نردبان ہے دوسری طرف سے شیطان کے پانو کی طرح چکلی ہے، زانو فرجہ کمان کی طرح کشادہ ہے جس میں ہاتھی کی سی سونڈ لٹک رہی ہے۔ دو آہنی دانت ہیں جو دیو کے پاؤں میں جڑے ہیں۔ سونڈ میں سینکڑوں رسیاں لٹک رہی ہیں۔ لوگ جمع ہو کر ان رسیوں میں سے ایک ایک رسی پکڑ لیتے ہیں۔ گویا رسیوں کے کھینچنے سے لبلبی دبائی جاتی ہے اور پتھر پھینکا جاتا ہے۔ اور ہر شخص دہشت سے کانپنے لگتا ہے۔ چیستان یہ ہے:-

چہ چیز است آں کہ یک سو نردبانست دگر سو راست ہمچوں پائے شیطاں

سر زانو بسان فرضہ تیر　　ازو آویختہ خرطوم پیلاں
دو پیشک آہنیں بینی مرا ورا　　زدہ آں پیشک را بر پایۂ دیواں
برآں خرطوم وے صد زلف بینی　　ہمی برتافتہ چوں زلف جاناں
چو عشاقش بدو انبوہ گردند　　بگیرد ہر یکے یک زلف رازاں
بیند ازو یکے سندان محکم　　شود ہر کس زبیم و ہول لرزاں

(لباب الالباب جلد دوم ص۳۵)

قلقشندی

قلقشندی صبح الاعشیٰ میں لکھتا ہے:-

"آلات حصار مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک کا نام منجنیق ہے بفتح میم و سکون نون و فتح جیم و کسر نون دوم و سکون یا اور آخر میں قاف۔" ابن الجوالیقی کا بیان ہے کہ میم کا کسرہ ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کی شکل واو کے ساتھ منجنوق اور منجبیق نون ثانی کی جگہ میم کے ساتھ بھی ہے۔ یہ عجمی لفظ ہے کیونکہ عربی الفاظ میں جیم اور قاف جمع نہیں ہوتے۔ اس کی جمع مجانیق اور مناجیق آتی ہے۔ جوہری نے اس کی اصل من چہ نیک بتائی ہے۔ ابن قتیبہ نے کتاب معارف میں اور ابو ہلال العسکری نے 'اوائل' میں لکھا ہے۔ یہ ایک چوبیں آلہ ہے جس کے دونوں پایوں کے مابین ایک لمبا شہتیر ہے جو سر کی طرف سے بھاری اور پاؤں کی جانب سے ہلکا ہے جس میں منجنیق کا پلہ جو پتھر پھینکتا ہے لٹکا ہوتا ہے۔ کھینچنے پر اس کا پائیں حصہ اس کے بالائی حصے سے بلند ہو سکتا ہے پھر اسے ایک دم سے چھوڑ دیتے ہیں جس سے ہلکا حصہ جس میں پلہ ہوتا ہے بلند ہو جاتا ہے۔ اب پتھر پلے سے نکلتا ہے اور جس چیز کے لگتا ہے اسے برباد کر دیتا ہے۔ جن چیزوں سے منجنیق مرکب ہے یہ ہیں۔ لوالب (کمانیاں) رسیاں

جن کے ذریعے سے منجنیق کو کھینچتے ہیں کہ بالائی حصہ نیچے آ رہتا ہے
اور سنگ اندازی ہوتی ہے۔ (ص ۱/۳۹ الجزء الثانی)

شاہد صادق شاہد صادق میں محمد صادق اصفہانی جو شاہجہاں کے عہد کا مصنف ہے منجنیق کا ایک مختصر سا بیان حسب ذیل دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ زمانۂ سابق میں منجنیق آلات حصار گیری میں سب سے اہم آلہ تھا۔ اس کی شکل ترازو کی طرح ہوتی ہے۔ ایک پلڑے کو بہت بھاری کر لیا جاتا ہے۔ ہلکے پلڑے میں پتھر رکھ دیا جاتا ہے اور رسیوں کے ذریعے سے زمین کے برابر قایم رکھا جاتا ہے تاکہ بھاری پلڑا اونچا چلا جائے۔ اب رسیاں ایک دم کاٹ دی جاتی ہیں جس سے بھاری پلڑا زمین پر آ رہتا ہے اور ہلکا پلڑا اونچا ہو جاتا ہے اور جو پتھر اس میں رکھا ہوتا ہے دور جا کر گرتا ہے۔

تمدن اسلام یہ دونوں بیان میں سمجھتا ہوں مختلف ساخت کی منجنیقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ایک بیان تاریخ تمدن اسلام جرجی زیدان سے منقول ہے جو غالباً مغربی ذرائع سے ماخوذ ہے:۔

"یہ ایک لکڑی کا سیدھا پھڑ ہے جس کے سرے پر ایک کوپھن نما چیز لٹک رہی ہے۔ اس میں پتھر رکھ کر پھڑ کو تسموں کے ذریعے پیچھے کی جانب کھینچتے ہیں۔ پھڑ کے نیچے ایک مضبوط کمانی لگی ہے جس وقت کمانی پوری طرح دب جاتی ہے۔ یکایک اسے چھوڑ دیتے ہیں اور وہ پھڑ زور کے ساتھ آگے کو جھکے ہوئے ایک مسطح تختے پر جا گرتا ہے اور پتھر نکل کر

دور جا پڑتا ہے۔" (تاریخ تمدن اسلام صـ۱۹۷ ترجمہ از مولوی محمد حلیم۔ طبع روز بازار امرت سر)

منجنیق کی اقسام

کتاب آداب الحرب میں منجنیق کی کئی قسمیں بیان ہوئی ہیں (۱) منجنیق عروس۔ جو چاروں طرف مارتی ہے۔ (۲) منجنیق دیو، جو غالباً اپنے ڈیل ڈول کی کلانی کی بنا پر اس نام سے کہلاتی ہے۔ (۳) منجنیق غوری دار، (۴) منجنیق رواں، جو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو سکتی تھی۔ مصنف کا بیان ہے:۔

"منجنیق بر انواع است منجنیق عروس، و آں چہار سوے بتوان انداخت و منجنیق دیو و منجنیق غوری دار و منجنیق رواں" صـ۱۸۱

لفظ منجنیق کو عام طور پر ایرانی الاصل مانا جاتا ہے۔ مگر فردوسی کے اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی داستانوں میں ان آلات پر کام کرنے والے بالعموم رومی اور عیسائی ہوتے تھے۔ منجنیق کا قافیہ تمام شاہنامے میں بالالتزام جاثلیق لایا گیا ہے۔ جاثلیق موجودہ انگریزی لفظ کیتھولک کا ہم اصل ہے۔ فردوسی اس کا استعمال بمعنی 'ترسا' و منجنیقی کرتا ہے۔ ہماری فرہنگیں اس کے معنے پیشواے ترسایان بتاتی ہیں جو معنے شاہنامے میں نامناسب معلوم ہوتے ہیں۔ میں بعض مثالیں شاہنامے سے نقل کرتا ہوں:۔

نترسد ز عرادہ و منجنیق	نگہباں بنا ید ورا جاثلیق صـ۱
بنیاد بریں بارہ بر منجنیق	ز انسوں نوردو دم جاثلیق صـ۱۹۴
دو صد پارہ عرادہ و منجنیق	نہاد از برش ہر سوے جاثلیق صـ۲۵۵
برآورد و بیدار دل جاثلیق	برا اں بارہ عرادہ و منجنیق صـ۲۵۵

سکندر بفرمود تا جاثلیق | بیارند از آب و منجنیق صہ؁
بدو ساخت از چار سو منجنیق | بپائے آمد آں بارہ جاثلیق صہ؁
بیا راست بر ہر سوے منجنیق | زگردان روم آنکہ بد جاثلیق صہ؁

مغربی ذرائع منجنیقوں سے متعلق ایک بیان جو مغربی ذرائع سے لیا گیا ہو ناظرین کی دلچسپی کے خیال سے یہاں اضافہ کیا جاتا ہو:-

"یہ آلات ان کی ساخت میں ضمنی اختلاف یا قوت عمل میں کمی بیشی کے اعتبار سے مختلف ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اصولاً دو تقسیم میں ترتیب دیے جاسکتے ہیں ایک تو فلاخن والے۔ دوسرے بڑی قسم کی آڑی کمان والے۔ پہلی قسم میں عرادے اور منجنیق شامل ہیں۔ دوسری قسم میں چرخ اور اس کے مشابہ آلات۔ قدیم ربالسٹا، بذاتہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو قرون وسطیٰ کی لاطینی میں اس سے کسی نہ کسی قسم کی کمان چرخ مراد تھی۔ بھاری قسم کے چرخوں کو مختلف ذرائع سے گردش دی جاتی تھی مثلاً چرخی کے ذریعے سے یا دندانے دار چرخ کے ذریعے سے۔ ان آلوں سے پتھر یا سیسے کے گولے پھینکے جاتے یا تیر ناوک۔ یہ آلے اس طاقت سے چلتے کہ لکڑی کے ستون میں چھ چھ انچ گھس جاتے۔ لیکن جنگ میں ان کا عمل اتنا آہستہ ہوتا کہ لمبی کمان سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جن سے ان کے ایک وار کے مقابلے میں پانچ چھ مرتبہ کام لیا جاسکتا۔ اس قسم کے بڑے آلے لکڑی فولاد اور اکثر اوقات سینگ کے بنتے۔ جن کی کمان تیس فٹ لمبی ہوتی Dufour کا قیاس ہو کہ اس آلے

سے نصف کلوگرام وزن کا تیر آٹھ سو ساٹھ گز تک پھینکا جا سکتا ہے۔

منجنیقی قسم کے آلات میں ایک طولانی گاؤدم شہتیر ہوتا جو کندے کے پاس سے ایک مضبوط مگر مخروطی شکل کے کھونٹوں پر جھولتا۔ شہتیر کے بالائی سرے میں ایک گوپھن لٹکتا ہے جس کا سرا ایک کڑے میں مضبوط بندھا ہے۔ دوسرا سرا ایک پھندے کے ذریعے ایک آہنی کنڈے کے ساتھ لٹکا ہے جو شہتیر کے سرے پر ہے۔ اس کے چلانے کے واسطے طاقت جو درکار ہے اس کے لیے یا تو آدمی کام دیتے جو شہتیر کے سرے والی رسیوں کو پکڑ کر زور کرتے یا بھاری پاسنگ کا وزن جو شہتیر کے سرے پر لٹکتا ہوتا فوراً چھوڑ دیا جاتا۔ اگر پاسنگ کا استعمال کیا جاتا شہتیر کا لمبا سرا چرخی کے ذریعے سے نیچے جھکایا جاتا۔ گوپھن ایک ڈونگی میں جو اس کے واسطے مہیا تھی آ جمع ہوتا اور پتھر یا گولہ اس میں رکھ دیا جاتا اس وقت پاسنگ بلندی پر ہوتا جو کھٹکے کے ذریعے سے قابو میں رہتا بلبی کھینچنے پر پاسنگ نیچے آ رہتا اور شہتیر فلاخن کے ساتھ بلند ہو جاتا۔ بلند ہوتے وقت جیسے ہی ایک خاص موقع پر پہنچتا گوپھن کا پھندے والا سرا کنڈے سے نکل آتا اور گوپھن چھوٹ جاتا۔ گولہ نکل کر اپنے آماج کی طرف روانہ ہوتا۔ خاطر خواہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے گولے کو اپنی انتہائی رفتار حاصل کرنی چاہیے۔ اس کو ۴۵ درجے کے زاویے پر رہا ہونا چاہیے۔ یہ مقصد مشین کے مختلف اجزا نیز گولے کے وزن کے باہمی تناسب سے حاصل ہوتا ہے جس کے لیے بلا شبہ اٹکل پچو روایتی قواعد قرون وسطی کے مہندسوں میں رائج تھے۔ معمولی گولہ ایسے پتھروں کا ہوتا جن کو احتیاط کے ساتھ گول کر لیا جاتا۔ بعض وقت ڈل

پتھر سے کام لیا جاتا۔ رات کے وقت ان پتھروں کے ساتھ روشن شتابہ لگا دیا جاتا تاکہ اس کی روشنی میں نشانے کا صحیح اندازہ ہو سکے بعض وقت لوہے کے سرخ انگارا ٹکڑے۔ پگلی دھات کی ہانڈیاں یا روغن نفت کے قارورے یا سٹری اور گندی آلائش پھینکی جاتی کہ قلعے کی ہوا متعفن ہو جائے۔ کارڈنل اوکٹیوین نے ۱۲۴۹ء میں موڈنیا کے محاصرے کے وقت شہر میں گدھے کی لاش پھینکی تھی۔ فرڈیسارٹ کی تاریخ میں ۱۳۴۰ء میں تھن ال اویک کی تسخیر کے موقعے پر ایسی کئی مثالیں نقل ہوئی ہیں جس میں محاصرین نے اپنی منجنیقوں سے مردہ گھوڑوں اور دیگر جانوروں کی لاشیں شہر کی ہوا مسموم کرنے کے واسطے پھینکی ہیں اسی مورخ کے ہاں ایک اور مثال ملتی ہے جس میں قلعے اوبیروخ کے بدقسمت قاصد کو محاصرین نے باندھ کر اور وہ خط جو اس کے پاس تھے اس کے گلے میں لٹکا کر منجنیق سے اس کو قلعے میں پھینک دیا جہاں وہ اپنے دہشت زدہ ساتھیوں کے درمیان گر کر مر گیا۔

بعض منجنیقوں میں پاسنگ بلیوں کے صندوق یا خانے کی شکل میں ہوتا جس کو پتھر مٹی وغیرہ سے بھر کر شہتیر کے بھاری حصے کے ساتھ نصب کر دیتے۔ ایسی کل کا نام غالباً منجنیق ہے۔ باقی کلوں میں پاسنگ علیحدہ چول پر لٹکتا رہتا۔ ایک تیسری شکل اور بھی تھی جس میں دونوں ترکیبیں کام دیتیں۔ فرق اتنا تھا کہ پہلی قسم کا نشانہ زیادہ صحیح ہوتا۔ دوسری کی مار زیادہ ہوتی۔ لیکن ایسی کلیں جن میں پاسنگ کی جگہ انسانی طاقت سے رسیاں کھینچنے میں کام لیا جاتا تھا گو سے چلانے سے عاجز تھیں۔ اگرچہ نسبتاً زیادہ سرعت سے کام

دے سکتیں اور مختصر جسامت کی بن سکتیں۔

شاہ نپولین سوم قرون وسطیٰ کے بعض مصنفین کی عبارتوں سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ منجنیق "ٹریبوشے" کے مشابہ تھی لیکن ہلکی ساخت اور ہلکی مار کی۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ نوعیت کے لحاظ سے منجنیق کا اطلاق اس قسم کی تمام کلوں پر ہوتا ہے۔

میر بیو سنوڈو کے نزدیک لاطینی زبان کا لفظ مشینا (مشین) منجنیق کا مرادف ہے اگرچہ جس مشین کا اس نے بیان دیا ہے حقیقت میں ٹریبوشے سے ماخوذ ہے جس کے معنے "جادو کا کرتب" ہیں۔ یہ لفظ بازیگر کے شعبدے کے معنے دینے لگا۔ ساتویں صدی عیسوی کے قریب اس کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ جنگی کلوں پر ہونے لگا۔ مشرقیوں نے اسے "منجنیق" اور "مجانیق" بنالیا اور فرنگیس نے منگونا اور منگونیلا کی شکل میں اختیار کرلیا۔

شاہ نپولین مذکور الصدر نے شہزادگی کے زمانے میں ان آلات جنگ کے سلسلے میں نہایت دلچسپ تجربے کیے ہیں۔ اس نے ایک "ٹریبوشے" بنوایا جس کے ستون کا طول ۳۳ فٹ نو انچ اور پاسنگ تین ہزار تین سو پونڈ (قریباً اکتالیس من) تھا۔ اور چول سے لٹکنے والا پاسنگ چھ ہزار چھ سو پونڈ۔ اس کے انتہائی زور کا ماحصل یہ تھا کہ چوبیس کیلو گرام لوہا ایک سو اکانوے گز گیا اور ساڑھے بارہ انچ کا گولہ جو ریت سے بھرا تھا ایک سو اکتیس گز جا سکا۔ مگر نشانہ چلانے پر کل میں خرابی آ گئی اور جیسا کہ شاہزادے کی خواہش تھی پاسنگ کو آٹھ ہزار کیلو گرام یا سترہ ہزار چھ سو پونڈ تک بڑھا دینا ناقابل عمل ثابت

ہوا۔ یہ امر صریحی تھا کہ یہ مشین کافی بھاری ساخت کی نہ تھی مگر ذمہ دار
افسران نتائج پر بالکل مطمئن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کلوں میں
مہارت حاصل کر لینے اور نہایت وزنی لٹھوں سے ان کے تیار ہونے
پر وہی غیر معمولی کارنامے حاصل کیے جا سکتے ہیں جو زمانۂ وسطیٰ
کی منجنیقوں کی یادگار ہیں۔

قاطرمیر نے کسی مشرقی مصنف کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک
منجنیق سے چار سو من کا گولہ پھینکا گیا تھا۔ یہ وزن کسی حالت میں
آٹھ سو پونڈ سے کم نہیں مانا جا سکتا۔ بلکہ کہیں زیادہ ہے۔

اسٹیلا کا بیان ہے کہ جینوا والوں نے قبرس کے خلاف ۱۳۷۳ء میں
جو سامان جنگ بھیجا تھا منجملہ بڑی کلوں کے ایک کا نام طروجا تھا
جس سے بارہ سے اٹھارہ ہنڈرویٹ بالفاظ دیگر پونے سترہ من سے
پچیس من تک کا گولہ پھینکا جا سکتا تھا۔ ۱۳۴۶ء میں وینس والوں نے جب شہر
زارا کا محاصرہ کیا۔ ان کے منجنیقی ماسٹر فرانسسکو ڈیل بارشے نے شہر میں
تین ہزار پونڈ کے وزنی گولے پھینکے۔ اس موقع پر ماسٹر صاحب بقول لیے۔
"لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" خود اپنی مشین کا شکار بن گیا۔
یعنی جب وہ کھڑا ہوا اپنی کل کو درست کر رہا تھا وہ چل گئی اور
ماسٹر اس کی جھپٹ میں آ کر شہر میں پہنچ گیا۔

بعض کلیں بڑی عظیم الجثہ ہوتی تھیں اور ان میں سامان کی
بے اندازہ مقدار صرف ہوتی تھی۔ عکے کی آخری تسخیر کے ذکر
میں ابوالفدا کا بیان ہے کہ ایک منجنیق حمص کی فوج کے سپرد تھی
جس کا سامان سو گاڑیوں پر لدتا ان میں سے ایک گاڑی خود مورخ

موصوف کی سپردگی میں تھی۔ رچرڈ شیر دل کے ایک قدیم افسانے سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیڑے میں ایک منجنیق اتنی بڑی تھی جو پورے
ایک جہاز میں آتی۔ سینٹ لوئی شاہ فرانس نے دریائے نیل پر جو بعض
منجنیقیں مسلمانوں سے اپنی پہلی فتح کے وقت چھینی تھیں۔ ان کی بلیوں سے
اس کے تمام لشکر کے گرد کٹھگرا یا کٹہرا تیار ہو گیا تھا۔
بعض وقت ان کلوں سے بڑی تعداد میں کام لیا جاتا۔ ول ہرڈوئن
کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وینس سے جو بیڑا قسطنطنیہ پر حملہ کرنے
گیا تھا۔ من جملہ دیگر آلات قلعہ کشائی کے اس میں تین سو عرّادے اور
منجنیقیں تھیں۔ ۱۲۹۱ء میں عکّے کی تسخیر کے وقت بقول مقریزی حصار
کے گرد بانوے منجنیقیں مسلمانوں نے نصب کی تھیں مگر ابو الفرج کی روایت
ہے کہ تین سو تھیں۔ اگر فرنگیوں کے قول پر اعتبار کیا جائے تو تمام کلوں
کی تعداد جس میں چھوٹی بڑی مشینیں شامل ہیں چھ سو چھیاسٹھ تک پہنچتی ہے
جن کی منجنیقوں سے ایک ایک قنطار (ڈیڑھ من) کا بلکہ اس سے بھی
وزنی گولہ پھینکا جاتا تھا۔
منجنیقوں کی شدید گولہ باری کا اندازہ اس جنگی کارروائی کے
بیان سے ہو سکتا ہے جو فرانسیسیوں کے خلاف دریائے نیل پر
مصریوں سے ظہور میں آئی اور جس کی طرف اوپر بھی ایک ایما ہو چکا
ہے۔ شاہ فرانس کا مقصد تھا کہ دریائے نیل کی ایک شاخ پر پشتہ یا بند
باندھ دیا جائے۔ اس نے بند کی حفاظت کے واسطے کر گج اور
سرکوب تیار کر لیے تھے جن پر تیر اندازوں کی جماعت بٹھا دی گئی تھی
اور ان کی امداد میں عرّادوں کی قطار قایم کر دی گئی تھی جن پر سائبان

شاہی میر سامان کا بیان ہے کہ جب مسلمانوں پر منکشف ہوا کہ ان کے خلاف کیا اقدام ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے ہماری مشینوں کے مقابلے میں ایک بڑی تعداد منجنیقوں کی کھڑی کر دی اور ہمارے پشتے اور سرکوبوں کو برباد کرنے کی غرض سے اس کثرت سے سنگ اندازی کی کہ ہم حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے تیر برسائے۔ پتھر چلائے اور کمان چرخ سے تیر پھینکے۔ ادھر ترکی نیزوں اور آتش نفط کی بھرمار شروع کر دی۔ الغرض ہماری کلوں اور ہمارے آدمیوں کو جو بند پر کام کر رہے تھے اس قدر دق کیا کہ جس کا دیکھنا اور سننا نہایت دہشتناک تھا۔ ان پر پتھر نیزے۔ تیر اور نفط کی بارش مینہ کی طرح جاری رکھی۔

دبابہ اب میں باقی اصطلاحات پر نظر ڈالتا ہوں۔ دبابہ ایک متحرک آلہ تھا جسے پہیوں کے ذریعے سے چلاتے تھے۔ اس کی چھت کھالوں یا سرکے میں ترشدہ نمدوں سے ڈھکی ہوتی تاکہ آگ سے محفوظ رہے۔ کچھ لوگ اس کے اندر بیٹھ جاتے اور کچھ اسے ڈھکیل کر لے چلتے۔ بعض وقت اس سے فصیلوں پر دھاوا کرتے اور بعض وقت قلعے کی دیواروں کے انہدام میں کام لیتے۔ اس کا سرا نوک دار ہوتا تاکہ دیواروں میں شگاف کر سکے۔ محصورین مدافعت میں آگ پھینکتے اور جلتی لکڑیوں یا سرکنڈوں کے پشتارے اس پر ڈالتے تاکہ دبابہ اور اس کے پناہ گزین جل جائیں۔ دبابہ کو فارسی میں خرک کہتے ہیں۔ بعض وقت اسی وضع کی کشتیاں تیار کی جاتیں جن سے دریائی جنگوں میں کام لیا جاتا۔

خجند پر جب چنگیزی فوجوں نے یورش کی ہے وہاں کا افسر

تیمور ملک دریائے جیحوں کے اس حصار میں جہاں دریا دو شاخ ہوکر بہتا ہے مقابلہ کرتا ہے۔ امیر موصوف ہر روز کشتیوں میں بیٹھ کر غنیم کے حملوں کا جواب دیتا۔ کشتیاں جو اس کے پاس تھیں۔ خاص قسم کی ساخت کی تھیں۔ ان کی چھت اور بازووں کی پوشش نمدے کی تھی جس پر سرکے میں گندھی مٹی کا غلاف چڑھا دیا گیا تھا۔ کشتیوں کے بازووں میں کھڑکیاں تھیں۔ ان کشتیوں پر تیر نفط اور آگ کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ تیمور ملک ایک عرصے تک دشمن کے مقابل ڈٹا رہا۔ عطا ملک کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"داد دوازدہ زورق ساختہ بود سر پوشیدہ و بر نمد ترگل بسرکہ معجون اندودہ و در یچہا درگزاشتہ ہر روز بامداد جانبی ششش رواں می شد وجنگ ہائے سخت می کردند و زخم تیر براں کارگر نبود آتش ونفط وسنگ ہا کہ در آب می ریختند او فرا آب می داد و بہ شب شبیخون می برد۔ خواستند تا مضرت آں دفع کنند دست نداد۔"

(صاف جہانکشائے جوینی جلد اول)

کبش کبش۔ یہ دبابے سے ملتا جلتا آلہ ہے۔ فرق صرف اسی قدر ہے کہ اس کا سر مینڈھے کے سر کے مشابہ اور آگے کو نکلا ہوتا۔ مینڈھے کا سر لکڑی یا لوہے کی موٹی بلی میں لگا ہوتا اور بلی دو رسیوں میں جو دبابے کی چھت میں جڑی ہوئی چرخیوں پر کھنچا کرتی تھیں۔ لٹکا کرتی تاکہ اس کے کھینچنے میں آسانی ہو

عرادہ یہ چھوٹی قسم کی منجنیق ہے اور فارسی ادبیات میں منجنیق کے ساتھ ساتھ مذکور ہوتی ہے۔ فرہنگ بحر الفضائل تالیف

سنہ ۸۲۳ھ میں لکھا ہے "عرّادہ ہمچو مغربی کہ بدان سنگ از حصار اندازند"
شرف نامۂ احمد منیری مؤلفہ سنہ ۸۶۲ھ میں مرقوم ہے "عرّادہ منجنیق خورد"
اور موجودہ لغتوں میں مذکور ہے "عرادہ آلۂ جنگ خورد تر از منجنیق"
اس آلے کا استعمال بھی قدیم معلوم ہوتا ہے۔ آداب الحرب میں اس
کی چار قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلی عرّادۂ یک روی جس سے صرف
ایک ہی سمت میں سنگ اندازی کی جائے۔ دوسری عرّادۂ گردان
جو گھوم سکے، تیسری عرادۂ خفتہ جو صرف ایک جگہ قایم ہو۔ چوتھی
عرادۂ رواں، جو ایک مقام سے دوسرے مقام تک حرکت کرسکے
فردوسی۔ اسدی اور نظامی کے ہاں یہ لفظ ملتا ہے:-

فردوسی ؎

سکندر بفرمود تا جاثلیق ‏ بیارند عـــرادہ و منجنیق

اسدی طوسی ؎

بہر گوشــہ عرادہ برساختند ‏ ہمہ دیگ رخشندہ انداختند

نظامی گنجوی ؎

نہ عرادہ برگرد ادورہ شناس ‏ نہ از گردشــش منجنیقش ہراس

چرخ چرخ۔ سخت کمان کو کہتے ہیں۔ مثال میں فردوسی کا یہ شعر
شغاد آمد آں چرخ را برکشید ‏ بزہ کرد یکبارہ اندر کشید

اس کے علاوہ تیر اندازی کا بھی آلہ ہے۔ تاریخوں میں تیر دست اور
تیر چرخ بعض موقعوں پر ساتھ ساتھ ملتے ہیں جس سے مفہوم ہوتا ہے
کہ چرخ کمان سے علیحدہ آلہ ہے۔ محصورین و محاصرین دونوں اس
سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً ملک جو تنی کے یہ فقرے قابلِ غور ہیں:-

(در ذکر فتح نیشاپور بر دست مغول) "روز سیوم از برج قراقوش جنگ سخت می کردند و از بارهٔ دیوار تیر چرخ و تیر دست می ریختند۔"
(ص۱۲۷ جہاں کشای جوینی جلد اول طبع یورپ)
(ذکر فتح اخلاط بر دست جلال الدین منکبرنی) "و مجانیق و آلات دیگر از تیر چرخ و نفط ترتیب دادند و اندرون شہر ہم بکار ساختن حرب مشغول شدند۔ از جانبین منجنیق بر کار کردند و تیر دست و تیر چرخ چوں تگرگ ریزاں گشت۔" (ص۱۷۵ جلد دوم جہاں گشا)

چرخ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ پہیئے یا چرخی سے چلنے والی کمان ہے اور جنگوں میں قابل قدر آلہ ہے۔ تاریخوں میں بے شمار موقعوں پر اس کا ذکر ملتا ہے۔ جب چنگیزیوں نے نیشاپور پر حملہ کیا ہے اس وقت تین ہزار چرخ اور تین سو منجنیق اور عرادے شہر کی دیواروں پر موجود تھے۔ مگر محصورین ہمت ہار چکے تھے چنانچہ عطا ملک کا فقرۂ ذیل :-

"اہالی نیشاپور چوں دیدند کہ کار جد است و ایں قوم نہ آنند کہ دیدہ بودند باز آنکہ سہ ہزار چرخ بر دیوار بارہ برکار داشتند و سی صد منجنیق و عرادہ نصب کردہ و از اسلحہ و نفط در خور ایں تعبیہ دادہ تامت را پاے سست شد و دل از دست برفت۔" (ص۱۲۹ جلد اول جہاں گشا)

بامیان کی یورش کے وقت چنگیز خاں کا پوتا چغتائی کا فرزند تیر چرخ سے مارا جاتا ہے:-

"ناگاہ از شست قضا کہ قضاے کل آں قوم بود تیر چرخی

کہ عجلت ندا داز شہر بیروں آمد و بیک پسر جغتائی رسید کہ محبوب ترین احفاد چنگیز خاں بود۔" (ص۱۰۵ جلد اول جہاں کشا)

امیر تیمور کی جنگوں میں بھی تیر چرخ موجود ہے۔ چنانچہ شرف الدین قلعہ ادنیک کی فتح کے وقت لکھتا ہے:-

"حضرت صاحب قران فرمود کہ اُمرائے تومان ہر کس بسیبۂ خود استادہ منجنیقہا ترتیب کردند و سائر اسباب حصار از عرادہ و رعد و تیر چرخ آمادہ داشتہ کورگہ و نقارہ فرو کوفتند۔ (ص۲۹۰ ظفرنامہ جلد اول۔ طبع کلکتہ)

دقیقی کے ہاں شاہنامے میں تیر چرخ مذکور ہے:-

پس انجا هش آمد یکے تیر چرخ چنیں آمدہ بود ش از چرخ بلخ

(ص۴ جلد سوم۔ شاہنامہ۔ طبع بمبئی ۱۲۷۵ء)

فردوسی نے چرخ اور کمان چرخ دونوں شکلوں میں لکھا ہے چنانچہ:-

پس منجنیق اندرون رومیاں ابا چرخ ہا تنگ بستہ میاں

(ص۲ جلد دوم شاہنامہ)

شعر ذیل میں فردوسی اس کی آواز کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اگرچہ صاف واضح نہیں کہ اس کا مقصد چرخی گھومنے کی معمولی آواز ہے یا ایسی آواز جو کسی آتشگیر مصالحے کے بھڑکنے سے پیدا ہو:-

زبانگ کمان ہائے چرخ و زردود شدہ روئے خورشید تاباں کبود

(ص۲ جلد دوم)

چھٹی صدی کے نصف اول کے شاعر ازرقی کے شعروں سے مفہوم ہوتا ہے کہ چرخ آتش زنی کا آلہ بھی ہے۔ اس کے ممدوح طغان

شاہ نے سیستان کے ایک قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ جب وہ قلعے کے معائنے کے واسطے میدان میں آیا۔ برج پر سے ایک چرخ انداز نے دیکھ لیا۔ اس نے فوراً اپنے چرخ کو آگ سے بھر لیا اور طغان شاہ کے آہن پوش گھوڑے پر اس کا تیر چھوڑا جو ملک طغان کے پانو سے ایک ہاتھ بلکہ اس سے بھی کم فاصلے پر لگا۔ وہ شعر یہ ہیں:۔

زشہ برجی قضا را چرخ داری — ملک را دید در میدان برابر
وز آتش چرخ دا پر کرد و بشتافت — کز آتش بیند او باد اش وکیفر
بزد بر بارہ برگستوان دار — خدنگ راست رو بر گستوان در
ز زخم تیر تا پائے خداوند — بدستی ماندہ بد یا نیز کمتر

(انجمن آرائے ناصری)

فرہنگ شرف نامہ تالیف ۸۴۲ھ اور موید الفضلا میں چرخ کی یہ تشریح دی گئی ہے:۔

"چرخ کمان حکمت کہ از آلات حصار گیری است و تیر چرخ بدان اندازند" کمان حکمت کو بہار عجم میں ایک قسم کی منجنیق بتایا ہے۔

فرہنگ جہانگیری میں چرخ کو بان یا حقۂ آتشیں کی مانند کہا گیا ہے فرہنگ نگار کا بیان ہے:۔

"چیزے باشد مانند تیر ہوائی کہ از آہن بسازند و درون آں پر از باروت کردہ آتش زنند و بر جانب دشمن سر دہند و بر ہر کس کہ خورد ہلاک سازد۔ انوری در صفت آسمان گفتہ ؎

نہ منجنیق رسد بر بحرش نہ کشکنجر — نہ تیر چرخ زساماں برشدن بوثقا

یہ بیان فرہنگ نگار کے زمانہ کے واسطے صحیح مانا جاسکتا ہے مگر قدیم زمانے

کے تعلق میں البتہ صحیح نہیں کیونکہ باروداں ایام میں موجود نہیں تھی۔ یہاں تک تو خیریت تھی مگر متاخرین نے اسے بندوق کے ساتھ شناخت کرکے ہمارے لیے راہ راست سے بھٹکنے اور غلط قیاسات قائم کرنے کا سامان فراہم کردیا ہے۔ ان کا بیان ہے:-

"بمناسبت کمان و تیر تفنگ را نیز چرخ گویند و گلولہ آں را تیر گویند زیراکہ چنانکہ کمان تیر را بقوت جسمانی بازوے کمان دار بہ دشمن رساند تفنگ ہم بقوت و نیروے داروی آتشیں کہ باروت باشد گلولہ راکہ بمنزلہ پیکان تیراست بخصم رساند۔ حکیم ازرقی در مدح طغان شاہ در جنگ سیستان و تیر انداختن تفنگ داری از فراز برج گفتہ"

(فرہنگ انجمن آرائے ناصری)

شعر میں اوپر نقل کر آیا ہوں۔ ازرقی کے زمانے کے لیے یہ خیال کرنا کہ بندوق اور گولی موجود تھی روایت و درایت کے منافی ہے۔ ازرقی نے صرف اسی قدر کہا ہے "ز آتش چرخ را بگرد و بشناخت"۔ جس کی بدیہی توجیہ یہی ہے کہ آگ تیر کے ذریعے سے پھینکی گئی۔ قلعے سے محاصرین پر آگ اور قار وغیرہ نفط پھینکنے کا عام دستور رہا ہے۔ اگر اس چرخ دار نے طغان شاہ پر تیر آتش بست پھینک دیا تو کیا حرج ہے۔

دیگ اگر ہم لغت نگاروں کے بیانات پر اعتبار کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ بندوق تو بندوق توپ بھی قدیم زمانے میں موجود تھی اور رستم کا پردادا نریمان توپ کے گولے سے ہلاک ہوا تھا۔ دیگ کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں:-

"دیگ معروف است و بمعنی توپ بزرگ نیز آمدہ است کہ در

قدیم الزمان در قلاع و حصار برائے حفظ داشتہ و می گزاشتہ و با دارو ہاے آتشیں انباشتہ بجانب خصم می افگندند و بعضے دراز چنانکہ ہست و بعضے کوتاہ تر بترکیبے کہ اکنوں خم پارہ گویند و بپارہ خم ماند کہ زبر او شکستہ و زیر او قدرے باقیست و گلولہ آن از سنگ می کردہ اند۔ حکیم علی اسدی در گرشاسپ نامہ۔

یکے دیگ منجر دران قلعہ بود کہ تیرش بدا ز سنگ صد من فزود
بدا رو مرآن رعد انباشتند ہمہ روز تا شب نگہداشتند
ازاں برج آں سنگ آمدرہا بدان آتش و دود چوں اژدہا
زبارہ مرآن رعد انداختند جہاں از زبان بیرد ختند

و آں دیگ را دیگ رخشندہ می گفتہ اند کہ از آتش می درخشید۔ اسدی

بہر گوشہ عرّادہ برساختند ہمہ دیگ رخشندہ انداختند

(فرہنگ انجمن آرائے ناصری)

شاعر کا مقصد ہے کہ قلعے میں ایک دیگ (منجر؟) تھی جس کا تیر سو من (فارسی من) کے گولے کا تھا۔ اس کو بارود سے بھر دیا۔ رات پڑے وہ گولہ اس دیگ سے آگ اور دھوئیں کے ساتھ چھوڑا گیا۔ بس جیسے ہی قلعے سے توپ چھوٹی زبان سے دنیا خالی ہوگئی۔ ان شعروں کا متن میرے نزدیک مشتبہ ہے۔ اگر متاخرین کے ہاتھوں ان اشعار کے متن میں قطع و برید نہیں ہوئی تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان میں توپ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ دارو بارود کے واسطے اور رعد توپ کے لیے متاخر زمانے میں عام استعمال میں آئے ہیں۔ آتش و دود بھی اسی عقیدے کی طرف رہنمائی کرتے

ہیں۔ایک بات کی کمی رہ گئی ہے کہ توپ کی گرج کا مذکور نہیں آیا۔چونکہ یہ تنہا بیان ہے اس لیے اس پر بغیر مزید متواتر شہادت کے بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ایک امر قابل گزارش ہے کہ اس روایت کی رو سے نریمان توپ کے گولے سے مارا جاتا ہے۔شاہنامے میں فردوسی نے بھی نریمان کی موت کی طرف اشارہ کیا ہے۔رستم جب پیل سفید کو ہلاک کر چکتا ہے۔ زال اس کی جرأت پر بہت تحسین کرتا ہے اور نریمان کا انتقام لینے کے واسطے کوہ سپندان روانہ کرتا ہے۔ اس موقع پر شاعر نریمان کی ہلاکت کے متعلق لکھتا ہے ؎

سر انجام سنگے بیندا ختند جہاں راز پہلو بہ پرداختند

(صفحہ ۳۶ جلد اول شاہنامہ ۱۲۷۵ھ)

جس سے ظاہر ہے کہ نریمان کی موت ایک پتھر سے واقع ہوئی تھی جو قلعے سے اس پر گرایا گیا تھا۔

مذکورۂ بالا اشعار میں نے فرہنگ انجمن آرائے ناصری سے گرشاسپ نامۂ مطبوعۂ بمبئی سے مقابلے کے بعد نقل کیے تھے۔اب جب گرشاسپ نامہ کا ایک معتبر نسخہ جو اواخر قرن نہم یا ابتدائے قرن دہم کا نوشتہ ہے میری نظر سے گزرا تو میں یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ ابیات مذکور الصدر جن میں نریمان کی وفات کا تذکرہ ہے اس نسخے میں موجود نہ تھے۔اس نسخے کی رو سے فریدون گرشاسپ کی وفات پر تعزیتی خط مع خلعت نریمان کو بھیجتا ہے۔ ماتم کے اختتام پر خود نریمان دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ فریدون اس کو علم اژدہا پیکر اور جہان پہلوانی کا منصب عنایت کرتا ہے اور سام کو شیر کا درفش اور 'سپہبد' خطاب دیتا ہے

اور سیستان کو رخصت کر دیتا ہے۔ الغرض برسوں تک نریمان جہان پہلواں اور سام سپہبد رہے۔ عین اس موقع پر گرشاسپ نامہ ختم ہوتا ہے اور خاتمہ کتاب جس میں تاریخ تصنیف وغیرہ درج ہے شروع ہوتا ہے۔ یہ اشعار میں یہاں نقل کرتا ہوں:-

سر مہ نریمان چو آمد بہ پیش ۔۔۔ بسے ہدیہ بخشیدش از گنج خویش
درفشیش داد اژدہا فش سیاہ ۔۔۔ جہاں پہلواں خواندش در سپاہ
دگر شیر پیکر درفشے بسام ۔۔۔ بداد و سپہبدش فرمود نام
فراواں دگر گوہر و سیم و زر ۔۔۔ بہ بخشید شاں اسپ و تیغ و کمر
سوسیستان ہر دو را شاد باز ۔۔۔ فرستاد و بنشست با کام و ناز
بسے سال ازاں پس میان گواں ۔۔۔ سپہبد بد این واں جہاں پہلواں
از یشان کنوں نام ماندست بس ۔۔۔ بہ گیتی نزیست جاوید کس
چو بستد ز ما مرگ یکبارہ کام ۔۔۔ زتن خاک ماند ز کردار نام

اس کے بعد چھ شعر دنیا کی بے وفائی کے ذکر میں لا کر شاعر اپنا خاتمہ یوں شروع کرتا ہے:-

شد ایں داستان بزرگ اسپری ۔۔۔ بہ پیروزی روزی و نیک اختری
ز ہجرت بد در سپہری گذشت ۔۔۔ شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت

بہر حال اس مخطوطے میں نریمان کی وفات کا ذکر نہیں آتا۔ میرے خیال میں نریمان کی وفات کے منقولہ بالا ابیات الحاقی ہیں اور اسدی ان کا مالک نہیں۔

کشنجیر | فرہنگ نگاروں نے بھی سلوک کشکنجیر کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے معنے بھی بڑی توپ بیان کیے ہیں

فرہنگ جہانگیری میں اس کی تشریح یوں مرقوم ہے:-

"توپ کلان را گویند کہ بدان دیوار قلعہ بشکنند و بینداز ند معنی ترکیبی آں کو شک سوراخ کن ست چہ کشک مخفف کو شک بود و انجیر سوراخ را گویند۔"

انجمن آرائے ناصری میں یہ تشریح ملتی ہے:-

"کشکنجیر توپ کلاں کہ بپارسی دنگ و دیگ زخشندہ نیز گویند۔"

مگر فرہنگ بحر الفضائل میں جو ۸۲۲ھ کی تالیف ہے اس کے معنے "نوعے از منجنیق" دیے ہیں اور نوروز نامے سے جو حکیم عمر خیام کی تالیف ہے معلوم ہوتا ہے کہ کشکنجیر ایک خاص قسم کی نہایت سخت اور طاقتور کمان ہے جس سے حصار شکنی میں کام لیا جاتا ہے۔ نوروز نامے کی اصل عبارت حسب ذیل ہے:-

"وزن کمان بلند ترین شش صد من نہادہ اند و مرآں را کشکنجیر خواندہ اند و آں مرقلعہا را بود۔ فرد ترین یک من بود و مرآنرا بہر کودکان خورد سازند۔" (صفحہ نوروز نامہ)

منوچہری کے شعر سے بھی پایا جاتا ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا سخت زہ آلہ ہے۔ جس کے چلانے میں ایک سے زیادہ آدمی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہوا ہذا:-

داد حشن ہرگاں اسپہبد عادل دہد آں کجا تنہا بہ کشکنجیر اندازد خدنگ

ہندوستانی فرہنگ نگار قبل مغل اس کا مختلف بیان دیتے ہیں:-

شرف نامہ تالیف ۸۷۰ھ:-

"کشک انجیر۔ یکے از آلات جنگ و آں سنگے است کہ بقوت

دوا ہاے آتشیں رواں کنند بہندش گولہ گویند و کشکنجیر بواو نیز نویسند معنی ترکیبی آں سوراخ کنندہ کوشک است "

عماد السعادت مؤلفہ ۹۱۹ھ:-

"کشکنجیر و کیک انجیر کاف مضموم، یکے از آلات جنگ آتشکے است بقوت دارو ہا رواں کنند بہندش گولہ خوانند"

مؤید الفضلا تصنیف ۹۲۵ھ:-

"کشک انجیر یکے از آلاتِ جنگ و آں سنگے است کہ بقوت دوا ہائے آتشیں رواں کنند"

میرے خیال میں یہ بیان ان فرہنگ نگاروں کے عہد کے واسطے بالکل قابلِ اعتبار ہے۔ بارود اس وقت تک عام ہو چکی ہے جس کو یہ مصنفین دوا ہائے آتشیں اور دارو ہا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ہندی نام گولہ دیتے ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بارود کی نفوذی طاقت معلوم ہونے کے بعد سب سے اول اس کا استعمال گولے اور بان کی شکل میں کیا گیا ہے:۔

فردوسی کے ہاں ایک شعر آتا ہے:-

گرفتند گردان ایران زمیں کمانہاے زنبوری و چرخ کیں

اس شعر میں کمان زنبوری قابلِ غور ہے جس کی تشریح بہار عجم میں یوں دی گئی ہے:-

"کمان زنبوری۔ ف۔ کنایہ از تفنگ کہ بتازی بندوق و ترکی بلتیق خوانند"

اب کیا ہم یہ مان لیں کہ فردوسی کے عہد میں بندوق رائج تھی۔

فرہنگوں میں جو یا لغز ہمارے واسطے موجود ہیں۔ ان میں تفک بھی شامل ہے۔ اس کے متعلق مرقوم ہے:۔

تفک "تفک و تفنگ بضم و فتح دوم ف۔ بندوق، مرکب است از تف مبدل تپ بیائے فارسی کہ مخفف توپ است و کاف ونگ ہر دو کلمہ نسبت یا تشبیہ چنانک در ہوشنگ و دیرنگ و تورتنگ و آنرا در ہندی تپک بیائے فارسی خوانند و تفق معرب آنست"

میں تفک کی بعض مثالیں بھی عرض کرتا ہوں:۔

نظیری نیشاپوری: ؎

در مغز تفک زور کند آتش سودا آتش زد ہان جوش زند مار دہاں را
از ہول صدائے تفک نعرہ گردوں سکان سموات گزارند مکاں را

ص ۱۴۲

احسن التواریخ: ؎

ز تیغ و تفک ہائے آہن ستیز ز ہر گوشہ بازار کیں گرم خیز

(دیگر)

دراں عرصہ از بہر مردان جنگ تفک نقل و خوں بادہ لالہ رنگ
یلاں از تفک دادہ دہا ز دست زنقل چناں گشتہ بے بادہ مست

ص ۱۴۸

طالب آملی: ؎

دم از وقوف تفک ننگ نیست می خواہم چرا کہ صحبت ادگشتہ بے دلیل تمام

یہ اکبر اور جہانگیر کا زمانہ ہے جس میں تفک بمعنی بندوق زیادہ رائج ہے۔ اس عہد کے بعد اس کا مرادف تفنگ عام ہو جاتا ہے اور تفک متروک ہو جاتا ہے۔

متقدمین کے ہاں تفک بالکل مختلف چیز ہے جس سے یہ بھی ظاہر

ہو جاتا ہے کہ جو وجہ اشتقاق اوپر مذکور ہے درست نہیں اس کی معرب شکل تفق ہے۔ انوری ؎

نہ از فراز تواں جست حیلہ سرکوب نہ از نشیب تواں یافت جایگاہ تفق

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی آلہ حصار شکنی ہے لیکن قاضی خاں بدر معروف بدھار وال جو اپنی فرہنگ ادات الفضلا ۸۲۲ھ میں تصنیف کرتے ہیں۔ اس لفظ کی یوں تشریح دیتے ہیں:۔

"تفک نئے نیزہ کہ بدان غلولہ اندازند۔ مانند تیر (می رود)

شرف نامۂ احمد منیری میں ابراہیم بن قوام فاروقی کا بیان ہے:۔

"تفک۔ نئے نیزہ خالی کردہ کہ بدان غلولہ اندازند"

مولنا محمود ابن شیخ ضیا تحفۃ السعادت تالیف ۹۱۶ھ میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"تفک۔ تاے مضموم و فاے مفتوح۔ نئے خالی یا چوبی خالی کردہ کہ بدان غلولہ اندازند"

یہ ان مصنفین کا بیان ہے کہ جو مغلوں سے پہلے گزرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بندوق کا حلیہ نہیں ہے کیونکہ یہ ایک نئے یا پولے بانس کا ٹکڑا ہے جس کے ذریعے سے مٹی کا خشک یا تر غلہ چلایا جاتا ہے۔ صاحب فرہنگ جہانگیری نے اس موقع پر مزید تفصیل سے کام لے کر تمام گنجلک کو رفع کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تفک چوبی بود میانہ تہی بدرازی نیزہ گلولہ از گل ساختہ در آں نہند و پف کنند بزور نفس گلولہ بر جانور کوچک اگر خورد اندازد و بندوق را بمشابہت آں تفک خوانند"

ایک قلمی فرہنگ میں جس کے نام سے میں نا واقف ہوں یہ عبارت ملتی ہے:-

"تفک بضم تا و فتح فا بکاف عربی زدہ ، چوبی باشد میان تہی بدرازی نیزہ کہ گلولہ درآں نہند وپف کنند تا بزور نفس آں گلولہ بیرون جہد جانوراں کوچک مثل گنجشک باں بزنند و بندق را بمشابہت آں تفک نیز گویند"۔

گویا تفک دراصل اس بچوں کے کھلونے کا نام تھا جو غالباً گیلا غلہ ڈال کر چلائی جاتی تھی جس سے ننھے ننھے جانور شکار ہو سکتے تھے۔

انوری ؎

جاں خصم از تیر سیمرغ افگنت بر شاخ عمر بادلرزاں در برش چوں جان گنجشک از تفک

(کلیات ص۲۴۳)

امیر خسرو نے بھی اپنی مثنوی نہ سپہر میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے ؎

مرغ محقر کہ بمیرد بہ تفک طرفہ سوا دیست زخطہائے فلک

میں ایک اور مثال مثنوی طرفۃ الفقہا سے جو بعہد فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ تصنیف ہوتی ہے۔ نقل کرتا ہوں۔ یہ فقہی تالیف مولنا رکن الدین مرید شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی یادگار ہے۔ اس کے نامۂ صد و نود و ہشتم میں بہ ذیل مسائل صیدیہ فقیہ موصوف لکھتے ہیں:-

صید را اگر بہ تیر گز بہ کشد آں حرام است ہیچ کس نچشد
بندقہ نیز مثل ایں داند در تفک می زند بدیں ماند

(ق ۳ لف)

تفک ان ابیات میں غالباً انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جو امیر خسرو کے ہاں لیے گئے ہیں اور جس کی تشریح ہم اوپر دیکھ آئے ہیں یعنی نئے نیزہ۔ بندقہ سے یہاں مقصد بندوق نہیں ہے بلکہ وہی غلہ۔

بارود کی ترویج نے تفک میں اہم تبدیلی پیدا کر دی یعنی یہ کہ بجائے بانس کی نے کے لوہے کی نال آگئی اور پھونکنے کا کام بارود نے لے لیا۔ گویا بندوق تفک کی اصلاح یافتہ شکل ہے۔

یہاں مجھے ایک اور آلے پفک کا ذکر کرنا چاہیے جو تفک کے مشابہ ہے بلکہ شاید تفک ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک نیزہ نما لکڑی ہے جسے طولاً دو حصوں میں چیر کر بندوق کی نال کی طرح اس میں گاؤدم سوراخ کر لیا جاتا ہے اور ہموار کر کے دونوں نصفوں کو جوڑ لیتے ہیں۔ جوڑے منہ کی طرف سے گیلی گولی ڈال کر پھونک کے ذریعے سے پھینکی جاتی ہے۔ چھوٹے پرندے بلکہ کبوتر تک شکار ہو جاتے ہیں لیکن مشق کی ضرورت ہے۔ خواجہ عمید کے یہ ابیات ملاحظہ ہوں:-

یارب اگرچہ پیش ازیں بود مرا دل و جگر | خستۂ لعبت چگل بستۂ دلبر بکاسہ
دست فشاندہ ام بریں پائے کشادہ ام زنا | جستہ ز ہر دو دام گہ چوں گل خانۂ از تفک

ناوک اسی کے قریب ناوک ہے۔ یہ ایک پولی لکڑی ہوتی تھی جس میں رکھ کر تیر کو ایک خاص طریقے سے چلاتے تھے۔ اس کی کمان تخش کہلاتی تھی۔ کثرت استعمال سے تیر ناوک کہنے لگے۔ ناوک کا تیر اور تیروں کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ صاحب مصطلحات الشعرا کا قول ہے کہ ناوک ایک نے ہوتی ہے جس میں چھوٹا تیر رکھ کر اور زہ کمان میں بند کر کے چلاتے ہیں۔ کبھی یہ نے لوہے

کی نیلیتے ہیں۔ جسے نے ناوک کہتے ہیں اصل عبارت فارسی یہ ہے:-

"ناوک، مصغر ناو، وآں چوبی است میان تہی کہ تیر را دران گزاشتہ بوضعی مخصوص می اندازند و کمان این چوب را تخش گویند و بکثرت استعمال تیر مذکور را تیر ناوک خوانده اند و این مجاز است و این تیر کوچک باشد نسبت بسائر تیرہا و صاحب مصطلحات الشعرا گوید ناوک نے کہ تیر کوچک معروف دراں گزاشتہ و بزہ کمان بندکرده کشا دہند و گاہے آں را از آہن سازند ــ ناوک گویند۔

اسباب قلعہ گیری ونقب زنی

میں نے نمونتاً صرف بعض الفاظ پر قناعت کی ہے جن میں فرہنگ نگاروں نے نئے ہتھیاروں کو پرانے نام دے کر ہمارے لیے مغالطے کے اسباب مہیا کردیتے ہیں اور شبہ ہونے لگتا ہے کہ ممکن ہے توپ اور بندوق قدیم ایام سے موجود ہوں۔ اس لیے اس مسئلے پر کسی قدر اور غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ امر یقین کی حد تک واضح ہوجاتا ہے کہ آتشی آلات میں سے اسلاف کے پاس آگ تیل اور نفط کے سوا اور کوئی مرکب یا مصالحہ موجود نہیں تھا۔ فردوسی کے زمانے سے لے کر امیر تیمور کے عہد تک جس میں چنگیزیوں کے خروج کا زمانہ بھی شامل ہے اسباب قلعہ گیری میں کوئی جدید اضافہ نظر نہیں آتا۔ قلعوں کی نقب زنی کا جو طریقہ شاہنامے کے صفحات میں دیکھا جاتا ہے وہی طریقہ ہم امیر تیمور کی قلعہ کشائیوں کی داستانوں میں پڑھتے ہیں۔ حصار گیری کی تاریخ میں تیمور کا نام سب سے مقدم آنا چاہیے۔ اس کی فوج میں سفر مینا کا عملہ نہایت

زبردست معلوم ہوتا ہے اور کوئی قلعہ نہیں جسے اس کی سپاہ نے چند روز میں نہ فتح کرلیا ہو مگر اس کے ہاں بھی کسی جدید آلے کا مذکور نہیں آتا۔
اب میں بعض قلعوں کی فتح کا ذکر کرتا ہوں :-

شاہنامے کا بیان | فردوسی نے شاہنامے میں جو بعض قلعہ کشائیوں کے بیانات دیے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ بڑی حد تک اس کے اپنے عہد کے ایسے واقعات کا صحیح مرقع ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ذیل کے بیانات ہمارے مطلوبہ سوال پر روشنی ڈالتے ہیں:-

جب رستم شہر بیداد فتح کرنے جاتا ہے۔ اس کا قلعہ جو تور بن فریدوں نے تعمیر کیا تھا نہایت مضبوط تھا۔ رستم نے اپنی فوجیں قلعے کے چاروں طرف متعین کردیں اور قلعے پر سخت سنگ باری اور تیر باری شروع کردی۔ خود رستم نے کمان ہاتھ میں لے کر ہر اس شخص کو جس نے دیوار سے سر باہر نکالا چن چن کر مارنا شروع کیا۔ اس پر قلعے والے بہت سراسیمہ ہوئے اس کے بعد دیوارِ قلعے کی تہ میں نقب کھودی گئی اور اس کے نیچے شہتیر لگا دیے۔ ان پر نفط ڈال دی۔ جب نصف دیوار میں نقب لگ گئی تو شہتیروں میں آگ لگا دی گئی جس سے دیوار گر گئی چنانچہ فردوسی :-

پیٔ بارہ زاں پس بکندن گرفت	ز دیوار مردم فگندن گرفت
ستونہا نہادند زیر اندرش	بیالود نفط سیاہ از برش
چو نیمے ز دیوار در کندہ شد	بہ چوب اندر آتش پراگندہ شد
فرود آمد آں بارۂ تور گرد	ز ہر سو سپہ اندر آمد بگرد
بفرمود رستم کہ جنگ آورید	کمانہا و تیر خدنگ آورید

(صفحہ ۱۹۰ شاہنامہ طبع بمبئی ۱۲۷۶ھ)

ایک اور مثال سنیے۔ کنگ دژ افراسیاب کا قلعۂ خاص ہے۔ جب کیخسرو اس کی تسخیر کے لیے آیا۔ اس نے اپنی فوجیں قلعے کے گرد جما دیں اور ان کے سامنے شبخون سے حفاظت کے خیال سے خندق کھدوا دی۔ قلعے کے گرد دوسو عرّادے اور منجنیق اور دوسو چرخ لگا دیئے۔ منجنیقوں کے پیچھے رومی اپنے اپنے چرخ کے ساتھ کھڑے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دوسو ہاتھی، شہتیر جنھیں فردوسی ستون کے اصطلاحی نام سے یاد کرتا ہے۔ لیتے جائیں۔ قلعے کی دیوار کے نیچے سرنگ کھودی اور شہتیر جما دیے ان پر نفط سیاہ چھڑک دی۔ اب بادشاہ نے حکم دیا کہ قلعے کے دروازوں پر یورش کی جائے۔ ادھر ان لکڑیوں اور نفط میں آگ لگا دی گئی۔ نفط سیاہ کے بھڑکنے سے لکڑیوں نے آگ لے لی اور جل اٹھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف کی دیوار گر گئی اور شگاف میں سے ایرانی فوجیں اندر داخل ہوگئیں۔ میں فردوسی کے طویل بیان سے صرف ضروری ضروری ابیات نقل کرتا ہوں:-

بہ لشکر بہ فرمود پس شہریار	یکے کندہ کردن بگرد حصار
دو نیزہ بہ بالا یکے کندہ کرد	سپہ را بہ گردش پراگندہ کرد
بدان تا شب تیرہ بر داختن	نیارد ز ترکاں کسے تاختن
دو صد بارہ عرّادہ و منجنیق	نہاد از برش ہر یکے جاثلیق
دو صد چرخ بر ہر سوے بنگیاں	ز دیوار دژ چوں سر بدرگیاں
پدید آمدی منجنیق از برش	چو ژالہ ہمی کوفتے بر سرش
پس منجنیق اندرون رومیاں	ابا چرخ ہا تنگ بستہ میاں
دو صد پیل فرمود پس شہریار	کشیدن ستونہا بہ پیش حصار

یکے کندہ زیر بارہ دروں — بہ کندہ نہادند زیرش ستون
پراگندہ بر چوب نفط سیاہ — براں گونہ فرمود نیرنگ شاہ ص۲۵۲
بہ فرمود تا سخت بر ہر دری — بجنگ اندر آمد گراں لشکری
بدان چوب و نفط آتش اندر زدند — ز بر شاں ہمی سنگ بر سر زدند
ز بانگ کماں ہائے چرخ و زرود — شدہ روئے خورشید دشمن کبود
ز عرادہ و منجنیق و زگرد — زمیں نیلگوں شد ہوا لاجورد
ز نفط سیہ چوں بہار فرخت — بہ فرمان یزداں چو ہیزم بسوخت
نگوں بارہ گفتی کہ برداشت پائے — بکردار کوہ اندر آمد ز جائے
بر آمد خروشیدن کارزار — بہ پیروزی لشکر شہریار
سوئے رخنۂ دژ نہادند روی — بیامد دمان رستم جنگجوی ص۲۵۸/۲

چنگیزی افواج چنگیزی افواج سنہ ۶۱۶ھ میں مغولستان سے نکل کر توران و ایران۔ افغانستان و عراق۔ چین و روس میں پھیل جاتی ہیں۔ ان کے سیلاب کو نہ کوئی لشکر روک سکا اور نہ کوئی قلعہ۔ لیکن اقوام مغول اپنی ظفر مندانہ پیش قدمی کے دوران میں نہ کہیں کسی آتش بار آلے سے دو چار ہوئیں اور نہ خود استعمال میں لا رہیں اگرچہ قابل حیرت سرعت کے ساتھ انہوں نے شہروں اور قلعوں کو فتح کیا ہے۔

قلعۂ جند مغرب کی طرف ان کے کوچ کے وقت جند سب سے پہلا قلعہ ہی جو ان کے سر راہ واقع تھا۔ انھوں نے آتے ہی قلعے کا محاصرہ کر کے خرک اور منجنیق لگا دیے "و لشکر بکبس خندق و استعداد آں از خرک و نردبان و غیر آں اشتغال نمودند"

(جہانگشا صہ ۶۹ جلد اول) اہل قلعہ حیران ہوئے اور شہر کے دروازے بند کر کے فصیل کی دیواروں پر بیٹھ گئے اور چنگیزی افواج کا تماشا دیکھنے لگے اور اچنبھا کرتے رہے کہ حملہ آور قلعے کی بلند دیواروں پر کیونکر چڑھیں گے۔ مگر جب خندق کے پل تیار ہو گئے اور سیڑھیاں قلعے کی دیواروں کے ساتھ لگ گئیں تب ان کی آنکھیں کھلیں اور ایک منجنیق لاکر لگا دی ابھی منجنیق سے پہلا ہی پتھر چلایا تھا کہ پتھر ہوا میں اٹھ کر اسی منجنیق پر آگرا۔ جس سے منجنیق ٹوٹ گئی۔ اس اثنا میں حملہ آور سب طرف سے دیوار پر چڑھ آئے اور شہر بغیر کسی کی نکسیر پھوٹے ان کے قبضے میں آگیا۔

فتح بخارا بخارا کی فتح میں بھی منجنیقوں عرادوں اور قارورہائے نفط سے کام لیا گیا ہے چنانچہ عطا ملک جوینی بالفاظ ذیل رقم کرتے ہیں:۔

"مردمان بخارا بجنگ حصار راندند و از جانبین تنور جنگ تفسید از بیرون منجنیقہا راست کردند و کمان ہا را خم دادند و سنگ و تیر پران شد و از اندرون عرادہا و قارورات نفط رواں شد" (صہ ۸۲ جلد اول جہانگشا)

خوارزم جب خوارزم میں حملہ آور پہنچے وہاں پتھر نایاب تھا۔ اس لیے شہتوت کے درخت جن کی وہاں افراط تھی کاٹ کاٹ کر پتھر کی جگہ استعمال کیے۔ چنانچہ مورخ موصوف لکھتے ہیں:۔

"و ترتیب آلات جنگ از چوب و منجنیق مشغول گشت و چوں در جوار خوارزم سنگ نبود از درختہائے توت سنگہا می ساختند" (صہ ۹۹ جلد اول جہانگشا)

نیشاپور مرو کی تباہی سے فارغ ہوکر فاتحین نے نیشاپور کا رخ کیا۔ ہراول میں بہت سی منجنیقیں اور دیگر آلات قلعہ کشائی تھے اگرچہ نیشاپور سنگستانی علاقہ ہے۔ مگر احتیاطاً کئی منزل سے وہ پتھر اپنے ساتھ لے کر آئے اور جگہ جگہ انبار لگا دیے۔ حالانکہ ان کا دسواں حصہ بھی خرچ نہ ہوا ”ودر مقدمہ لشکر بسیار آلات مجانیق و اسلحہ بشادیاخ فرستاد و بازانکہ نشاپور سنگلاخ بود از چند منزل سنگ بار کردہ بودند و با خود آوردہ چنانکہ خرمنہا ریختند و عشر آں سنگہا در کار نہ شد“ (ص۱۳۹ جلد اول)

باوجودے کہ قلعے کی دیواروں پر تین ہزار چرخ تھے اور تین سو منجنیق اور عرادے نصب تھے۔ اسی قیاس پر دیگر اسلحہ اور نفط کا سامان تھا۔ مگر نیشاپوری ان کی جنگ کا ڈھنگ دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے۔

قلعہ الموت اور کمان گاو ہلاگو خاں نے ۶۵۴ھ میں قلعہ الموت کا محاصرہ کیا۔ چرخ و مجانیق کے علاوہ جن میں پتھر کی جگہ درخت کاٹ کاٹ کر پھینکے گئے۔ ہم ایک نئی چیز کماں گاو کا ذکر پڑھتے ہیں۔ جو چینی استادوں کی ایجاد بتائی گئی ہے۔ اس کا نشانہ اگر میں عطا ملک جوینی کی عبارت کو صحیح سمجھا ہوں ڈھائی ہزار قدم جاتا تھا۔ ہمارے مورخ کا بیان قابل غور ہے۔ وہ ہو ہذا۔

”و کمان گاو را کہ اساتذۂ ختائی ساختہ بودند آماج آں مقدار دو ہزار گام، براں ... خران چوں جز آں درماں نداشت برکار کردند و شیاطین ملاحدہ بنصال شہب آسائے متجندہ بسیار سوختہ گشتند“

(ص۱۲۸ جلد سوم۔ جہانگشائے جوینی (گب میموریل)

میرے خیال میں ایک نشانے کا بغیر بارود کی امداد کے ڈھائی ہزار قدم جانا نہایت دشوار ہے۔ کیا یہ کوئی آتشی آلہ ہے؟ ہم کہہ نہیں سکتے۔ بدقسمتی سے مصنف کا بیان اس قدر مختصر ہے کہ ہم کوئی رائے بھی قایم نہیں کر سکتے پچھلے فقرے میں شیاطین کی رعایت سے شہاب اور شہاب کی رعایت سے سوختہ گشتند لایا گیا ہے۔ اس فعل کا تعلق بہ ظاہر کمان گاؤ سے نہیں معلوم ہوتا۔

قرابغرا تیموری جنگوں میں ایک اور آلہ " قرابغرا " کا نام ملتا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کوئی ترکی کل ہے جو منجنیق اور عرادہ کی وضع کی معلوم ہوتی ہے۔ نظام الدین شامی کے ہاں یہ لفظ سب سے پہلے میری نظر سے گزرا ہے چنانچہ :-

" اشارت فرمود تا منجنیقہا و عرادہای متعدد ساختند و قرابغرا ہارا ترتیب دادند و نردبانہا را راست کردند در طرف بالائے قلعہ بناہی از سنگ و چوب آغاز کردند و فرمان شد کہ چناں بلند بر آورند کہ بر قلعۂ ایشاں نگاہ کند (ذکر قلعۂ برنس از گرج)

مطلع السعدین سے دو مثالیں منقول ہیں :-

" قاریان بہ طرف شرقی شہر کہ بہ دروازۂ سعادت موسوم است فرود آمدند و عرادہ و قرابغرا و منجنیق ترتیب دادند " صفحہ ۹۵

" و حضرت صاحب قران از برابر در قلعہ بہ طرف پشت قلعہ نقل فرمود و منجنیق و عرادہ و قرابغرا و نردبانہا مرتب ساختند و دراں محل کہ منزل ہمایوں یعنی پشت قلعہ بود بلجور از سنگ و چوب چنداں (بلند) بر آورند کہ در قلعہ نگاہ می کردند " صفحہ ۹۹ (فتح قلعہ گرجستان)

معلوم ہوتا ہے کہ قرابغرا یورپ میں بھی پہنچ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام

بگڑ کر "کرابگا" اور "کلابرا" بن گیا۔ کرنل یول مرتب سفرنامۂ مارکو پولو میں
کو بڑی قسم کی منجنیق بتاتے ہوئے گویا ہے کہ ترک اور عرب اسے قرابغرا
کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو نام یورپ میں "کرابگا" (Crabaga)
اور کلابرا (Calabra) بن گیا۔ مرینو سنوڈو اول الذکر نام لاتا ہے۔ ولیم
آف ٹیوڈیلا آخر الذکر نام لکھتا ہے۔ جب سائمن ڈی مونٹ فورٹ کیبر نے
البیجنیز کے خلاف ان کا استعمال کیا۔" (ص ۱۶۳ جلد دوم)

قلعہ ترشیز منجنیقوں اور عرادوں سے صرف قلعے کی دیواروں میں شگاف ڈالنے کا کام لیا جاتا۔ نقب زنی میں دیواروں
کی جڑیں کھوکھلی کر کے خالی جگہ ستون لگا دیے جاتے اور لکڑیوں کا انبار
رکھ کر اور نفط ڈال کر آگ لگا دی جاتی جس سے دیوار نیچے آ رہتی۔ تیمور
کی یورشوں میں یہی طریقہ عام ہے اور اس کی تاریخ میں نقب زنی کے
واقعات کثرت سے نظر آتے ہیں۔ جن کی مورخین نے کسی قدر تفصیل بھی
دی ہے۔ مثلاً قلعۂ ترشیز کے محاصرے کے وقت جب منجنیق اور عرادے
نصب ہو چکے۔ تیمور نے نقبچیوں کے نام حکم بھیجا کہ قلعے کی خندق کاٹ کر
اس کا پانی نکال دیں اور دیوار کی بنیاد میں نقب لگائیں۔ چنانچہ اس
پر عمل کیا گیا:۔

"مہندسان کاروان بر حسب فرمودہ منجنیقہا بساختند و عرادہا راست
کردہ برافراختند و فرمان شد تا نقبچیان چیرہ دست نقب در خندق بریدہ
آنرا از آب خالی ساختند و در زیر حصار نقبہا بنیاد انداختند" (ص ۳۴۱
ظفر نامہ۔ جلد اول۔ شرف الدین یزدی، کلکتہ)

قلعہ از مصر تیمور کے عہد میں نقب زنی۔ قلعہ کتانی کی ...

شاخ بن گئی ہے جس کی نظیر قدیم تاریخ میں نہیں ملتی ۔ ایک اور مثال سنیے جو قلعہ ازمیر کی تسخیر کے وقت ظفر نامے میں ملتی ہے :-

"وچون نقبچیان نقبہا بریدہ وسنگہا بیرون آوردہ برج و بارۂ حصار را بر سر چوبہا گرفتند حکم قضا مضا صدور یافت ونقبہا راہمہ نفط آلود انباشتہ آتش زدند دیوار ہائے قلعہ چون بخت اذلنا مخالفان سرنگوں شد و بسیارے از کفار با دیوار حصار بر خاک غیبت رخسار افتادند" (ص ۴۷۵ جلد دوم ظفر نامہ شرف الدین)

قلعہ تکریت بعض نقب زنی کی تفصیل مطلع السعدین اور ظفر نامے میں ملتی ہے ۔ مثلاً قلعہ تکریت کے محاصرے کے وقت جب منجنیق اور عرادے قلعے کے محاذ میں لگ گئے ۔ حکم ہوا کہ چالیس نقبیں قلعے کی فصیل میں لگائی جائیں ۔ ہر ہر نقب ایک ایک امیر کے سپرد ہوئی نسخہ تفصیل بوساطت جکہ تواجی لشکر میں تقسیم ہو گیا (تفصیل اسمائے امرار حذف کی جاتی ہے) نقب زن نقب زنی کرتے اور فوجی مٹی ڈھوتے ۔ امیر تیمور بار بار خبر منگواتا کہ کون سی نقب کہاں تک پہنچی ۔ ایک نقب جلال باورچی اور بیان قوچین کے حصے میں آئی ۔ انھیں ۳۵ گز پتھر کاٹنا پڑا ۔ مجوف مقامات ستون کھڑے کر کے لکڑی اور نفط سے بھر دیے ۔ ۲۰ تاریخ شب چہار شنبہ کو آگ دے دی ۔ قلعے کی دیواروں کا اکثر حصہ زمین پر آ رہا ۔ بتی صوفی نے جس برج میں نقب لگائی تھی تمام و کمال ڈھ گیا اور دشمن کے بیس آدمی اس کے ساتھ کام آئے ۔ امیر کا پھر فرمان آیا کہ فصیل کا باقی حصہ جو ابھی کھڑا ہے بذریعہ

نقب گرا دیا جائے۔ جو برج الہ داد اور امان شاہ کے متعلق تھا۔ بدرالدین نے بنیاد سے کھود کر گرا دیا۔ میں ان مورخین کے اصل الفاظ یہاں نقل کرتا ہوں :۔

"روے ہمت بہ تسخیر حصار بر آورد و ندو عراد ہا نصب کردند و منجنیقہا برافراختند و خانہائے آں خانیان بزخم سنگ خراب ساختند۔ ص ۴۴۶ (چہل نقب مقرر شد و ہر نقب بہ عہدۂ امیری کردہ) تواجیان بر حسب فرمان زمین بخش کردہ بموجب تفصیل بر لشکریان قسمت کردند و حکہ تواجی نسخہ تفصیل بر دمان رسانید و بکار نقب مشغول گشتند۔ ص ۴۴۹ [شب و روز جاخو یان بہ نقب کندن و لشکریان بخاک بیروں آوردن و آں را بکار فرمودن مشغول بودند و حضرت صاحب قران ہر ساعت می پرسید کہ ہر نقبے بہ کجا رسیدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و یک نقب بعہدۂ جلال باورچی بیان قوچین۔ و ایشاں سی و پنج گز سنگ بریدند۔[1]] و ہر جا کہ مجوف شد برسر ستونہا داشتہ بودند از ہیمہ و نفط پر کردند و شب چہار شنبہ بیستم آتش زدند۔

ز نفط سیہ چوبہا بر فروخت	ستونہا سراسر ہمہ پاک سوخت
زبس دود کامد فراز از فرود	سیہ شد بیک بارہ چرخ کبود
چناں دود شد سوے گردون تاب	کہ شد چشم ہاے کواکب پر آب
نگوں بارہ گفتی کہ برداشت پاے	بہ کردار کوہ اندر آمد ز جاے

و اکثر دیوار ہاے قلعہ بر زمین افتاد و برجی کہ ہیق صوفی خالی کرد بہ کلی منہدم شد و بیست کس از دشمنان بزیر افتادند ۔ ۔ ۔ حکم جہا

[1] قلابین کی عبارت مطلع السعدین سے منقول ہے۔

مطاع نفاذ یافت و دیگر دیوار ہا کہ ماندہ بود از اطراف وجوانب نقب زدہ مجوف ساختند و بیند اختند. برجی کہ سرکار الہ داد و امان شاہ بود بدرالدین از بیخ برکندہ بیند اخت۔ (ص۴۵۳ ظفرنامہ از شرف الدین یزدی۔ جلد اول)

قلعۂ حلب قلعۂ حلب کی تسخیر کے موقع پر نقب سے کام لیا گیا ہے۔ مولٰنا نظام الدین شامی لکھتے ہیں کہ علاء نقب زنی حسب الحکم رات بھر میں خندق کو چھلنی کی طرح سوراخ دار کرکے اور پانی عبور کرکے خاک ریز تک پہنچ گیا اور قلعے کی بنیاد میں جو سنگ خارا کی بنی تھی سرنگ لگانی شروع کر دی۔ چنانچہ ان کی عبارت ہے:۔

"لشکر را اشارت کرد تا پیرامون خندق نزول کردند و بزخم تیر نگزاشتند کہ کسے از دشمنان سر از اوج بیروں تواند کرد و علاء چاخورگان را فرمان شد تا یک شب حوالے خندق را چوں غربال سوراخ کردند و از آب گزشتہ برروئے آں خاک ریز چوں کیک بر دویدند و در تنگ قلعہ کہ بسنگ خارا استوار کردہ بودند نقب آغاز نہادند" ص۲۲۳ ظفرنامہ جلد اول مرتبہ فلکس تاور ۱۹۳۷ء میں بخوف طوالت صرف انہی چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ملجور قلعوں کی تسخیر کے واسطے عموماً ایسے طریقے اختیار کیے جاتے تھے جو ان کے ماحول اور مقامی کیفیت کے مناسب ہوں۔ تیمور نے بعض حالات میں ملجور سے کام لیا ہے۔ ملجور وہی ہے جسے ہم دھس اور دمدمہ کہتے ہیں۔ یہ ایک بلند تعمیر یا چبوترہ ہے جو لکڑیاں ایک دوسرے پر چن کر تیار کیا جاتا ہے۔ جوف میں پتھر اور مٹی

بھر دیتے اور مٹھتے جاتے ہیں حتیٰ کہ چبوترہ قلعے کی دیوار سے بلند ہو جاتا ہے۔ پھر اس پر سے سنگ باری کرتے ہیں۔ قلعہ اونیک کی حصار بندی کے وقت جب منجنیقیں اور عرادے کامیاب ثابت نہ ہوئے تیمور ملچور کی تیاری کا حکم دیتا ہے۔ اس کے لیے فوجی دور و دراز مقامات سے درخت کاٹ کر لاتے ہیں اور ملچور بناتے ہیں۔ میں شرف الدین کے ظفر نامہ سے ایک عبارت نقل کرتا ہوں:۔

"یرلیغ لازم الاتباع بہ نفاذ پیوست کہ در مقابل حصار ملچور سازند . . . . وبجد ہرچہ تمام تر آں چوبہا را برہم بر نہادند و لشکریان میان آں را بہ سنگ و گل پُر می کردند و برمی آوردند تا ملچور تمام شد و از حصار ایشاں بلند تر آمد۔ چنانچہ بر قلعہ مشرف بود؎

چو ملچور سرکوب شد با حصار ‌‌ ‌ بہ گردون برآمد دم کارزار
گروہ سپہ بر سر ملچور ‌ ‌ چو دریاے جوشاں برآمد بشور

واز بالاے ملچور کہ با کاخ ناہید و قصر ہور برابر ساختہ بودند و از زار منجنیقہا کہ از اطراف و جوانب حصار برافراختہ بودند چنداں سنگ بہوائے آں قلعہ پراں گشت۔" (صفحہ ۶۹۶ ظفر نامہ۔ جلد اول)

قلعۂ دمشق میں قلعۂ دمشق کی فتح کی ایک اور مثال دے کر اس کو ختم کرنا چاہتا ہوں:۔

قلعۂ دمشق نہایت مضبوط اور مستحکم تعمیر ہوا تھا۔ اس کی دیوار نیا دسے لے کر چوٹی تک بھاری بھاری پتھروں کی بنی تھیں۔ اس خندق بیس گز چوڑی اور تیس گز گہری تھی۔ قلعے میں سامان جنگ مقدار میں موجود تھا اور محافظ فوج بے شمار تھی۔ جب قلعہ کے

تیموری افواج آگئیں۔ تیمور کے حکم سے حسب ضابطۂ مستمرہ امیرزادگان میرانشاہ شاہرخ۔ سلطان حسین۔ پیر محمد۔ خلیل سلطان و دیگر امرائے بزرگ امیر شیخ نورالدین۔ امیر شاہ ملک۔ برندوق اور امیر سلطان نے اپنے اپنے دستوں سے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اور اپنے اپنے علاقے مقرر کرکے نقب زنی اور منجنیق اندازی میں مشغول ہوگئے۔ خندق کے گرد لکڑی۔ پتھر وغیرہ کا ایک حصار کھڑا کرلیا۔ نقب زنوں نے انتہائی مستعدی کے ساتھ کام شروع کردیا۔ قلعے سے قارورہائے نفط اور پتھروں کی بارش ہونے لگی اور تیر و ناوک مینہ کی طرح برسنے لگے لیکن ان جوانوں نے مطلق پروا نہیں کی۔ سپرین سرپر رکھ کر آگے بڑھتے اور نقبوں کی جگہ مقرر کرنے اور منجنیقیں لگاکر سنگ باری کرتے جس سے قلعے والے ہلاک اور عمارتیں تباہ ہوتیں۔ جب نقبیں تیار ہوچکیں۔ صاحب قران نے آتش زنی کا حکم دیا۔ پہلے قلعے کے مغربی برج پر آگ دی جس سے برج زمین پر آرہا اور دیوار میں بہت بڑا شگاف پیدا ہوگیا۔ حملہ آور اس شگاف کے راستے سے دھاوا کرنا چاہتے تھے کہ اتنے میں نصف دیوار اور گرگئی جس سے گرد کے دل بادل نمودار ہوگئے۔ حملہ رک گیا۔ اہل قلعہ نے اس مہلت سے فائدہ اٹھاکر رخنے کو بند کردیا۔ امیر نے حکم دیا کہ دوسری نقبوں میں آگ لگادی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سمت کی دیوار منہدم ہوگئی۔ محصورین اس قدر خائف ہوئے کہ قلعہ کا دروازہ کھول کر باہر آگئے اور امان مانگ لی۔ اس کے بعد باقی سرنگوں میں بھی آگ لگادی اور دمشق کا عظیم الشان قلعہ تودۂ خاک بن گیا۔ تباہی دمشق ۸۰۳ھ

کا واقعہ ہے۔ ذیل میں نظام الدین شامی کی اصل عبارت نقل کی جاتی ہے:۔
"قلعۂ بود در غایت حصانت و نہایت استواری۔ بنائے وے از زیر تا بالا بہ سنگہائے عظیم برآوردہ و بغایت بلند و اعتمادی ساختہ و خندقے فراخ گرد وے در غور سی گز و عرض بیست گز تخمیناً۔ ۔ ۔ حکم نافذ شد تا امیرزادہ میران شاہ بہادر و امیرزادہ شاہ رخ بہادر و امیرزادہ سلطان حسین بہادر و امیرزادہ پیر محمد بہادر و امیرزادہ خلیل سلطان بہادر و از امرائے بزرگ امیر شیخ نورالدین و امیر شاہ ملک و بر ندوق و علی سلطان پیرامون قلعہ بہ ترتیبے کہ مقررست فرود آمدند و سرکارہا تعیین کردہ بہ نقب زدن و منجنیق ساختن مشغول شدند و از چوب و سنگ و تورہا حصار کردہ خندق برآوردند۔ عملہ و جاخورگان سجدے کہ بالاتر ازاں تصور نتواں کرد بکار مشغول شدند [و سنگ ہائے عظیم را آتش می تافتند و سرکہ براں می ریختند و بہ چنیں شکستہ بیرون می آوردند و بارہ برجہا را بر سر چوب می گرفتند[۱]] و ہر چند از بالائے قلعہ قارورہائے نفط و سنگ می انداختند و تیر و ناوک بر مثال باران می باریدند۔ ایں امرائے نامدار وجوانان کارزار ازاں باک نداشتند و تورہا در سر کشیدہ پیش می رفتند و سرہائے نقب تعیین می کردند و منجنیقہا از اطراف برپا کردہ ہر یک سنگ کہ از کفۂ منجنیق روانہ می شد خلقے ہلاک می گشت یا عمارتے خراب می شد۔ ۔ ۔ سلطان حسین بہادر و التون بخشی کہ بر جانب برج غربی قلعہ بودند عملہ را فرمودند تا آتش در انداختند، برجے عظیم از قلعۂ دمشق فرود افتاد و راہی بزرگ در حصار پدید آمد۔ بہادران لشکر خواستند کہ در حصار درآیند ناگاہ نیمہ دیگر از دیوار بیفتاد و گرد و غبارے عظیم

---

[۱] قلابوں کی عبارت صفحہ ۲۲۳ جلد دوم ظفرنامۂ شرف الدین یزدی سے منقول ہے۔

برآمد و لشکریان باز نشستند۔ اہل قلعہ فرصت دیدند و آں رخنہ را باز محکم گردانیدند۔ ۔ ۔ ۔ باز امیر صاحب قران فرمود تا در نقبہا آتش اندازند۔ چناں کردند۔ یک طرف حصار بیک بار فرود آمد اوراز بزرگان قلعہ از سر ضرورت بیروں آمدند و در مقام انقیاد و فرمان برداری دروازہ کشادند و کلید ہا پیش آوردند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و در باقی نقبہا کہ ماندہ بود ہم آتش انداختند تا قلعۂ بدان عظمی چناں خراب شد کہ اثرے ازاں باقی نماند۔" (ظفر نامہ ۳۴۳-۳۴۷)

گزشتہ بیانات سے ضرورت سے زیادہ واضح ہوجاتا ہے کہ نقب زنی کے وقت مغولی اور تیموری عساکر صرف آگ اور نفط سے کام لینا جانتے ہیں۔ بھاری پتھر گرم کرکے سرکہ ڈال کر توڑتے ہیں۔ اگر ان کو بارود کی نفوذی طاقت اور اس کی شدتِ استعداد کا علم ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس مصالحہ سے کام نہیں لیتے بارود اگرچہ تیمور کے عہد سے ایک صدی قبل سے رائج مگر افادی لحاظ سے اس قدر طاقتور نہیں کہ نقب زنی میں نفط کو ہٹاکر اس کی جگہ لے لیتی۔

آتش بار آلات اور تیمور تیمور کو خال خال موقعوں پر آتش بار آلات سے سابقہ پڑا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ابتدائی حالت میں ہیں اور کسی قابلِ لحاظ نتیجے کے مورث نہیں۔ اس کے مورخ ان کو لعب یا کھلونے کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہندوستان وہ مقام ہے جہاں ان آلات کو اس نے پہلی بار دیکھا۔ لیکن اس

کے متعلق آئندہ. دوسرا موقع دمشق میں پیش آتا ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے:۔

امیر تیمور دمشق کے محاصرے کے وقت جب بار دوم اپنا ایلچی بھیجتا ہے۔ برخلاف اول دمشقی ایلچی کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اس مُلک میں آتش بازی اور رعد اندازی کا بہت رواج تھا۔ ایلچی کو مرعوب کرنے کے لیے آتش بازوں کی جماعت اس کے سامنے لائی گئی۔ تیمور کے درباری مورخ نظام الدین شامی لکھتے ہیں:۔

"برخلاف گزشتہ مقدم ایلچی را باعزاز پیش آمدند و مراسم تعظیم وبزرگ داشت بجا آوردند و دریں میانہ رعد اندازان و چرخ کشایاں و ناوک زناں وآنچہ ازیں جنس مردم باشد بر عرض می کردند و نمی دانستند کہ ازیں قبیل بیشتر از دہ ہزار مرد کار آزمودہ در اردوے امیر صاحب قران ہستند" (صفحہ ۲۳۲ ظفر نامہ جلد اول)

شرف الدین یزدی اسی واقعے کے ذکر میں یوں رقم پرداز ہیں:

"چوں فرستادہ بایشاں رسید۔ برخلاف گزشتہ متقدم اورا باعزاز و اکرام پیش آمدند و مراسم ترحیب و تعظیم بجا آوردند و چوں دراں دیار آتش بازی و رعد اندازی بسیار می ورزند و آں را پیش ایشاں وقعے ہست نخبہ ازاں طائفہ مردم را جمع آوردند و در نظر او می گزرانیدند و آں را اظہار قوتے و شوکتے تصور می کردند" ظفر نامہ جلد دوم صفحہ ۳۱۶)

یہی موقع مطلع السعدین میں یوں مرقوم ہوا ہے۔

"دشمنان فرستادہ را بر خلاف گزشتہ معزز داشتہ مراسم اکرام و شرائط احترام بجا آورد و جماعت آتش بازان و تیر اندازان و چرخ کشایان و ناوک زنان کہ پیش ایشان [illegible] داشتہ و این لعب را دران دیار می ورزند بر ایشان عرض کردند چنانچہ گویند کہ ازیں قماش بیشتر از دہ ہزار مردان کار آزمودہ جنگ با دیدہ در اردوے ہمایوں بودند" (صفحہ [illegible])

ان عبارتوں میں آتش باز سے مقصد آتش بازی بنانے والا نہیں ہے۔ بلکہ وہ شخص جو آلات آتش فشاں سے جنگ کرے اس میں شک نہیں کہ توپ و بندوق بر آتش اور ہسپانیہ سے جو ان کی ولادت گاہ ہیں نکل کر مشرق و مغرب میں رواج پا چکی ہیں اور مصر و شام مشرقی ممالک کے مقابلے میں ان سے پہلے واقف ہو چکے ہیں۔ مگر تیمور کے مورخوں کا یہ دعویٰ کہ دس ہزار سے زیادہ آتش باز تیمور کی فوجوں میں تھے ہمیں احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے کیونکہ اس کی تاریخ میں اس جماعت کا ذکر صرف گنتی کے چند مقامات پر آتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر دو سطروں کے تعلق میں۔

رعد و کمان رعد تیمور کی جنگوں کے دوران میں ایک نئے آلے رعد کا ذکر آتا ہے۔ یہ نام نظام الدین کے ظفرنامہ میں جو بہ حکم تیمور ۸۰۶ھ میں تصنیف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں ملتا ہے۔ اس کے چلانے والے کو رعد انداز

بیان کیا گیا ہے۔ شرف الدین کے ظفر نامے میں "کمان رعد" بھی آیا ہے۔ رعد جیسا کہ اس کے تسمیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کوئی بلند آواز گولہ یا آلہ ہے۔ اور یقیناً تازہ ایجاد ہے۔ کیونکہ تیمور سے قبل کی تاریخوں میں اس کا مذکور نہیں آتا نظام الدین شامی کے ہاں صرف تین چار جگہ ملتا ہے۔ شرف الدین کے ہاں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ممکن ہے کہ رعد آتشی آلہ ہو مگر ان مورخین نے اس کے متعلق کوئی تصریح یا اشارہ نہیں کیا۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ وہ قلعہ شکن آلہ ہے کیونکہ عرادے اور منجنیق کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر آتا ہے۔ اہل لغت رعد کا ترجمہ توپ کرتے ہیں لیکن تیموری مورخین کے بیانات سے اس قول کی کوئی تائید یا تردید نہیں ہوتی، البتہ مطلع السعدین کے ایک جملے سے جو سلطان بایزید کے ساتھ جنگ کے موقع پر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کمان رعد کوئی آتش بار آلہ ہے۔ چنانچہ۔

" وچند زنجیر فیل دمان کہ از غنایم ہندوستان بدرگاہ بادشاہ جہاں ستان بود . . . . ہمہ بسلاحا وجیباہا آراستہ، تیر اندازان و آتش بازان بر بالائے آں دست بہ تیر ناوک و کمان رعد کشودہ در آثار جلادت کمال شجاعت نمودہ "

(صفحہ ۲۲۵۔ مخطوطہ)

اس فقرے میں 'کمان رعد' کا تعلق صریحاً 'آتش بازان' کے ساتھ ہے۔ مگر تیمور کے قدیم اور معتبر مورخ نظام الدین شامی کے ہاں یہ فقرہ در اصل یوں ہے:-

"وچند زنجیر فیل دمان کہ بسر خرطوم دمار از بر بیان برآوردند سے ودندان کینہ برسینۂ دشمن رسانیدندے لبلاجہا وجیبہا آراستہ و تیر اندازان وآتش بازان بر بالائے آں دست بہ تیر و ناوک ونفط اندازی کشودہ" (ص۲۵۵ ظفرنامہ)

شرف الدین کے ظفرنامہ سے نظام الدین کی تائید ہوتی ہے چنانچہ :-

"وچند زنجیر فیل شکوہ مند کوہ مانند کہ از بقیہ غنایم ہندوستان باردوے ظفر مکان بودند ہمہ را بجمیع انداختہ و با اسلحہ واسباب جنگ مکمل ساختہ و بر بالائے ہر یکے کمان داران حکم انداز ونفط اندازان آتش باز جنگ را آمادہ گشتہ" (ظفرنامہ ص۴۶۶)

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ اصل جملے میں نفط' اندازان' تھا جسے صاحب مطلع السعدین نے 'کمان رعد' کے ساتھ بدل دیا اور اس طرح ہم ایک ایسی مثال سے جو 'کمان رعد' کو آتشی آلہ ثابت کرتی تھی محروم ہو گئے۔

یہاں وہ جملے درج کیے جاتے ہیں جن میں نظام الدین شامی نے لفظ 'رعد' استعمال کیا ہے۔

"(تسخیر قلعہ اونیک) امیر صاحب قران فرمود تا منجنیقہا ترتیب کنند و رعد وعرادہ وتیر وچرخ آمادہ گردانند۔ چناں کردند"

(ص۱۵۵ ظفرنامہ)

"(شہر دمشق) اما امرا ولشکریان کہ در قلعہ بودند بحصانت آں استظہار نمودہ مخالفت می ورزیدند و رعد وناوک ومنجنیق

وعزادہ کار می فرمودند وتیری انداختند " (صفحہ ۲۴۳ ظفرنامہ سنہ ۱۸۸۷ء)

ان فقروں سے تو واضح نہیں ہوتا۔ کہ رعدکوئی آتشیں آلہ ہو۔ بدقسمتی سے اس تفتیش میں شرف الدین بھی ہماری کوئی امداد نہیں کرتا۔ اس نے اپنے ظفرنامے میں جو سنہ ۸۲۸ھ میں شاہ رخ میرزا کے حکم سے تالیف کیا ہو۔ متعدد موقعوں پر رعد اور رعد اندازوں کا ذکر کیا ہو۔ مگر اس کی اطلاع بھی نظام الدین کی طرح مبہم ہو۔ بلکہ ایک فقرے سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہو کہ کمان رعد منجنیق کی طرح کوئی آلہ ہو جس سے پھینکنے کا کام لیا جاتا ہو۔ اس کے لیے مجھے ایک واقعے کا ذکر کرنا چاہیے۔ جو تیمور کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہو، وہ یہ ہو:-

ازمیر سمندر کے کنارے ایک قلعہ تھا۔ جس پر فرنگی قابض تھے جب تیمور فتح روم سے فارغ ہو کر اس طرف پہنچا۔ مسلمانوں نے فرنگیوں کے جور و تعدی کی شکایت اس سے کی۔ امیر نے قلعے کا محاصرہ کرکے اس کو فتح کرلیا۔ قلعے والوں کی امداد کے لیے ایک بڑا جہاز سمندر میں آیا۔ ازمیر اس وقت تک مفتوح ہوچکا تھا۔ تیمور نے اہل جہاز کی تخویف کے لیے حکم دیا کہ مقتولین کے سر کمان رعد میں رکھ کر جہاز میں پھینکے جائیں۔ تاکہ اہل جہاز کو ان کا انجام معلوم ہوجائے۔ شرف الدین لکھتا ہو:-

" اشارت علیہ صدور یافت کہ از سرہائے گبران کہ بہ تیغ غزا از تن جدا شدہ چندے بہ کمان رعد سوئے کشتی اندازند و رعد اندازان سرے چند بجانب ایشان انداختند و بعضے در کشتی افتاد و چوں آں

کوردلان بچشم سر سر بجنبان خود مشاہدہ کردند خایف و خاسر بازگشتند
(ص۷۷ جلد دوم)

مجموعۃ الصنائع کا بیان لیکن مجموعۃ الصنائع کے بیان سے جو اس عہد سے بہت بعد کی تصنیف ہے اور ہندوستان میں لکھی جاتی ہے، مفہوم ہوتا ہے کہ کمان رعد یقیناً کوئی آتشیں آلہ ہے جس میں فتیلے کے ذریعے آگ دی جاتی ہے اور گولی یا گولے پھینکے جاتے ہیں یہ تو بندوق یا توپ کا حلیہ ہے۔

روغن اسکندری اس رسالے کا نامعلوم مصنف روغن اسکندری کے پھینکنے کی ترکیب بتاتے ہوئے جو شدید قسم کا آتش گیر اور جس سے دشمن کے قلعے اور شہر کو آگ لگائی جا سکتی ہے اور کسی طرح بجھائی نہیں جا سکتی تحریر کرتا ہے۔

لہ مصنف کا نام سیوکی بتایا جاتا ہے (فہرست انڈیا آفس) بعض حکیم فیلسوف مغربی کی طرف منسوب کرتے ہیں جو درست نہیں۔ فہرست اسٹوریٹ میں زین العابدین مرقوم ہے۔ زمانہ تصنیف نامعلوم ہے۔ مگر اس کا ترجمہ ۱۱۲۵ھ کا نوشتہ (فہرست وہانا جلد دوم ص۵۲۳) موجود ہے۔ مجموعۃ الصنائع کا ایک نسخہ ۱۰۶۰ھ کی کتابت کتاب خانہ بوڈلی میں محفوظ ہے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر دسویں صدی ہجری کی تالیف ہو کتاب اگرچہ ہندوستان میں تصنیف ہوئی ہے مگر اس کے مآخذ قدیم معلوم ہوتے ہیں مثلاً بارود کو داروے کمان لکھا ہے۔ آتش بازی جن سے بعض نسخے منقول ہیں زیادہ تر مصری۔ شامی۔ بغدادی اور خوارزمی ہیں۔ علیٰ ہذا آتش بازی کی اصطلاحیں قدیم معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً غوطہ خوارک۔ زرجک۔ موشک۔ زنبورک۔ گردانک خرک۔ گروانک۔ ریسانک اور خوطک اندر قفس وغیرہ ان کے عیار دانگ اور مثقال میں دینا بھی اسی عقیدے کا مؤید ہے۔

"در تعبیہ کردن روغن اسکندری کہ آتش در قلعہا وشہرہا انگیزد۔ بیارند آہن دراز وغلولہ سازند گرد کہ میان او خالی بود کہ مقدار دو سہ درم ازیں روغن یا بیشتر دران گنجد و سوراخے دریں غلولہ باشد بہ قدر آں کہ روغن مذکور درو پُر کردہ فتیلہ نیز دران سوراخ رود و دے غلولہ بغایت استوار باشد چنانکہ آں را در کمان رعد نہند و فتیلہ نیز درمیان سوراخ غلولہ نہند و سوراخ رعد را فتیلہ نہند و روے بہ شہر دشمن کنند و آتش در فتیلہ رعد زنند۔ بہ مجرد رسیدن غلولہ دران قلاع آتش دراندرون بہ روغن غلولہ رسیدہ باشد و آں روغن ہا بر غلولہ آلودہ شود . . . . . و شہر دشمنان سوختہ شود۔" (ص۴۲)

روغن اسکندری وہی چیز معلوم ہوتی ہے جسے انگریز یونانی آگ (گریک فائر) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عربوں کے حملۂ قسطنطنیہ کے وقت رومیوں نے یونانی آگ کے ذریعے سے کامیاب مدافعت کی ہے۔ قیاصرۂ روم جو نسخہ استعمال کرتے تھے۔ باوجود تلاش کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ وہ گویا ان کا قومی راز تھا۔ ایک مصنف کی رائے میں یونانی آگ کے اجزا یہ تھے:۔ صنوبر کا پسا ہوا گوند۔ گندھک اور نفط۔ فرائر بیکن صرف دو اجزا بتاتا ہے۔ شورہ اور گندھک۔ ایک اور مصنف کی رائے ہے:۔ بید کا کوئلہ۔ نمک۔ گندھک۔ رال۔ لوبان کا تیل اور جلشہ کی اون جن کو ملا کر ابالا جاتا ہے۔ رینو اور فاوے کی تحقیقات کی رو سے یہ مادہ محرقہ ایک مرکب تھا۔ گندھک اور گوند اور

چربی کی قسم کی جلنے والی اشیا کا۔

صاحب مجموعۃ الصنائع کے نزدیک روغن اسکندری کے اجزا یہ ہیں:۔ نفط فارسی۔ سندروس طلق نمک سس۔ روغن نے سب کو لے کر ایک دیگچی میں رکھ کر جس کا منہ خام کر دیا جاتا ہے دو دن برابر گرم تنور میں رکھا جاتا ہے۔ پھر بھٹی کی آگ میں دن بھر پکایا جاتا ہے۔ ہفتے بھر پڑا رہنے کے بعد دیگچی کا منہ کھول لیتے ہیں اور روغن قابل استعمال ہو جاتا ہے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس روغن کے دو درم دشمن کا شہر پھونک دینے کے لیے کافی ہیں۔ آگ کو جس قدر بجھانے کی کوشش کی جائے گی اتنی ہی بھڑکے گی۔

مغربی مصنفین کا بیان

مغربی مصنفین کے بیان کے مطابق روغن اسکندری (یونانی آگ) مشرقی یورپ میں ۶۷۰ء کے قریب معلوم تھا۔ جب سلطنت ادلی میں کانی من کس فلسفی نے یونانیوں کو اس کا استعمال سکھایا۔ خود اس نے اس مرکب کا علم عربوں سے حاصل کیا۔ یہ روغن مغرب میں نہایت دیر کے بعد پہنچا ہے اور اس کے استعمال کے خلاف مذہب اور جوان مردی کے نام پر اعتراض بھی ہوئے۔ ایم رینا د نے اپنی تصنیف بیلیو تک ڈیس کروسیڈز میں اس آتشی مرکب کی متعدد اقسام تیسری صلیبی جنگ کے ایک مورخ ابن الاثیر کے قلم سے دی ہیں۔ اس مورخ کا بیان ہے:۔

جب عیسائیوں نے عکے کا محاصرہ کیا۔ شہر میں ایک دمشقی شخص مدافعت میں امداد دینے کی غرض سے آیا۔ محاصرین

نے چوبی منارے تیار کرلیے تھے۔ شخص مذکور نے ہانڈیوں میں نفط اور دیگر اجزا بھر کر ان مناروں پر پھینکے۔ ان کے ساتھ چونکہ سلگتا شتابہ نہیں تھا اس لیے عیسائیوں کو ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس پر یہ لوگ ہنسے اور محصورین کا مضحکہ اڑانے لگے۔ اس اثنا میں دمشقی نے اس آتشگیر مادے کو منارے پر پھیل جانے کا موقع دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک جلتا شتابہ پھینک دیا۔ دم کے دم میں تمام منارے میں شعلے بھڑک اٹھے۔ احتراق اس قدر شدید اور دفعتاً تھا کہ عیسائیوں کو منارے سے اترنے کا موقع بھی نہ ملا۔ الغرض تمام سپاہی، ان کے ہتھیار اور کنبہ آگ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔

سنہ [illegible]ء میں عیسائی پانی کے راستے ڈمیٹا کی طرف بڑھ رہے تھے کہ دشمن ان کی مزاحمت کے واسطے آگے بڑھے۔ یہ مسلمان اپنے جہازوں میں سوار عیسائیوں کے مقابلے کو آئے اور ایک نہایت سخت بحری جنگ شروع ہوئی۔ تیر اولوں کی طرح برس رہے تھے۔ آخر ایک سخت جنگ کے بعد مسلمانوں کی طرف سے نفط اندازی کی وجہ سے عیسائیوں نے جو رنج اور بھوک سے بالکل تھک چکے تھے۔ ہزیمت پائی۔ ایک خط میں جو ارل آف کارلیل کو اس کے دیوان نے تحریر کیا ہے۔ اس خونی جنگ کا ذکر جس میں صرف ایک آدمی بچا تھا بدیں الفاظ ہوا ہے: "مسلمانوں نے عیسائیوں پر روغن اسکندری پھینک کر ان کے بہت سے جہازوں کو جلا دیا اور جہازیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ اس طرح ان کو فتح حاصل ہوئی۔ غریب عیسائی یا غرق ہوئے یا قتل ہوئے یا جلا دیے گئے۔"

فادے اور ریناو

کپتان فادے اور ایم ریناد نے اپنی تصنیف میں یہ رائے
دی ہے کہ فرانسیسی شہزادوں کی قسطنطنیہ میں ۵۰ سال کی حکومت کے زمانے
میں جب ۱۲۰۴ء میں ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ روغن اسکندری کا راز
ان لوگوں کی نظروں سے جنھوں نے علم کیمیا میں کسی قدر ترقی کر لی تھی
مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ مشرق میں آتش انگیز آلات کا استعمال نہایت
رائج اور مستقل بن گیا تھا۔ یہ آلات بے شمار اقسام

رسالہ حسن الرماح

کے ہیں۔ اسی صدی کے ایک عربی رسالے میں
جو تالیف مذکورہ بالا میں ایم ریناد اور فادے نے شائع کیا ہے
ان آلات سے متعلق نہایت عجیب و غریب اطلاع ہم کو ملتی ہے۔ یہ رسالہ
یوں اور بھی دلچسپ بن جاتا ہے کہ اس میں خاص خاص آلوں اور
کلوں کی شکلیں بھی دی ہیں۔ یہ اگرچہ کسی قدر بھدی ہیں۔ فن جنگ کے
اس رسالے سے جو حسن الرماح کی تالیف ہے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ
تیرھویں صدی کے عرب آتش گیر مرکبات کا چار مختلف طریقوں سے
استعمال کرتے تھے۔ مادہ ہاتھ سے پھینکتے یا تیروں کی پیٹیوں میں
تعبیہ کر دیتے۔ جن کے ذریعے سے وہ دشمنوں پر حملہ کرتے۔ یا
نلکیوں کے ذریعے سے آتش فشانی کرتے یا جلتے مصالے کو تیروں
اور برچھوں کے ذریعے سے پھینکتے۔ نیز بڑے انجنوں کے ذریعے
سے جو مغربیوں کے "ٹریوشے" اور "منگونے" کے مشابہ تھے۔ ان
آتش افگن آلات میں شیشے کے قارورے۔ آگ کی ہانڈیاں۔ آگ
کے گھر، جنگی گرز۔ نفط بار سلاخیں (پچکاریاں) جنگی نیزے۔ پھول

برچھے۔ گرز والے نیزے۔ خطائی تیر والے نیزے۔ تیر لے۔ تیر منجنیق۔
تیر چینی۔ عراقی ہانڈیاں۔ ہلیلیہ کے مرتبان۔ شام کی ہانڈیاں (یہ
چاروں منجنیق کے ذریعے سے پھینکے جاتے ہیں) پھٹنے والے تشیں
حقے۔ سہم خطائی۔ پیالے وغیرہ شامل ہیں۔

قارورے اور گلی ظروف جو ہاتھ سے یا کلوں کے ذریعے
پھینکے جاتے ایسی ساخت کے تھے کہ جیسے ہی وہ اس نشانے پر
جس تک ان کا پہنچانا مقصود تھا پہنچے ان کے اندر کا مصالحہ چاروں
طرف بکھر جاتا ہے اور آگ جو شتابے کے ذریعے سے پہنچادی
گئی ہے فوراً ہر طرف سے ان اشیا کو گھیر لیتی جو اس کی رسائی
میں ہیں۔ ایک سپاہی جس کے سر پہ گرز آتشیں توڑا گیا تھا معاً ایک
خطرناک قسم کے نیالی مادے میں نہا گیا اور سر سے پاؤں تک
شعلوں میں لپٹ گیا۔ شعلے ایسے خطرناک تھے کہ کوئی چیز ان کو
نہیں بجھا سکتی تھی۔

(Massue de Guerre) کے بنانے کی ترکیب بھی
بیان کی ہے کہ شیشہ گر سے ایک گرز بنواؤ پھر وہی معمولی مرکب تیار
کرو اور آگ لگا کر اسے راہ خدا میں دشمن پر توڑ دو۔ ایسا کرتے
وقت ہوا کے جھونکے سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ
شعلے لوٹ کر تم کو جلا دیں۔

ایک نیزے میں آتش بازی لگی ہے۔ چنانچہ یہ نیزہ دشمن کو پھل کے ساتھ
زخمی کرتے ہی جلا بھی دے گا۔ اس عبارت سے ہم یہ سمجھے کہ یہ
آتشی ہتھیار فاصلے سے زخمی کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اسی

طرح آتشی ہانڈیاں اور بڑے قامت کے دیگر ظروف کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ (یورپ میں قدیم جنگی لباس اور ہتھیار صفحہ ۱۶۱ و صفحہ ۲۲۶ جلد اول، از جان ہیوئٹ)

ہندوستان

اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ کا جائزہ لیں اور اس ملک کے جنگی کارناموں کو اپنی تحقیقات کا مرکز بنالیں۔ غزنوی دور میں منجنیقوں اور نفط کا تذکرہ اگرچہ بہت کم ملتا ہے مگر جنگوں میں ان کا استعمال یقینی ہے۔ مسعود غزنوی

قلعۂ ہانسی

نے سنہ ۴۲۱ھ و سنہ ۴۲۳ھ میں جب قلعۂ ہانسی کا محاصرہ کیا ہے۔ ابوالفضل بیہقی کی روایت ہے کہ عروس جو منجنیق کی ایک خاص قسم ہے قلعے پر لگائی گئی اور پانچ جگہ نقب زنی سے کام لیا چنانچہ۔

" ولشکر منصور خاصہ غلامان سرائی داد بدادند و (بر) قلعہ پنج عروس برکار بود و آخر سمج گرفتند پنج جاے و دیوار فرود آوردند و بہ شمشیر آں قلعہ بستدند" (تاریخ بیہقی صفحہ ۶۶۵)

حصار برتر

غور کے حصار برتر کی تسخیر کے وقت بھی مسعود ان ہی آلات سے کام لیتا ہے۔

" لشکر را فرمود تا ہر چہار جانب فرود آمدند و بہ شب کاری ساختند و منجنیق می نہادند۔ چوں روز شد امیر برنشست و پیش کار

رفت بنفس عزیز خویش و منجنیقہا برکار کردند و سنگ رواں کردند و بسیج کردند از زیر دو برج کہ برابر امیر بود .... و سنگ منجنیق باتیر یار شد ..... وقت نماز پیشین دیوار بزرگ از سنگ منجنیق بیفتاد و گرد و خاک و دود و آتش بر آمد و حصار رخنہ شد و غوریان آں جا برجوشیدند و لشکر از چہار جانب روے برحصار آوردند۔" (ص ۱۳۲)

حصار اگرہ ہندوستان کی یہ خصوصیت ہے کہ اہل قلعہ محاصرین پر کثرت سے آگ برساتے ہیں جو برجوں میں تیار رہتی ہے۔ سیف الدین محمود بن ابراہیم غزنوی ۵۱ھ و ۴۹۲ھ اپنی ایالت ہند کے زمانے میں حصار اگرہ پر حملہ کرتا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ اس سے مراد یہی مشہور شہر آگرہ ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان لاہوری نے ایک قصیدے میں اس یورش کا ذکر کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ سیف الدین کی فوجوں نے قلعے کو سب طرف سے محصور کر لیا اور منجنیق اندازی شروع کر دی۔ قلعے سے محصورین حملہ آوروں پر آگ پھینکتے۔ جن کے شعلے متحرک سیارے معلوم ہوتے اور جو سوار قلعے کے قریب جانے کی جرأت کرتا اس کے گرد آگ کا ڈھیر جمع ہو جاتا:۔

سپہ چو دائرہ پیچید گرد حصن حصین	نمود حصن از و ہم چو نقطۂ پرکار
ز ہر چہار طرف سنگ منجنیق روا	برد چنانکہ سوے چرخ دعوت ابرار
ہر آتشے کہ بیند اختند از کنگر	چناں نمودی کز چرخ کوکب سیار
ہر آں سوارے کاندر میان آتش رفت	اگرچہ بودی آتش بہ گرد او بسیار
بروں شدی چو براہیم از دل آتش	بگرد ش آتش سوزندہ می شدی انبار

ملتان | چنگیزی افسر تربائے نقشی سلطان جلال الدین کی تلاش میں دریائے سندھ عبور کرکے بعض قلعے مسخر کرتا ہوا ملتان پر آدھمکا۔ ملتان میں منجنیقوں کے لیے پتھر نہیں ملا۔ اس لیے ملتانیوں کی حشری فوج منگوائی۔ لکڑی کے بیڑے تیار کرائے۔ ان پر منجنیق کے پتھر لدوا کر دریا میں بہا دیے اور انھیں منجنیق میں رکھ کر قلعے پر پھینکا گیا۔

"و در مولتان سنگ نبود، فرمود تا از آں جا حشر براندند و از چوب عدہا ساخت و بہ سنگ منجنیق پر کرد و بر آب انداختند چوں آں جا رسید منجنیق برکار داز بارہ بسیار بینداخت" (ص۱۱۲ جلد اول جہانگشا)

لاہور | چنگیز خاں کے جانشین اوکتائے قاآن کے سر لشکر طائر بہادر نے قلعہ لاہور منجنیقوں کے ذریعے تباہ کیا ہے۔ منہاج سراج لکھتے ہیں:-

"مدتے بر در شہر لوہور جنگ قایم گشت و لشکر مغل بر اطراف حصار لوہور منجنیق بسیار نہادند و بارہا خراب کردند و بداں مقدار کہ ملک قراقش را دست داد مقام نمود و جہاد کرد" (ص۳۹۳ طبقات ناصری)

غلاموں کے خاندان میں سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء تا ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) ایک اولوالعزم اور بلند حوصلہ سلطان ہے جس نے اپنی فتوحات سے دہلی کی سلطنت کو بہت وسیع کر دیا۔ اس نے رنتھنبور۔ منڈور۔ اچ اور گوالیر جیسے مضبوط قلعے فتح کیے۔ ان قلعوں کی تسخیر میں ہم یقین کرتے ہیں آلات حصار کشائی برابر استعمال ہوئے ہیں۔ اگرچہ مورخوں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ اس فرو گزاشت کی تلافی عہد شمسی کی ایک نادر تالیف سے ہوتی ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

کتاب آداب الحرب و الشجاعت

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ شمس الدین کے عہد میں کتاب آداب الحرب والشجاعت ہندوستان میں تالیف ہوئی ہے۔ اس کے مصنف شریف محمد ابن منصور ابن سعید ملقب بہ مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر ہیں۔ ان کی ایک اور تالیف سلسلۃ الانساب کا دیباچہ سر ڈینی سن راس نے بنام تاریخ فخر الدین مبارک شاہ طبع کر دیا ہے۔ ان کا زمانہ آخری دور سلاطین غزنہ سے لے کر التتمش کے عہد تک محیط ہے۔ ان کا اکثر وقت ہندوستان میں گزرا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر ہندوستان زا ہوں۔ کیونکہ ہندوستانی امور کے متعلق ان کے ہاں کافی اطلاع ملتی ہے۔ سندھ۔ ملتان۔ لاہور اور پشاور کے متعلق بھی ان کے ہاں اشارے موجود ہیں۔

آداب الحرب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ضوابط و آئین جنگ کے موضوع پر مرقوم ہوتی ہے۔ جس میں گھوڑوں کی شناخت عیوب و علت و معالجت سے لے کر ہر قسم کے اسلحہ، لشکر، عرض لشکر، نقل و حرکت، فرودگاہ، طلایہ و جاسوس۔ شبخون و کمین گاہ۔ میدان جنگ، صفوف جنگ، مقابلہ و مبارزت، طرق حرب۔ سپاہ حشری فضیلت جہاد، قواعد غنیمت، جزیہ و خراج، جنگ حصار، فتح و ظفر، حق بہا خطا و سزا، خدعت حرب وغیرہ وغیرہ مسائل پر تفصیل کے ساتھ رائے زنی کی گئی ہے۔ کتاب ایک سادہ مگر دلچسپ پیرایۂ بیان میں لکھی گئی ہے جس کو موقع بہ موقع تاریخی حکایات بالخصوص سلاطین

غزنہ کے قصوں کے ایرادنے اور بھی قابل قدر بنا دیا ہے۔

سوار سوار کے واسطے مصنف گویا ہے کہ اس کا ہاتھ ہر قسم کے ہتھیار پر صاف ہونا چاہیے۔ یعنی شمشیر۔ نیزہ۔ عمود، تیر و کمان۔ ناچخ وغیرہ۔ اس کی پوشش میں جوشن۔ خود۔ خفتان۔ زرہ بغلطاق۔ زرہین وآہنین اور ساعدین وساقین ہوں لشکر میں علامت یعنی پرول ضروری ہے۔ کوچ کے وقت طبل یا بوق کی پہلی آواز پر سوار کو ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ دوسری آواز پر گھوڑا زین کرکے اور ہتھیار باندھ کر تیار رہے۔ اور تیسری آواز پر سوار ہو جائے۔ کہتا ہے کہ سپاہی کو چوگان بازی۔ نال (پتھر) اٹھانا۔ کشتی اور زور آزمائی کرنا۔ جنگ مشت یعنی بوکسنگ۔ گھونسے بازی، فلاخن چلانا۔ نت بازی (پٹہ بازی)، چکر اندازی اور کمند کا استعمال جاننا ضروری ہے۔ جب ہتھیار استعمال کرنے سے تھک جائے۔ تب کشتی لڑے۔ اگر حریف کشتی میں بھی مغلوب نہ ہو۔ جنگ مشت یعنی گھونسے بازی شروع کرے اور چوٹ جسم کے نازک حصوں پر لگائے تاکہ اس کی ہلاکت یقینی ہو۔ فلاخن کے متعلق اس کی رائے ہے کہ اگرچہ یہ پہاڑیوں اور دریائیوں کا ہتھیار ہے لیکن اگر اس میں پوری پوری مشق بہم پہنچائی جائے تو دشمن کو حلیہ ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ پتھر کنپٹی یا سینہ و دل پر لگے۔ انسان اگر اس فن میں مہارت پیدا کرلے تو کبھی اس کا نشانہ خطا نہیں کر سکتا اور نہ کوئی شخص اس کے مقابل ٹھہر سکتا ہے۔ رات کے وقت آواز پر اس کا نشانہ مارا جا سکتا ہے۔ فلاخن خود اور جوشن کو بھی توڑ دیتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو آخر حضرت داؤد کا

ہتھیار ہی۔

چکر چکر کی نسبت کہتا ہی کہ بہ ظاہر کھیل معلوم ہوتا ہی مگر جب کوئی اس کے چلانے میں کمال پیدا کرلیتا ہی۔ قادر انداز ہوجاتا ہی اور فاصلے سے انسان کی گردن اُڑا سکتا ہی۔ چکر گول فولاد کا آئینے کے برابر ایک ٹکڑا ہوتا ہی۔ اس کے وسط میں ایک سوراخ ہوتا ہی جس میں ہاتھ اور بازو چلا جاتا ہی۔ بیرونی حصہ تلوار کی دھار کی طرح تیز ہوتا ہی۔ پھینکتے وقت سوراخ کو گرفت میں رکھتے ہیں جب بلندی سے نیچے آتا ہی۔ ہر چیز کاٹ ڈالتا ہی۔ اگر دشمن غافل ہو۔ خواہ کسی سمت سے چلایا جائے۔ گردن اُڑا دے گا۔ ہماری راے میں چک یا چکر خالص ہندوستانی پیداوار ہی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہی۔ ان ایام میں اس کی سودمندی دیکھ کر غالباً مسلمانوں نے اختیار کرلیا ہی۔ فی زمانہ صرف سکھوں میں رائج ہی۔

تیر تیروں کے سلسلے میں کہتا ہی کہ مختلف مواقع کے لیے مختلف تیروں اور پیکانوں کی حاجت ہی۔ زرہ کے لیے پیکان ماہی پشت اور غلولہ ہو۔ یہی پیکان جوشن کے واسطے کام دے گا۔ متفرق ڈھالوں مثلاً سپر چوبیں۔ سپر شوشک، سپر نے نیزہ، سپر تیج سپر کرگ اور سپر خدنگ کے لیے پیکان مودودی لازمی ہی اور تیر پرتابی۔ حصار کے واسطے پیکان غلولہ و ماہی پشت و سہ سو۔ تیر خفتان و بغلطاق و برگستوان جاگی کے لیے پیکان بیلک۔ بیا ناخی و برگ بید و تتماجی و بط پاے اور برگستوان آہنیں کے حق میں تیر خدنگ یا کلک۔

کمان | کمانوں کی کئی قسمیں شمار کی ہیں یعنی چاچی ، خوارزمی ، پروانچی غزنیچی ، لاہوری ، کروری ، ہندوی ، کوہی وغیرہ ۔ کمان چاچی بہت سخت ہوتی ہے اور ماوراء النہر میں رائج ہے ۔ خوارزمی کا خانہ چھوٹا اور گوشے دراز ہوتے ہیں اور تانت گھوڑے کی کھال کی جس کو بغیر بٹے باندھتے ہیں ۔ یہ تانت موٹی ہوتی ہے ۔ اسی طرح خدنگ بھی موٹا ہوتا ہے مگر پھل باریک ۔ اس سے زخم اچھا نہیں آتا ۔ اور تیر بھی لرزش کے ساتھ جاتا ہے ۔ پروانچی ۔ غزنیچی ۔ لاہوری اور کروری کمانیں تیر انداز پسند کرتے ہیں ۔ کمان کوہی پہاڑی علاقوں کے علاوہ سیری انباران اور بھرو چ میں مستعمل ہے ۔ پہاڑی بکروں اور شکاری جانوروں کے سینگوں کی بنتی ہے ۔ لکڑی بالکل نہیں لگاتے ۔ دیکھنے میں خوش آیند ہوتی ہے ۔ تانت بھی بانس کی چھال کی ہوتی ہے ۔ اس سے تیر زیادہ فاصلے پر نہیں جاتا ۔ لیکن قریب سے کاری زخم لگتا ہے ۔ ہندی تیر اکثر شاخ دار ہوتا ہے ۔ جب وہ کسی کے لگتا ہے اور پھل جسم میں گھس جاتا ہے ۔ شاخوں کی وجہ سے اس کا نکالنا بڑی زحمت کا موجب ہوتا ہے ۔ طرہ یہ کہ پھل زہردار ہوتا ہے ۔ پہاڑیوں کا پیکان ہڈی کا ہوتا ہے ۔ یہ لوگ مردہ گائے بھینس اور گدھے کی پنڈلی کی ہڈی لے کر گدھے کے پیشاب اور گندی نجاست گاہوں میں ڈال دیتے ہیں ۔ یہ یاد رہے کہ ہر روغنی ہڈی زہر دار ہوتی ہے ۔ غرض ایک مدت تک پڑا رکھنے کے بعد اس کے نوک دار پیکان تراشے جاتے ہیں اور بیچ میں بٹھا دیتے ہیں (دور کرہ نہند) جب چلانے لگتے ہیں اس کا سرا ایسے موقعے سے لگاتے ہیں کہ اس سے کوئی ٹکڑا جدا

ہو سکے۔ جب یہ پیکان کسی کے لگتا ہے یا اس کا ریزہ گوشت میں رہ جاتا ہے۔ سانپ کے زہر کا سا خواص رکھتا ہے۔ گھاو چیر کر اس کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ خواہ تل کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ بعض نبات ہوتی ہے جسے جری (جڑی) کہتے ہیں۔ اگر وہ میسر ہو اور لگائی جائے تو آدمی جلد اچھا ہو جاتا ہے۔ مگر آئے سال اسی موسم میں جب تیر لگا تھا زخم آلا ہو جاتا ہے اور بہت دکھ بھگتنا پڑتا ہے۔ زخم کھانے کے وقت اگر چھاچھ، یا لہسن کھلا دیا جائے تو موت یقینی ہے۔ جڑی کے ذریعے سے علاج اسی وقت تک ممکن ہے جب تک مریض کے دانت اور ہڈی کالے نہ پڑ جائیں۔ اگر ان میں سیاہی دوڑ گئی تو پھر جان بری کی امید نہیں، اس پیکان کا نام بدھانی ہے۔

ماوراء النہر، خراسان اور عراق میں اکثر و بیشتر تیر خدنگ و تیر بید رائج ہیں۔ تیر خدنگ زیادہ فاصلے پر نہیں جاتا۔ البتہ تیر بید اپنی سبکی کی بنا پر سیدھا جاتا ہے۔ اگر زور کا زخم لگے تو تیر ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر تیر کلک سب سے ہلکا ہوتا ہے اور کاری زخم لگاتا ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ تیر پکا اور جوش دیا ہوا ہو بلکہ قالب میں دبایا اور بل نکالا ہوا۔ تیر انداز اگر ماہر ہو۔ کمان بلند ہو اور شست بہرام بھی جانتا ہو تو اس کا تیر لوہے کے بیلچے اور فولادی خود کے بھی پار ہو جائے گا۔

تلوار کی بے شمار اقسام ہیں۔ مثلاً چینی، روسی، خزری

تلوار۔ رومی، فرنگی، یمانی، سلیمانی، شامی، علائی، ہندی اور کشمیری۔ ان میں سے مصنف تیغ ہندی کو سب سے بہتر مانتا ہے

جو کاٹ اور جوہر کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ ہے، اس کی کئی قسمیں ہیں
پرالک، ترادتہ، روہنیا، مقبر، مان گوہر اور پرمکس جسے موج دریا
بھی کہتے ہیں اور یہی بہتر مانی گئی ہے۔ یہ تلوار بادشاہوں کے ہاں
بھی ایک سے زیادہ نہیں ہوتی بعض اور اقسام بھی ہیں۔ یعنی باحری، سورمان

لہ (حاشیہ صفحہ ۳۵۱) ہندی تلواروں کی اقسام پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس پر کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر للبیرونی (طبع حیدرآباد ۱۳۵۵ھ) کی بعض عبارتوں سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب میں ایک باب "فی ذکر الحدید" ہے اس میں ص۲۵۴ پر بیرونی کہتا ہے کہ ہندوستانیوں سے بڑھ کر کوئی قوم جواہرات کے اقسام اور اسمار سے واقف نہیں ہے۔ آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"ولا باس ان نذکر ما عرفناہ من جھۃ ذوی البصر بجواھر السیوف مستفادۃ من الھنود، واشرف انواعہ واسیونہا یسمی پلارک۔ ومنہ سیوفھم النفیسۃ وخناجرھم الثمینۃ ویزعمون ان حدیدہ یسبک من رمل احمر فی نواحی کنوج یذوبون بالتنکار والبلوری فان دقیقہ لا یعلم الا الصاغۃ وھو ماء ھنالک ینعقد تنکارا والغلبۃ فی ھذا الجوھر الا بیض من لونیہ علی اسودھما ونوع منہ یسمی روھنیا یطبع بالمولتان من البیضات الھروتیۃ ونوع یسمی مون یضرب ایضاً بالمولتان من تلک البیضات ..... ونوع یسمی باخوی (نسخہ باحری) اس کے بعد باخری کی تین قسموں کو گنا ہے اور لکھا ہے وثالث الالوات باخری کل سیف لا جوھر فیہ وھذا الاسم یطلق علیہ من غیر صفۃ، ونوع یسمی مجلیا ویشبہ باخری الا انہ یتفق فیہ صور حیوانات واشجار وغیرھا۔"

پس 'پرالک' بلاشبہ 'پلارک' ہی کی ایک صورت ہے۔ 'روہن' اور 'روہنیا' نوادر کہتے ہیں۔ 'مان'، ممکن ہے وہی ہو جس کو بیرونی 'مون' کہتا ہے۔ مون بقول پروفیسر کرنکو ہندی میں ٹھوس کے معنوں میں ہے۔ 'مجلیا' اور 'موج دریا' میں کچھ علاقہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ باخری یا باحری بیرونی کے نسخوں میں اس طرح ضبط نہیں ہوا کہ شک باقی نہ رہے۔ آداب الحرب میں یہ لفظ باحری ہے۔ (محمد شفیع پرنسپل)

تورمان، پرالک، ترادتہ، روہنیا اور موج دریا ہندوستان[۱] کے سوا کہیں نہیں ملتیں نہ ان کے کاٹ کو دوسری تلواریں پہنچتیں کیونکہ یہ تلواریں خشک ہیں اور باقی تلواریں چرب ہیں۔ خراسان و عراق کی تلواریں اکثر باحری قسم کی ہیں۔ عرب جوہر دار نہیں ہوتیں اور صدمہ پہنچنے اور مارنے کی حالت میں کم ٹوٹتی ہیں۔

ہندوستان میں ایک اور قسم کی تلوار ہوتی ہے جسے نباہ کہتے ہیں۔ وہ نرم لوہے، تانبے اور چاندی کی ملاوٹ سے بنتی ہے۔ چاندی کی وجہ سے اس کے جوہر چمکیلے ہوتے ہیں۔ اس تلوار کا گھاؤ کم بھرتا ہے۔ پرالک ترادتہ مان گوہر برگس اور مقبر سلاطین کی کمر اور رکاب کی تلواریں بننے کے قابل ہیں۔ سورمان اور تورمان افغانوں میں رائج ہیں۔ ہندوستان میں دریائے سندھ پر کرور کے قریب ایک قلعہ ہے جو کورج کہلاتا ہے۔ وہاں کے لوہار بڑے استاد ہیں ان کا تلوار بنانے کا یہ دستور ہے کہ فولاد کے دو ٹکڑے لے کر انھیں خوب گرم کر لیتے ہیں پھر ایک کو سیدھی طرف سے دوسرے کو الٹی طرف سے گرم کرتے ہیں اور مٹی میں خام کر کے بھٹی میں رکھ کر ایک دن رات آگ دیتے ہیں۔ دونوں ٹکڑے گھل کر ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہیں اب مٹی سے نکال کر تلوار بناتے ہیں اور صیقل دے کر ' دارو ' میں بجھا لیتے ہیں۔ اس کے جوہر کھجور کے پتوں کی طرح نکل آتے ہیں اور نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ سارے رانا اور ٹھاکر (ٹھکر)، اور سردار ہاتھوں ہاتھ اس کو

---

[۱] لیکن اسدی اپنے گرشاسپ نامے میں جو ۴۵۸ھ میں تالیف ہوتا ہے کہتا ہے۔

ازاں آہن لعل گون تیغ چار ہم از روہنی دم پرالک ہزار

لے جاتے ہیں۔ اس تلوار کا زخم گہرا آتا ہے۔

قلاجوری قلاجوری، ترکوں کا ہتھیار ہے۔ جو لوگ نیزے سے اور تلوار سے لمبے ہتھیار کے ساتھ جنگ کرنے کے عادی ہیں ان کے واسطے موزوں ہے۔ اسے ٹیڑھا یوں بنایا جاتا ہے کہ زخم چوڑا بھی آئے۔ اس کجی سے گھاؤ گہرا اور کٹیلا لگتا ہے۔ اگر نیزہ کام نہ دے اس حربے سے نیزہ اور تلوار کا کام لیا جا سکتا ہے۔

ناچخ ناچخ، شاہی حربہ ہے۔ دوست اور دشمن دونوں کے کام کا ہے۔ دوست کے لیے مہرہ ناچخ اور دشمن کے لیے ناچخ کا سر جو تلوار کی طرح کام کرتا ہے۔

دشنہ دشنہ، عیاروں، جاں بازوں اور چوروں کا ہتھیار ہے۔

کتارہ کتارہ (کٹار)، ہندوؤں، شہدوں اور غداروں کا۔

شل (سیل) شل (سیل) وژوبین ہندوؤں اور افغانوں کا آلہ ہے۔ جو لوگ تلوار اور شل وژوبین ساتھ رکھتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں سیل اور ژوبین کارِبرآری نہیں کرتے تلوار سے کام لیتے ہیں۔

پیل کش پیل کش (نیم نیزہ)، پیادوں کے حربے ہیں اور ان لوگوں کے جو سپر جج (ججھ) اور سپر گردہ رکھتے ہوں اور قلعوں کے دروازوں پر متعین ہوں۔

نیزہ اور خشت اور دورباش شاہی محافظوں (جانداروں) کے ہتھیار ہیں جو بادشاہ کی محافظت پر مقرر ہوتے ہیں اور دشمنوں سے بچاتے ہیں۔

نیزہ نیزہ، ترکوں اور عربوں کا ہتھیار اور غوری ہتھیار ہی کہ ہاتھ میں لیتے ہی کام دے سکتا ہی۔ برگستوان پوش سواروں کے کام کا ہی۔ بحرین میں خطا نام ایک گاؤں ہی۔ نیزہ خطی اس کی طرف منسوب ہی۔ عراق و خراسان میں بید کا نیزہ بنتا ہی جو سبک ہونے کی وجہ سے سواری اور حلقہ ربائی کے واسطے مناسب ہی۔ لڑائی میں ہتھیار جتنا ہلکا ہوگا اتنا ہی اچھا کام دے گا۔ اس نیزے سے زخم تو خاصا آئے گا۔ مگر آدمی کو زین سے اٹھا لینے کے کام کا نہیں۔ ٹوٹ جاتا ہی۔ ہندوستان کے بانس کے نیزے کو کوئی نیزہ نہیں پہنچتا۔ نر بانس جو ٹھوس ہوتا ہی مطلب کا نہیں۔ لوچ دار اور بھاری ہوتا ہی اور سوار کو پریشانی اٹھانی پڑتی ہی۔ مادہ بانس جو پولا اور ہلکا ہو بڑے کام کا ہی کیونکہ اس میں لوچ مطلق نہیں ہوتا سوار نیزے بازی کے فن میں اگر طاق ہی اور جنگوں کے تجربے کر چکا ہی اس کے لیے سوار کو زین سے اور پیادے کو زمین سے اٹھا لینا کچھ مشکل نہیں۔

اس کا ملال ہی اگر کسی کے پاس تمام ہتھیار ہیں اور تلوار موجود نہیں تو وہ شخص نیم مسلح ہی۔ اگر تلوار پاس ہی اور باقی اسلحہ نہیں تو کچھ ڈر نہیں۔

قلعہ کشائی قلعہ کشائی کے واسطے یہ چیزیں درکار ہیں:- زینہ، کھجور کے رسے، معمولی رسے، جنگ کے رسے آنکڑے والے، خرک، مترس، دہ مردہ، منجنیق، عرادہ گردان عرادہ خفتہ، دیوار کن (سابل؟) آتش آہنیں، زنجیر، کدال نیزہ مردگیر، سپر پیچ۔ تبرہ دندانے دار، پھڑیں، ستون وغیرہ اور

محصورین کے لیے ان اشخاص اور اشیا کی ضرورت ہے: - دانشمند مؤذن، طبیب، منجم، باورچی، کمان کی تانت بنانے والا (زہ تاب) تیر گر، کمان گر، بڑھئی، زرہ ساز، زین ساز، لوہار، چیلا نگر (لوہے کے چھوٹے اوزار: چاقو، چھری، قینچی وغیرہ بنانے والا) چرخ گر (صیقل گر) جراح، حجام، درزی، دھنیا، جولاہا، بوزہ فروش، کھا دھوبی، نعلبند، نمدگر، موی تاب، غسال، گورکن، حلال خور۔ ان کے علاوہ طبل علم، نقارہ ڈھول، کاسہ زن (نقارچی) ترم (بوق) جھانجھ طبل باز، ڈھول والا، ڈھولکیا، جگنبی، چوبک زن (چوبکی) چوب یا ڈنکا لگانے والا اور تیر ناوک، تیر غدرک، تیر ملتمک، تیر جوال دوز تیر دانگ سنگ و نیم دانگ سنگ، کمان، زنبورک (نوعی از پیکان سر تیز) نیم چرخ، چرخ، کشکنجیر، منجنیق، عرادہ گرداں (عرادہ) خفتہ منجنیق کے گولے، سنگ دست اور سنگ فلاخن علیٰ ہذا، آٹا گیہوں، جو، لکڑی، چراغ کا تیل، پلیتہ، مشعل، دیوٹ، گوشت سکھایا ہوا گوشت (قدید) سری، پائے اور بے شمار لکڑی اور تیروں کے سرکنڈے اور لوہے کی بڑی تعداد ہونی چاہیے" اور منجہاے دولابی (مالہ وانداوہ؟) دیوار کن (ساباط) گائے بھینس کا چمڑا اور زنجیریں جن کے سرے پر کانٹا یا آنکڑا لگا ہو (زنجیرہا سرکژک) کہ لکڑی اور سرکنڈے کے گٹھے ان میں باندھ سکیں اور خرک پر ڈال دیں تاکہ خرک اور خرک کے آدمی جل جائیں اور ریت اور پتھر کے چھکے اور بھاری سلیں۔ موش ذنبہا؟ درزنی پتھر اور چکی کے پاٹ فصیل اور کنگروں پر رکھیں۔ لوہے کی میخیں

جن کے دونوں سرے تیز ہوں۔ آدھ آدھ سیر اور سیر سیر بھر کی انداً ہر طرح کے مسالے (حوائج)، جن کی ضرورت باورچی خانے میں ہوتی ہے مثلاً کھٹائی، شیرینی، ٹھنڈائی (بروودھا) اچار اور ادویہ اور کمان کی تانت کے واسطے گاسے کے پٹھے اور انگشتانے۔ گینڈے کی ڈھالیں (سپر گرگ) اور سیر شوشک۔ آر (خنجہ؟) خدنگ منجنیق کی رسیاں اور شہر ڈھونے کے واسطے ٹوکرے اور کھانچے فلاخن اور شبیلوا؟ اور نبیر؟ (انبر: سنڈاسی) اور سب قسم کے موسیقی ساز اور مطرب کہ پہرے چوکی کے واسطے گائیں اور جیوشن، خود، خفتان بغلطاق اور برگستوان۔ گدر (سلاح جنگ) لوہے کے بڑے کفگیر (کفلیز ہا) جلتے تیل کے واسطے کہ ان کے ذریعے سے تیل گرایا جائے کچی اینٹیں ودیل کج ونے دکرہ؟ اور ایسی چیزیں کہ اگر کہیں شگاف (خلل؟) پڑ جائے تو فوراً درست کرا دیا جائے۔ وتختھا برکال کشتہ؟ اور شہتیر (خر تیر ہا)۔

فخر مدبر اس کے بعد محصورین کو عام ہدایات دیتا ہے کہ جب غنیم حصار کے قریب آئے اس کے ساتھ سخت کلامی یا بیہودہ گفتگو نہ کی جائے۔ اور نہ گالیاں دیں۔ قلعہ خواہ کتنا ہی ناقابل تسخیر کیوں نہ ہو، پوری پوری نگرانی رکھیں اور چوکس رہیں، راتیں جاگ کر کاٹیں۔ فصیل اور شگافوں کی خبر رکھیں، دربانوں پر بھروسا نہ کریں۔ رات کے وقت قلعے کی کنجیاں اپنے قبضے میں رکھیں اور ہر رات پہرے داروں کو ایک برج سے دوسرے برج میں بدلتے رہیں ممکن ہے کہ بیرونیوں نے ان کے ساتھ

ساز باز کرلیا ہو۔ کڑی نگرانی کریں کہ دشمن کو دیوار کھودنے یا نقب لگانے کا موقع نہ مل سکے۔ رات میں کئی بار قلعے کے دروازوں کو جاکر بہ چشم خود دیکھا جائے۔ دربانوں اور سپاہیوں کے ساتھ جن کا پہرہ دروازوں پر لگا ہو۔ مہربانی سے پیش آئیں اور انعام واکرام کا امیدوار کریں۔ منجنیق اور عرّادہ اندازوں کو خلعت اور صلہ دیتے رہیں۔ ناوک اور جوال دوز فضول مصرف میں ضائع نہ کریں اور لڑائی کے وقت کام میں لائیں۔ اہل قلعہ میں سے کسی نے باہر والوں کو تیر وناوک سے ہلاک کیا ہو تو خلعت وانعام دیں۔ اگر دروازے پر لڑائی ہو تو فصیل وخندق سے باہر نہ جائیں اور دروازہ خالی نہ چھوڑیں، دروازوں پر لڑائی کے دن دل چلے اور بہادر سپاہیوں کو مقرر کریں اور ہر طرح کا ہتھیار یعنی تیروکمان۔ نیزہ۔ نیم نیزہ تُک (ژدپین) پیل کشش ! اور گردہ ؟ (گرزہ۔ گرز) سپر چج اور سپر قواخ (فراخ ؟) وغیرہ مہیّا رکھیں۔ تیراندازوں، ناوک اندازوں اور نفط اندازوں کو ہمیشہ قلعے کے دروازوں پر مستعد رہنے دیں۔ دن رات جنگ کی دھن میں لگے رہیں حتیٰ کہ خدا یہ بلا سر سے ٹال دے۔

حصار اور محاصرین کے تعلق میں جو کچھ اوپر مذکور ہوا ہے کئی موقعوں پر اس میں مَیں نے علامت استفہامیہ سے کام لیا ہے ان اشکال کے حل کرنے سے میں عاجز ہوں۔ اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ مصنف کی عین عبارت بھی یہاں درج کردوں تاکہ قارئین کرام مصنف کا اصل مفہوم معلوم کرسکیں۔

" و آنچه در حصار کشادن باید نیست ۔ نردبان ولیفن درلیمانی وکنب سرحنکال وخرک وبهترس (مترس ؟) وده مرده ومنجنیق وعرّاده اروان (روان ؟) وعرّادهٔ خفته و دیوار کن و آتش کش آهنیں وبند و کلند ونیزه مردگیر وسپر نج کرده ونیزهٔ سر دندانه دار وتختهار زیادتی داستونها وآنچه درو نیان را باید :- دانشمند ومؤذن وطبیب ومنجم وطبّاخ ود زه تاب ، وتیرگر ، وکمان گر ، ودرودگر ، وزرّاد وسرّاج وآهنگر وجیلاگر وچرخ گر ، وجرّاح ، وحجّام ، ودرزی ، وپنبه زن ، وجولاها ، دنقاعی وکلال ، وگاذر ، ونعل بند ، ونمدگر ، وموی تاب وغسّال ، وحفّار ، وکنّاس ، وودیگر طبل ، وعلم ، ودمامه ، ودہل ، وکاسه زن ، وبوق ، وصنج ، وطبل باز ، ودمامه ای ، ودہل زن ، وبوقی ، وچوبک زن وودیگر تیر کالک ، وتیر ناوک ، وغدرک وتخک ، وجوال دوز ، و دانگ سنگ ، وکمان ، وزنبورک ، ونیم چرخ ، وچرخ وکشک انجیر ، ومنجنیق ، وعرّادهٔ گردان وخفته ، وسنگ منجنیق ، وسنگ دست وفلاخن ، وودیگر آرد ، وگندم ، وجو ، وودیگر چوب ، دیگر از سر طفیے بسیار دروغن چراغ ، وپلیته ، ومشعله ، وچراغ دانها زیادتے ، وگوشت و قدید ، وسر گوسپند ، وپاچه قدید ، هیزم بسیار ، ونے بسیار ، که اگر تیر نماند تیر سازند ، وآهن بسیار ، وسنجهاے ودولابی ، ودیوارکن ، وخام گاؤ وگاومیش ، وزنجیرها سر کژک ، اگر کژک نهند وتتواره نے تابنیز را دراں سخت کنند ، وبرخرک فرو هلند تا خرک وآنکس که در زیر خرک

له ترجیح داده گفته آمال خلق را　　　از دانگ سنگ خرچ تو معیار روزگار
(صفحہ کلیات انوری نول کشور)

باشد بہ سوزد ۔ وریگ (و) تختہا سنگ ، وتختہا گران ، ومرش ذنبہا ،
وسنگہا گران ، کہ سر دیوار وکنگرہا نہند وآسیا سنگہا ، وحلبدیہا از بہا ؟
ومیخ ہار آہنیں ، ہر دو سر تیز در قیاس نیم من ویک من ، واز حوائج
آنچ بمطبخ بکار شود از ہر جنس از ترشی ، وشیرینی ، وبرودہا وآچارہا ، و
ادویہ ، ودیگر پے گاو بجہت کمان وزہ کمان ، وانگشتوانہ بسیار ،
وسپرگرگ ، وسوشاک ، وخفچہ ، وخدنگ ، ورشتہار زیادتی از جہت
منجلیق ، وگوارہ ، وکہارہ ، از جہت سنگ کشیدن ۔ وفلاخن ، وشبلواء؟
ونیر ؟ وحلبہ سازہا ، ومطربان کہ از جہت پاس داشتن سماع کنند
ودیگر جوشن ، وخود ، وخفتان ، وبغلطاق ، وبرگستوان وگزرہ ......
واز جہت روغن کفلیرہا ، آہنیں بزرگ بہ سبب روغن جوشیدہ کہ فرود
ریزد ، وخشت خام بسیار واہل گنج دسے وکرہ وچیزے کہ اگرجائے
فلک (کذا) افتد درحال راست کنند وسخت ہا بر کال کشتہ وخر تیرا۔
وچوں خصمے نزدیک حصار آید البتہ یاوہ نگویند ودشنام نہ زنند
وخدائے را بسیار یاد کنند ودر کار ہیچ تقصیر نہ کنند وغافل نہ باشند
اگرچہ حصار نیک حصین باشد بامن وتیمار بہتر دارند وہمہ شب بیدار
باشند وپیوستہ دیوارہا ودرختہا (ملاحظہ ؟) بکنند وبر دربانان اعتماد
نہ کنند وکلید قلعہ بستانند وشبہا بخود نگاہ دارند ، وہر شب پاسبانان
را از برجے بہ برجے دیگر فرستند کہ شاید از بیروں بر ایشاں راستہ
نہادہ باشند ودرپاس داشتن غفلت نہ کنند تا ایشاں از دیوار
کندن ونقب کردن نہ پردازند ، وہر شب چند بار بر درہا قلعہ
بروند واحتیاط کنند ودربانان وسرہنگان کہ بر در باشند ملاحظہ نمائید

و امیدوار تربیت و انعام کنند و منجنیق و عرّاده اندازاں را ، تشریف وصلت دہند و ناوک و جوال دوز ؟ بیہودہ خرج نہ کنند و بوقت ہنگام جنگ خرج کنند و ہر کہ از درون کسے را از بیرونیاں تیرو ناوک زند تشریف و صلت دہند و اگر جنگ بیرون در باشد از پس فصیل و خندق بیرون نہ روند و در خالی رہا نہ کنند و بر در سر ہنگاں و نقیباں جلد مردآں روز جنگ نصب کنند و درہا را بہ سلاح از تیر و کمان و نیزہ و نیم نیزہ و تک و پیل کش و گردہ و سپر چچ و سپر فراخ (فراخ ؟) آراستہ دارند و تیر اندازان و ناوک اندازاں را و نفط اندازان پیوستہ بر سر درہا قلعہ مرتب دارند و شب و روز دل در کار جنگ مرتب دارند تا خدائے آں شر دفع گرداند۔ (صفحہ ۱۷۹ و صفحہ ۱۸۰)

عہد شمسی کے اس مفصل بیان سے جو آداب الحرب کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں آتشی آلات (از قسم توپ و بندوق) کا استعمال ہندوستان میں نا معلوم تھا۔

جلال الدین خلجی جب جلال الدین خلجی قلعۂ رنتھنبور کی تسخیر کی نیت سے جاتا ہے اس کے استحکامات دیکھ کر یہ رائے قائم کرتا ہے، جسے ہم برنی کے الفاظ میں درج کرتے ہیں۔

"دیدم کہ ایں حصار دست نمی آید تا چندیں مسلمانان در گرفتن ایں حصار کشتہ نمی شوند و بہ ثمن دہ ہم چنیں حصار خود را فدا نمی کنند و در تہ سابا طہا و بر آوردن پاشیب و بستن گرگچ و بر رفتن حصار کشتہ نمی شوند" (صفحہ ۲۱۳ تاریخ فیروز شاہی)

سلطان ممدوح محاصرہ ترک کرکے واپس لوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کا جانشین علاءالدین بالکل مختلف طبیعت اور ارادے کا انسان تھا۔ وہ اپنے ایام سلطنت میں ہندوستان کے اکثر نامی قلعے فتح کرتا ہے۔ جن میں رنتھنبور۔ چتوڑ۔ دھار۔ سیوانہ۔ جالور اور وارنگل قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان میں اگرچہ تقریباً انھی آلات سے کام لیا جا رہا ہے جو اور ممالک میں عموماً رائج ہیں اور حصار گیری کا تقریباً وہی طریقہ ہے لیکن یہاں بعض اشیا کے نام مختلف ملتے ہیں۔ مثلاً امیر خسرو کی تالیف خزائن الفتوح میں منجنیق کے لیے عروس اور مغربی، بلجور کے لیے پاشیب اور سنگ کے لیے غضبان اور کردہ ہے۔ اس ملک میں قلعے کی دیواروں سے آگ پھینکنے کا جو طریقہ ہے دیگر ممالک میں کم نظر آتا ہے۔

علاءالدین خلجی و حصار رنتھنبور جب علاءالدین خلجی حصار رنتھنبور کو محصور کرتا ہے، اہل قلعہ نے تمام برجوں میں آگ جلا رکھی ہے۔ جوں ہی غنیم کا آدمی دیوار کے قریب جاتا ہے اس پر آگ ڈالی جاتی ہے، آگ کے ڈر سے محاصرین قلعے کی دیوار کے قریب نہیں پھٹک سکتے۔ ریت کی بوریوں سے وہ پاشیب تیار کرتے ہیں اس پر مغربی نصب کرکے سنگ باری شروع کر دیتے ہیں۔ رجب سے ماہ ذوالقعد تک محاصرہ جاری رہا۔ خزائن الفتوح میری اس اطلاع کی تنہا ماخذ ہے۔ اس کے بعض فقرے بحذف حشو و زوائد ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

"ہندوان زحلی در ہردہ برجے آتش برافروختند۔ چون اشتعال اطفار آں مہیا گشتہ بود۔ مسلمانان آب خویش نگاہ می داشتند خطہا بر خاک می کردند و پاشیب می بستند۔ چوں پاشیب از بلندی بہ برج مغربی حصار پیوست و مغربی ہائے سلطانی دربینی کوہسارہا خرطوم برآوردہ، ہر کردہ برسان گرد کوہی سوے آں قلعہ ملحد روان گشت۔ ہر روز نیک اختران اسلام دریایان پاشیب انجمن می شدند و جنگ سلطانی پیش می بردند دلاوران بہرام صولت در خیان آتشے سمندر دار می رفتند۔ عرادہائے درون آتشکا را سنگ انداز می کردند وغضبان ہائے سلطانی سنگ سارشان می کرد سنگ ہائے گران بر سر حصاریان مانند ژالہ می بارید"

(ص ۵۲-۵۴ خزائن الفتوح مسلم یونیورسٹی)

حصار تلنگ

حصار تلنگ کی تسخیر کے وقت بھی ہم یہی صورت حال مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس موقعے پر کٹ گھرہ اور ساباط و گرگج کا بھی ذکر آتا ہے۔ جب قلعے کا محاصرہ ہوتا ہے لشکر قلعے سے اس قدر فاصلے پر ہے کہ قلعے والوں کی آگ اور نفط سے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد ملک کافور شبخون سے محفوظ رہنے کے لیے لشکر کے گرد کٹ گھرہ (حصار چوبیں) تیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دوسرے دن منجنیقیں نصب ہوئیں اور ساباط اور گرگج یعنی دھس اور دمدمے مرتب ہوئے قلعے کے گرد جو پانی کی خندق تھی اس کو پاٹ دیا۔ اب ارادہ ہوا کہ ایسی چوڑی پاشیب تیار کی جائے جس پر سو آدمی صف باندھ کر چل سکیں۔ مگر ایسی

پاشیب کی تیاری کے واسطے بہت وقت درکار تھا - اس لیئے فیصلہ ہوا کہ پہلے ایک حملہ کر کے اہل قلعہ کی طاقت مدافعت کا اندازہ کر لیا جائے۔

(خزائن الفتوح صفحہ ۹۲-۱۰۲)

علاء الدین کڑے سے تخت نشینی کے واسطے دہلی آتے وقت روزانہ پانچ من سونے کے ہن ایک ہلکی منجنیق کے ذریعے سے لوگوں میں پھنکواتا تاکہ رعایا میں اس کو ہر دل عزیزی حاصل ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں اردو کی ضرب المثل "ہن برسنا" غالبًا اسی واقعے پر مبنی ہی۔ برنی کا بیان ہی:-

"دراں چہ سلطان علاء الدین جانب دہلی می آمد منجنیقی خورد سبک و نقلی ساختہ بودند کہ ہر روز پنج من اخترِ زر در ہر منزلے کہ سراپردہ سلطان علاء الدین برمی آمد بہ وقت نزول در پیش دہلیز در منجنیق می نہادند و بر نظارگیان پرتاب می کردند و خلق اطراف گرد می آمد و آں اختر ہا می چیدند"۔ (صفحہ ۲۴۳ تاریخ فیروز شاہی)

علاء الدین درآمد مغل کے انسداد کے لیے قدیم قلعوں کی مرمت کے ساتھ ساتھ پنجاب میں جدید قلعوں کی تعمیر کا حکم دیتا ہی اور تجربہ کار افسروں کو قلع دار مقرر کرتا ہی اور ہدایت کرتا ہی کہ قلعوں کے واسطے منجنیق اور عرّادے کثیر مقدار میں بنائے جائیں اور ہوشیار عملہ ان کے لیے ملازم رکھیں۔ چنانچہ برنی کا قول ہی:-

"فرمان داد تا در راہ آمد مغل کوتوالان معروف و ہوشیار نصب کردہ فرمود تا منجنیق و عرّادہ بسیار سازند و مفردان ہنرمند را جاگیر داسلحہ از ہر بابتہ موجود دارند"۔ (صفحہ ۳۰۲ تاریخ فیروز شاہی)

الغ خان وحصار ارنگل جب الغ خاں یعنی سلطان محمد بزمان غیاث الدین ۶۲۳-۲۴ھ حصار ارنگل فتح کرنے جاتا ہے۔ اسباب قلعہ گیری میں مغربی اور عرّادوں کا پھر مذکور ملتا ہے۔ برنی کی عبارت ہے :-

"ولشکر باہتمام تمام درحصارگیری مشغول شد و در حصار گلین وحصار سنگین ارنگل جمعیت ہندوان بسیار گرد آمدہ بود و استعداد ہا درون بردہ از طرفین مغربی و عرّادہ درکار آمدہ و ہر روز لشکر را با درونیان جنگ ہائے سخت می شد" (صفحہ ۴۴۶ تاریخ فیروز شاہی)

اسی عہد میں جب ارنگل پر دوبارہ فوج کشی ہوئی قلعہ بالفاظ مصنف "بزخم تیر ناوک و سنگ مغربی" فتح ہوا۔

محمد بن تغلق غیاث الدین کے جانشین سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ بسبیل سیاحت ہندوستان آتا ہے۔ دہلی کی فصیل کے تذکرے میں لکھتا ہے :-

"شہر کی فصیل تمام دنیا میں بے نظیر ہے۔ اس کا عرض گیارہ ہاتھ ہے، اس میں کوٹھریاں اور مکانات بنے ہوئے ہیں، جن میں چوکیدار اور دروازوں کے محافظ رہتے ہیں اور غلے کے کھتے بھی جن کو انبار کہتے ہیں فصیل میں بنائے ہوئے ہیں، منجنیق اور لڑائی کے سامان (اور رعادات) بھی ان ہی گوداموں میں بھرے ہوئے ہیں۔"

(صفحہ ۲۹ سفر نامہ ابن بطوطہ۔ ترجمہ از محمد حسین۔ رفاہ عام پریس ۱۸۹۸ء)

یہی سیاح محمد بن تغلق کی سفر سے دارالسلطنت میں مراجعت کے بیان میں گویا ہے :-

"بعض دفعہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ہاتھیوں پر تین یا چار چھوٹی چھوٹی منجنیق (راعداہ) چڑھا دیتے ہیں اور ان کے ذریعے سے دینار اور درہم لوگوں کو پھینکتے ہیں اور یہ کھیر شہر کے دروازے سے شاہی محل کے دروازے تک ہوتی ہے۔" (صفحہ ایضاً سفرنامہ)

اسی محمد بن تغلق کے عہد میں جب تغلق خاں نے کوہگیر دکن کے قلعے کا محاصرہ کیا ہے۔ مولانا عصامی اس کا حال فتوح السلاطین میں یوں تحریر کرتا ہے:-

چو خان معظم دراں ذر رسید	یکے دائرہ گرد او برکشید
تو گوئی کہ برگرد البرز کوہ	زدہ خیمہ ایرانیاں با شکوہ
چو خان کرد ہر سو النگے تعین	گرفتہ بہر سو ہزبری زمین
برآورد ہر سو یکے منجنیق	بخوں می شدہ آں ذر بہرم غریق
بیک سو دوانید ثابات خاں	بداں تا برد لشکری را اماں
پستند گرگج بہ سرکوب کوہ	بر انساں کہ بدخواہ گردد ستوہ
دگر سو گرفتند نقبی نہاں	ہمی رفت لشکر بفرمان خاں
بہ شش ماہ بداں سپاہ گزیں	بہ پیرامن کوہ صحرا نشیں
دو سہ جائے آں کوہ بشگافتند	پئے جنگ ہر سو رہی یافتند

(صفحہ ۴۶۲ مرتبہ ڈاکٹر آغا مہدی حسین)

حصار بیدر | حصار بیدر کے محاصرے کے وقت یہی مصنف لکھتا ہے:

پس از ہفتہ لشکر آں جا رسید	علی شہ بہ حصن کتگھر کشید
ہماں روز پیرامن آں حصار	النگی گرفتند مردان کار

همی رفت خونی بہر صبح و شام — بزیر حصار از تن خاص و عام
بسی منجنیق از درون و برون — سری سوده بر گنبد نیلگون
ہمہ پلہ گبران ثابت کنان انہاؤ — کمر بستہ ہر شام و ہر بامداد
گروہی بسی بے خطا می زدند — بگوئی سر موی را می زدند
بسا دیدہ ہر روز باران تیر — برآمد بہر شب ز ہر سو نفیر
نباتی بر تنکہ از ہر طرف — شد از تیر ہر کنگرہ چوں ہدف
محاصر بدان حصن تا پنج ماہ — ہمی رفت خونی بہ بیگاہ و گاہ

(ص ۴۷ ایضاً)

گلبرگہ گلبرگہ کا محاصرہ یوں بیان ہوا ہے:-

بیک سوی دز منجنیقے نہاد — کہ سنگش بر آں روے گردوں فتاد
ہر آں سنگ کز پلہ او بجست — یکے برج از آن حصن سنگین شکست
دو سہ چار عرادہ برگرداد — چو کردہ سر آں لشکری جنگجو
سر ہر سے را بے خطا می زدند — بدان حصن سنگ بلا می زدند
ہماں قطب ملک شہ بخت مند — رسانید سر کنگرے را گزند
ز بیم خدنگش کہ می کرد خون — کم آورد کس سر ز کنگر برون

(ص ۵۴ ایضاً)

فیروز شاہ محمد بن تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ کے عہد میں بھی منجنیق اور عرادے حسب معمول استعمال میں آرہے ہیں چنانچہ شمس سراج عفیف نے لکھا ہے:-

" از ہر دو جانب عرادہ و منجنیق داشتہ با تیر و ناوک جنگ حصار پیش

گرفتہ" (صـ۱۵۱ تاریخ فیروز شاہی)

حسن بہمنی مؤرخ فرشتہ نے سلطان علاء الدین حسن بہمنی کے فرزند کے بیاہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ گلبرگے میں کئی موقعوں پر منجنیقیں قائم کر کے ان کے ذریعے سے مختلف میوے شہریوں پر بکھیرے گئے تھے چنانچہ اس کی عبارت ہے:-

"درحسن آباد گلبرگہ چند جا منجنیقہا نصب کردند و انواع تنقلات و حبوبات کہ متعارف ہندوستان است برآں گزاشتہ بر مردم شہر می باشیدند" (صـ۵ جلد اول تاریخ فرشتہ طبع نول کشور)

شرح سکندر نامہ مولانا نظام الدین شاگرد و مرید شیخ امان اللہ پانی پتی متوفی سنہ ۹۵۵ھ اپنی شرح سکندر نامے میں عرادہ وغیرہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:-

(۱) عروس (عرادہ نوعی) از منجنیق اند چنانچہ در عراب خانہ پادشاہ اسلام شاہ انواع کمانہا اند بعضے دو سیری گولہ و بعضے منی گولہ می اندازند آں چناں منجنیق کم اند ... " (۲) فرسنگ سنگ بزرگ و مدور کہ درکمان بزرگ رود و از منجنیق کلاں اندازند ..." (۳) در بلدۂ ستار گانو خواجہ احمد رومی استاد کمان دریں کار گولہ بکار بود و کمانی بنام شیر شاہ ساختہ"

تعجب نہیں اگر یہ آخری بیان توپ کا ہو۔

آتشبازی

امیر خسرو

ہندوستانی مصنفین میں امیر خسرو پہلے شخص ہیں جن کے ہاں آتشبازی کا ذکر آتا ہے۔ اگرچہ آتشبازی ان کے عہد سے قدیم ہے۔ جس طرح ہمارے زمانے میں بارود جس کو قدیم زمانے میں دارو کہا جاتا تھا آتشبازی کا جزو اعظم ہے۔ بارود کی دریافت سے قبل نفط اس کی جگہ استعمال میں آ رہی تھی جیسا کہ خسرو کے ایک قصیدے کی تشبیب سے جو جلال الدین فیروز شاہ ۶۸۹-۹۵ھ کی مدح میں ہے معلوم ہوتا ہے۔ قصیدے کے اشعار یہ ہیں :-

شب براتِ پری چہرہ یار نفط انداز　　بہ نفط ہر نفسے کرد سوزشِ من ساز
ہر آنچہ در دل بودہ است نفط دود شکر　　بہ ہر دمے کہ فرو خورد ازان لب دمساز
ز آب زرد مژہ نفط او ہمی کشتم　　ولے ز آہ من آتش ہمی گرفتہ است باز
ز آتشے کہ ز وا اندر وجود من کاغذ　　ز سینہ آہ ہوائی بہ چرخ رفتہ فراز
دے ار چہ چرب ہمی کرد ہر سو خستم　　چرخ فرود ہمی خورد بندہ زاں طناز
بسا کہ گشت دلم چوں فتیلہ گرداں　　بسوزد دلہا زاں حریفِ آتش باز
از و بلند پرید لعبتان زاں رو　　کہ یافتند ز ہر تار موش رشتہ دراز
مرا ز سینہ ہمی رفت جان و لیں می دید　　کہ زیر پوست ہمی داد طبل او آواز
نہ من یکے کہ ببازی ہزار خانہ بسوخت　　ز شعلہ بازی آں کودکان نفط انداز
شد از چراغ جہانے چو آتشیں دریا　　دوندہ کشتی چوبیں درو نشیب و فراز
بساخت خلق بہر خانہ کشتی چوبیا فتہ　　خبر ز دست چو دریائے شاہ بندہ نواز

چراغ خانۂ شاہی جلال دنیا و دیں — کہ آفتاب فلک را بنور اوست نیاز
ستارہ کوکبہ فیروز شاہ کاختر او — بسرِ غیب شد از نورِ رائے محرم راز

امیر خسرو نے اپنے شہر آشوب میں ذیل کی دو رباعیاں درصفت آتش باز لکھی ہیں :-

آتش بازم کہ آتش است آب رخش — سوز دل نظارگی از تاب رخش
از بس کہ رخ اوست فروزاں چوں ماہ — شب روز شود ز نور مہتاب رخش

ولہ

آتش بازم اگر بدانی ایں است — گل ریز بہار زندگانی ایں است
کردہ است چو آسمانیم سرگرداں — ہش دار بلائے آسمانی ایں است

ان اشعار میں بعض اقسام آتش بازی کے یہ نام ملتے ہیں۔ کشتی ہوائی۔ فتیلۂ گرداں۔ لعبت۔ چراغ۔ مہتاب۔ گلریز اور آسمانی جو سب کی سب نفط سے بنی ہیں۔ دارو (بارود) خسرو کے عہد میں ہندوستان میں رائج نہیں معلوم ہوتی۔ امیر بار بار الفاظ نفط اور نفط انداز استعمال کر رہے ہیں۔

شمس سراج عفیف آتش بازی کا ذکر شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں بھی آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ شب برات کے موقع پر آتش بازی کا خاص طور پر اہتمام کرواتا تھا۔ ہمارا مورخ لکھتا ہے :-

"در پانزدہم شب ماہ شعبان خسرو جہاں درون کوشک فیروزآباد ہوائی ہا گل ریز عنبر بیز می باخت۔ درین کار چوں تا چداران اہل تباہ کوشش می گماشت۔ چوں شب برات نزدیک رسیدے شب سیزدہم

وچہار دہم و پانزدہم بازیہائے بسیار موجود می گردانیدند و در کوشک زنول فیروزآباد برائے رہا کردن بازی شب برات چہار لنگ متعین می شد" (ص ۳۶۵)

تیر آتشیں ہم صاف طور پر نہیں کہہ سکتے کہ فیروز شاہ کے عہد میں بارود کا رواج آتش بازی میں ہو چلا تھا مگر بعض امور سے استدلال ہو سکتا ہے کہ اول تو اسی عہد میں ورنہ اس کے عنقریب بعد بارود سے کام لیا جا رہا ہے شمس سراج عفیف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فیروز شاہ شکار سے فارغ ہو کر پرہ شکنی کا حکم دیتا اس وقت پرے کے وسط سے ایک تیر آتشیں بطور علامت اختتام پرنڈہ چھوڑا جاتا اور نقارے شہنائیاں وغیرہ بجائی جاتیں تاکہ پرے کی فوج کو شکار کے ختم ہونے کی اطلاع مل جائے :-

"چوں خواستے کہ پرہ بشکنند و شکار باقی ماندہ را بگیرند بر حکم فرمان شہنشاہ روی زمین یک تیر آتشیں درمیان پرہ می گزاشتند۔ دہلہا یا شہنائیہا می نواختند" (ص ۳۲۵ تاریخ فیروز شاہی)

اب یہ تیر آتشیں کیا تھا۔ آیا کوئی گولہ تھا یا ہوائی بغیر تفصیل معلوم ہوئے نہیں کہا جا سکتا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ آتش بازی کی قسم کی کوئی چیز ہے جو غالباً رات کے وقت چھوڑی جاتی ہے اور آسمان میں پہنچ کر روشن ہو جاتی ہے۔ مولانا رکن الدین صاحب طرفۃ الفقہا کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ آتشیں تیر آلات جنگ سے ہے۔ باب الجہاد میں انھوں نے مختلف ہتھیاروں کا جو جہاد میں استعمال ہوتے ہیں ذکر کیا ہے۔ منجملہ اور اسلحہ کے تیر آتشیں اور تفنگ کا نام بھی لیا ہے چنانچہ

تیر و ژوبین و گرز انداز زند — جان ناپاک شان ہدف سازند
منجنیق و عرادہ آرایند — آتشیں تیر تیز بکشایند
سنگ ہا در فلاخن اندازند — باکمند و تفک بہ پروا زند

([illegible] ۷۷)

یہ آتشیں تیر جس کی مجاہدین کو ضرورت ہے یقیناً کوئی آلۂ جنگ ہے جس طرح کہ تفک ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ میدان جنگ میں اس چڑیں مارنے والے آلے تفک سے جس کا ذکر گزشتہ سطور میں آچکا ہے کیا کام لیا جا سکتا ہے یہاں بندوق کے معنے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اسی عہد میں داستان امیر حمزہ کی ایک جدید فارسی اشاعت ہندوستان میں تیار ہوئی ہے۔ اس تالیف میں کافی ہندی الفاظ اور محاورے آتے ہیں مثلاً تنگہ و جبتل۔ جوگی۔ دھکہ۔ چھپرا در جنگ (جھا) وغیرہ۔ یہ کتاب غالباً بنگالے میں لکھی گئی ہوگی۔ اس کے بعض جملے ملاحظہ ہوں:-

(۱) پس عمر تفک بکشید و غلولہ در دہان انداخت و بر چشم سوار آں چناں زد کہ یک چشم کور کرد۔ (۲) آتش شیشہ و غلولۂ تفنگ (۳) دست در شیشۂ نفط انداخت (۴) و عمر شیشۂ نفت زدی۔

ان مثالوں میں تفک اور تفنگ پر بندوق ہی کا گمان ہو سکتا ہے۔

رعد انداز و تخش افگن جب امیر تیمور ہندوستان آیا ہے اور دہلی میں سلطان ناصر الدین محمود سے جنگ کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے بادشاہ کی فوج میں ایسی جماعت موجود تھی جو آتش فشاں آلات سے مسلح تھی اور ہاتھیوں کے برابر

کھڑی تھی۔ تیمور کا مورخ نظام الدین شامی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:-

"صد و بیست زنجیر پیل جنگی چوں دریائے جوشان را بر خروشان آراستہ و تختہا بر پشت پیلان پیراستہ و رعد اندازان و تخش افگنان در جنب صف پیلان ایستادہ و بر ہر پیلے چند ناوک انداز نشستہ

(صفحہ ۱۹۰ ظفر نامہ)

اسی موقع کو شرف الدین یزدی اپنے ظفر نامے میں یوں بیان کرتے ہیں:-

"وعمدۂ استظہار ایشان پیلان کوہ پیکر بود کہ چوں دریائے خروشندہ از باد سیاست بجوش آمدہ ہمہ را بسلاح و تجیم مرتب داشتہ و بر دندانہا ستون کردار شان وشنہای زہردار استوار کردہ و بر پشت پشتہ مثال ہر یک از چوب تختہائے محوط محکم ساختہ و بر ہر تختی ازاں چند ناوک افگن و چرخ انداز در مکمن کمین نشستہ و تخش داران و رعد اندازان در پہلوی صف پیلان آمادۂ جدال و قتال ایستادہ" (جلد دوم صفحہ ۱)

یہ رعد انداز اور تخش افگن کون ہیں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ممکن ہے کہ بان یا حقہ پھینکنے والے ہوں یا بندوقچیوں کی کوئی جماعت ہو۔ رعد انداز اگرچہ بعد میں توپچیوں کے لیے استعمال ہوا ہے مگر اس وقت اس لفظ کو یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے۔ اگرچہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ رعد انداز کوئی ایسا گروہ ہے جو کسی ایسے آلے سے مسلح ہے جس کے پھینکنے سے آواز پیدا ہوتی ہے جیسا کہ لفظ رعد سے گمان ہوتا ہے رعد اور تخش اس وقت ایسے آلے نہیں معلوم ہوتے جو جنگوں میں فیصلہ کن ثابت ہوں۔ ان کی حیثیت زیادہ تر نمائشی معلوم ہوتی ہے۔ تیمور

مورخین ان کو کھلونوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آتش بازی کے سلسلے کی ایک اطلاع مولانا محمد بن قوام بن رستم المعروف بہ کڑی کی فرہنگ بحر الفضائل (تالیف ۸۳۷ھ) سے دی جاتی ہے جو لفظ غوطہ خوار کی تشریح میں مذکور ہے:-

غوطہ خوار

"غوطہ خوار" تماشائے آتش بازی کہ برقندازان می سازند و در آب گدازند و در غوطہ خوار دو دارو پر می کنند یک دارو بوقت سوختن بالا می آید و دیگر دارو بوقت سوختن غوطہ می خورد و غوطہ خوار یک پارہ نی است مقدار ہوائی اما آن نی بغیر زم است در آن نی دو دارو می اندازند یک دارو ہوائی و یک دارو دیگر زم است بوقت کوفتن یک تسو ہوائی را دارو پر می کنند۔ دیگر تسو زم دارو کفنی می کنند۔ ہمیں طریق ہر دو دارو در آن نی پر می کنند و در نہایت پلیتہ می سوزند۔ ہر وقتی کہ دارو از ان ہوائی می سوزد آنگہ غوطہ می خورد و ہر وقتی کہ دارو زم می سوزد آنگہ بالائے آب می آید مثل و مانند تماشہ آبی بازیگران کہ در آب می کنند ہمیں طریق است۔ پیدا ہم می شود و پنہاں ہم می شود و آن را نام غوطہ خوار گویند (ص ۱۲۲)

برقندازان سے مراد یہی آتش باز ہیں۔ دارو بارود کے لیے استعمال ہوا ہے یہ ایک صاف حوالہ ہے جس میں بارود کا ذکر آتا ہے۔

کارخانۂ آتش بازی دکن میں

اگر مورخ فرشتہ کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ توپ اور بندوق محمد شاہ بن علاء الدین بہمن شاہ ۷۵۹ھ ۱۳۵۸ء و ۷۷۶ھ ۱۳۷۵ء کے عہد میں دکن میں پہلی بار رائج ہوئی ہیں چنانچہ لکھا ہے کہ

جب شاہ مذکور دیلم پٹن کی یورش سے واپس آرہا تھا۔ تلنگی اس کے لشکر پر کوچ کے وقت تیر و تفنگ کا مینہ برساتے تھے بلکہ خود محمد شاہ کا بازو گولی سے زخمی ہوا۔ اس کی سود مندی دیکھ کر بادشاہ نے اپنی فوج میں کارخانۂ آتش بازی کی ترویج کی اور رومیوں اور فرنگیوں کو ملازمت میں رکھ کر مقرب خاں کو افسر مقرر کیا اور بڑا توپ خانہ مرتب کیا۔ فرشتہ کے اصل الفاظ ہیں :-

"سلطان محمد شاہ بہ صلاح خان محمد عمل کردہ پیرامون تسخیر قلعہ نگردید و فرا ہمی مطاعۂ جمیع قلاع و ممالک محروسہ مرسول داشتہ توپ و ضرب زن بسیار طلب کرد و کارخانۂ آتشبازی را کہ پیش ازاں در دکن میان مسلمانان شائع نبود محل اعتماد ساختہ سرکاری آں را بہ مقرب خاں ولد صفدر خاں سیستانی کہ از امرائی معتمد بود رجوع فرمود و جمیع رومیان و فرنگیان کہ ملازم آں موکب منصور بودند تابع مقرب خاں شدہ توپ خانۂ بزرگ ترتیب یافت" (صفحہ ۲۹۵ جلد اول فرشتہ ۔ نول کشور)

ہمارے نزدیک آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں رومیوں اور فرنگیوں کی ہندوستان میں آمد ناقابل قبول ہے۔ فرنگیوں میں سب سے پہلی قوم جو ہندوستان میں آتی ہے پرتگالی ہیں جو دسویں صدی ہجری کے آغاز میں آتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر فرشتہ کو سہو ہوگیا ہے۔ بہمنیوں میں اسی محمد شاہ کے جانشینوں میں ایک اور محمد شاہ سنہ ۸۶۷ھ و سنہ ۸۸۷ھ ہے۔ بظاہر حالات یہ زمانہ ہندوستان میں توپ و بندوق کے رواج کے واسطے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ فرشتہ کو ان دونوں سلاطین میں التباس پیدا ہوگیا ہو کیوں کہ

میں بندوق کی اشاعت کے متعلق مورخ مذکور سلطان زین العابدین ۸۲۲ھ — ۸۷۷ھ کا نام لیتا ہے چنانچہ کہتا ہے:-

کشمیر میں جب آتش بازی "در عہد سلطان حسب نام آتش بازی پیدا شد کہ چشم روزگار پیش ازاں ندیدہ بود داد درفن آتش بازی اختراعات کردہ کہ مردم حیران ماندند و در کشمیر تفنگ او پیدا کرد و دارو ہا ساخت و ہنر ہا نمود و مردم را تعلیم داد" (صفحہ ۳۴۴ جلد دوم)

جب نویں صدی ہجری میں بندوق کی اشاعت کشمیر میں ہوتی ہے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسی زمانے کے قریب ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اس کا رواج ہوا ہوگا۔ اگر دکن میں توپ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں آچکی ہے تو کیا وجہ ہے کہ دہلی مالوے گجرات وغیرہ کی تاریخوں میں اس کا مذکور نہیں آتا اور نہ جنگوں اور قلعوں کے محاصروں میں مورخین اس سے کام لیے جانے کا ذکر کرتے۔

گجرات میں تاریخ گجرات کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں توپ و تفنگ کا رواج نویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں ہو رہا ہے۔ مرآت سکندری کے بیان کے مطابق جب سلطان احمد شاہ ۸۱۳ھ میں شہر احمد آباد آباد کرتا ہے۔ اسی سال بعض مخالف امرا مثل مؤید الدین و بدر علا و مستی خاں ورنمل راجۂ ایڈر دوبارہ بغاوت کرتے ہیں اور قصبۂ موراسہ کے قلعے کے استحکام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سکندر بن منجھو کے الفاظ ہیں:-

" بدر علا و مؤید الدین و مستی خاں ورنمل راجۂ ایڈر جمعیت نمودہ از

ایڈر کوچ کردہ بموضع رنگ پورمن اعمال ایڈر کہ بہ پنج کروہے قصبہ مورآسہ واقع است نزول نمودند و در استحکام قلعۂ موراسہ مشغول شدند و خندق عمیق گرد قلعہ کشیدند و بارہ را توپ و تفنگ تعبیہ کردند" (ص ۲۲ مرآت سکندری طبع فتح الکریم بمبئی ۱۳۰۸ھ)

یہ پہلا موقع ہے کہ گجرات کی تاریخ میں توپ و تفنگ کا ذکر آتا ہے مگر حیرت ہے کہ مورخ مذکور گجرات میں ان آلات کی ترویج کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتا۔

اسی تاریخ میں ایک اور موقع پر جب سلطان علاء الدین محمود خلجی والی مالوا ۸۵۸ھ میں گجرات پر لشکر کشی کرتا ہے اور سلطان پور کا محاصرہ کرتا ہے۔ توپ و تفنگ کا پھر ذکر ملتا ہے چنانچہ:-

"چوں بناحیۂ سلطان پور رسید ملک علاء الدین بن سہراب کہ از طرف سلطان قطب الدین حاکم آں جا بود در دائرۂ قلعہ را بر روے او بستہ بہ جنگ توپ و تفنگ پیش آمد و تا ہفت روز محاصرہ کشید۔ (ص ۳۱)

لودھیوں کا زمانہ

احمد یادگار کی تاریخ سے یہ اطلاع ہم کو ملتی ہے کہ لودھیوں کے زمانے میں یہ آلات استعمال میں آ رہے تھے۔ سلطان بہلول لودھی نے ۸۵۵ھ میں دہلی پر قبضہ کیا۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۸۵۶ھ میں سلطان محمود شرقی جون پوری نے دہلی کا محاصرہ کیا۔ بہلول پنجاب میں تھا بر وقت نہ آسکا۔ محاصرین نے قلعے میں اس قدر حقہاے آتشیں پھینکے کہ اہل قلعہ کے لیے اپنے گھروں کے صحن میں چلنا پھرنا دشوار ہوگیا۔ ہمارا مورخ لکھتا ہے:-

"و مردم قلعہ کار از دست رفتہ دیدند و لشکر ثبات (سابا طا) و دیگر

برآوردہ جھلنے آتش بازی چناں در قلعہ می انداختند کہ مردم درود تی را یارے آں نبودہ کہ در صحن خانہ بگردند" (ص۱۱ تاریخ شاہی مرتبۂ حافظ ہدایت حسین ۱۹۳۹ء)

جب بہلول کی فوجیں احمد خاں بھٹی والی سندھ کی فوج سے جس کا افسر نورنگ خاں تھا مشغول پیکار تھیں۔ اسی تاریخ میں نورنگ کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:-

"اکثرے از سپاہ سلطانی از تیغ نورنگ خاں دونیم شدہ از اسپ افتادند۔ ناگاہ گولۂ زنبورک بر وخورد و نورنگ خاں را نیز دو نیم نمود"

(ص۱۲)

ابراہیم لودھی اپنے باپ کے امرا کے قتل کے لیے ایک مکان تیار کراتا ہے جس کے تہ خانے میں خفیہ طور پر بارود سے بھرے تھیلے رکھوا دیے گئے تھے۔ ان تھیلوں کے متعلق احمد یادگار لکھتا ہے:-

"بگفتۂ بعضے حساد بجہت او و بعضے امرار دیگر ایوانی ساختہ و در زیر او تہ خانہ نمودہ۔ بعد دو ماہ کہ تہ خانہ خشک شدہ پنہاں بہ خریطہائے دارو پر ساختہ۔ بعد ازاں میاں بھوہ و چندے امرائے دیگر کہ بدفع آں حیلہ ساختہ بود از قید خلاص نمود" (ص۸۲ ایضاً)

اسی ابراہیم کے عہد کا ایک اور واقعہ ہے جس میں باغی امرا کی فوج کا ہاتھی بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر اپنی فوج کو روندنے لگتا ہے۔ اس موقع پر مصنف کہتا ہے:-

"ناگاہ پیلے جنگ آور کہ بروئے اسلام خاں بودہ تفنگی از طرف سپاہ سلطان بر پیشانی خوردہ برگشتہ بر فوج خود افتاد و باعث تفرقۂ سپاہ

مخالفان گردید۔" (صفحہ تاریخ شاہی)

بعض پرتگالیوں کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ ان کی آمد کے وقت ہندوستان کے سواحلی علاقوں میں توپ و بندوق کا استعمال عام تھا۔ دسویں صدی ہجری میں توپ خانہ جنگوں کے تصفیے کے واسطے ایک فیصلہ کن وسیلہ بن چکا تھا۔

بابر کا توپ خانہ توپ خانہ تھا جس کی مدد سے سلطان سلیم نے اسمٰعیل صفوی کو ہزیمت دی اور اسمٰعیل صفوی نے شیبانی خاں کو برباد کیا۔ ان واقعات نے بابر بادشاہ کو توپ خانے کی سودمندی کا بڑا معتقد بنا دیا تھا۔ چنانچہ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی سے جنگ کے واسطے وہ ایک زبردست توپ خانہ لایا تھا۔ توپوں کی تعداد آٹھ سات سو تھی۔ توپ خانہ کا افسر استاد علی قلی تھا جس کو حکم ملا کہ ارابوں یعنی توپ کے رہکلوں کو روم کے دستور کے مطابق گائے کے چمڑے کے رستوں سے زنجیر کے بجائے باندھ دے اور دو دو توپوں کے درمیان چھ سات توبروں کی جگہ چھوڑ دے تاکہ لڑائی کے وقت بندوقچی ان کی آڑ میں تفنگ اندازی کر سکیں۔ ابراہیم کے مقابلے میں بابر کی فوج نصف بھی نہ تھی مگر توپ خانے نے اس کو صریح تفوق دے دیا تھا اور اسی کا اثر تھا کہ جس مقام پر ابراہیم مارا گیا وہاں پانچ چھ ہزار پٹھانوں کی لاشیں پائی گئیں۔ پانی پت کی جنگ کی تاریخ اسی عہد کے کسی ہندی شاعر نے یوں دی ہے:-

نو سے اوپر بڑھتا بتیا　　پانی پنتھ منہ بھارتھ دیا
چوتھی رجب سشکر وارا　　بابر جیتا براہیم ہارا

شیرشاہ کی ہلاکت ۹۵۲ھ میں قلعۂ کالنجر کے محاصرے کے وقت حقہاے آتش بازی میں آگ لگ جانے سے شیرشاہ بادشاہ کی ہلاکت واقع ہوئی ہو جس کی تفصیل احمد یادگار نے بالفاظ ذیل دی ہو:-

"شیرشاہ رفتہ در نواحی قلعہ فرود آمد و قلعہ را محاصرہ نمود و مورچل بر امرا قسمت کرد و عرادہ و منجنیق درکار آمد۔ در ساختن نبات و بستن گرگج تاکید نمود و لشکر از ہر طرف چوں مار حلقہ بستہ در سامان جنگ شد۔ رومی خاں سہ سرنگ موجود ساختہ و بجوئیلہاے وار و برکرد . . . . . کار نزدیک رسیدہ کہ قلعہ مفتوح شود۔ بہ تقدیر اللہ تعالیٰ قصۂ عجب العجائب و حادثۂ غریب الغرائب بظہور آمد و آں چناں بودہ کہ جلال خاں جلو ثبات بلند ساختہ توپ آں جانہادہ دکار بر مردم قلعہ چناں تنگ ساختہ کہ کسے را یارائے آں نماندہ کہ در صحن خانہ بگردد۔ چوں بشاہ عالم خبر رسید کہ جلال خاں چناں تردد نمودہ کہ از طرف او قلعہ بیفتد۔ بادشاہ آں جا آمد و جلال خاں را تحسین نمود۔ جائے کہ بادشاہ و شیخ عبدالجلیل و احمد خاں نبی ایستادہ بودند حقہا را آتش دادہ درون قلعہ می انداختند۔ ناگاہ حقۂ بدیوار خورد و شکست و درمیان حقہا افتاد۔ آتش درگرفت۔ بادشاہ و ایں ہر دو کہ ایستادہ بودند نیم سوختہ گشتند۔ بادشاہ را در پالکی انداختہ در خرگہ آوردند در خم جعفرات نشاندند۔"

اکبر کا توپ خانہ ابوالفضل توپ خانے کو قفل و کلید سلطنت کہتا ہو اور سچ بھی یہی ہو۔ اکبر نے آتش خانے کے معاملے میں خاص دلچسپی لی ہو اور توپوں کا جس قدر ذخیرہ اس کے ہاں جمع ہوا تھا

سلطنت عثمانیہ کے سوا اور کہیں نہیں سنا گیا۔ بعض توپیں اکبر کے پاس اتنی قدر بڑی تھیں کہ ان سے بارہ بارہ من کا گولا پھینکا جاتا تھا۔ ان توپوں کے کھینچنے کے واسطے کئی کئی ہزار بیل اور متعدد ہاتھی درکار رہتے۔ توپخانے کا انتظام عہد اکبری میں نہایت معقول پیمانے پر تھا۔ سینکڑوں افسر اس کارخانے میں مامور تھے۔ بعض توپیں خود اکبر کی ایجاد تھیں۔ ان میں یہ وصف تھا کہ سفر کے وقت ان کے پرزے علیحدہ علیحدہ کر دیے جاتے تھے اور ضرورت کے وقت آسانی سے جوڑ دیے جاتے تھے۔ اس کی ایک ایجاد یہ بھی تھی کہ سترہ توپیں صرف ایک فتیلے سے سر ہو سکتی تھیں۔ گجنال بھی اکبری اختراع ہے جسے ایک ہاتھی لے جا سکتا تھا۔ نرنال بھی اکبری مستحدثات سے ہے جسے ایک آدمی لے جا سکتا تھا۔ اس دور اندیش بادشاہ نے توپوں کا بڑا ذخیرہ ہر ہر صوبے میں جمع کرا دیا تھا۔

بندوق کی تیاری کا طریقہ

پرانے زمانے میں بندوق کی نال میں لوہے کے چار قطعے درکار رہتے۔ بعض اوقات لوہے کی لمبی چادر کو لے کر گول کر کے اس کے دونوں لبوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا جاتا تھا۔ مگر ایسی بندوقیں خوفناک تھیں چلاتے وقت اکثر پھٹ جاتیں۔ اکبر نے اس خامی کو یوں رفع کیا کہ لوہے کی چادر لے کر اس کے لبوں کو کاغذ کی طرح ایک دوسرے پر چسپاں کرا دیا اور پھر انھیں آپس میں جوڑ دیا۔ بندوق کی نال بالشت سے لے کر دو گز تک لمبی ہوتی تھی۔ سوا گز لمبی نال والی بندوق دمانک کہلاتی تھی۔ اس کی کوٹھی کی وضع بھی اور بندوقوں سے مختلف تھی۔ بعض ایسی بھی تھیں جو صرف گھوڑے کی حرکت سے فتیلے کے بغیر آگ لے لیتیں۔ بعض

بندوقوں کی گولیاں تیر نما ہوتی تھیں۔ اکبر کے زمانے میں استاد حسین بندوق ساز اپنے فن میں کامل مانا گیا تھا۔ نال کے واسطے لوہا تیار ہونے پر اپنے اصلی وزن کا نصف رہ جاتا تھا۔ اس پر اصلی وزن اور نقصان شدہ وزن کی اصلی تعداد الگ الگ لکھ دی جاتی۔ لوہے کے اس پارچے کو اصطلاح میں ڈول کہا جاتا تھا۔ شاہی ملاحظے کے لیے ڈول محلسرا میں بھیج دیا جاتا۔ پھر حسب الحکم اس میں بڑا یا چھوٹا سوراخ بنایا جاتا۔ گولی کے وزن کے لحاظ سے سوراخ تیار کیا جاتا۔ بڑی گولی کا وزن پچیس ٹانک اور چھوٹی گولی کا پندرہ ٹانک ہوتا تھا۔ پچیس ٹانک کی گولی چلانے کے عام لوگ عادی نہیں تھے۔ صرف بادشاہ چلا سکتے تھے۔ جب نال میں سوراخ ہو گیا۔ شاہی ملاحظہ کے لیے دوبارہ حرم سرا میں بھیجی گئی۔ اس کے بعد اسے کندے پر چڑھایا اور نال میں تہائی حصے تک بارود بھر کر کئی مرتبہ اس کو چلایا گیا۔ اگر آزمائش میں قابل اطمینان نکلی۔ بادشاہ کے معائنے کے واسطے پھر بھیجی گئی۔ واپسی پر اس کا دہانہ تیار ہوا۔ پھر یہ امتحان کیا گیا کہ گولی سیدھی لگتی ہے یا نہیں۔ اگر گولی نشانے پر نہیں لگتی تو گرم کر کے نال کو خاص شکنجے میں رکھ کر سیدھا کیا جائے گا۔ اس کے بعد نقش و نگار بنانے کے واسطے سوہان گر کے پاس جائے گی۔ کندے کی لکڑی بادشاہ خود پسند فرماتے۔ اس وقت نال پر سے وزن کے ہندسے مٹا دیے جاتے۔ ان کے بجائے کاریگر کا نام، مقام، تاریخ، مہینہ اور سال کندہ کر دیا جاتا۔ اب گز اور گھوڑا تیار ہوا۔ یہ بندوق سادہ کہلاتی۔ بادشاہ امتحاناً چار گولیاں اس سے چلاتے۔ جب مذکورۂ بالا مراتب طے کرنے کے بعد دس رنگین بندوقیں تیار ہو جاتیں تب طلائی کوفت کا کام کرنے کے

بعد شاہی چیلے کے سپرد ہو جاتیں۔

اکبری دور سے پیشتر بندوق کے صیقل کے واسطے متعدد اوزاروں اور آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ مگر بادشاہ نے ایک ایسا چرخ ایجاد کیا تھا جسے "دولاب خانہ" کہتے تھے۔ یہ ایک بیل سے چلتا اور بہت کم وقفے میں سولہ بندوقیں بڑی آسانی سے صیقل ہو جاتیں۔

اکبر نے مہینوں، ہفتوں اور دنوں کے لیے الگ الگ بندوقیں رکھ چھوڑی تھیں اور جس بندوق سے جو شکار اس نے مارا۔ اس کی تفصیل مع تاریخ، میر شکار لکھ لیا کرتا۔ چنانچہ ایک خاصہ بندوق "سنگ رام" نامی سے جو ماہ فروری یا مارچ سے منسوب تھی۔ اکبر نے گیارہ سو جانور شکار کیے تھے۔

بہاء الدین برناوی اور بندوق سے شکار

اگرچہ اکبر کے ہاں بندوقوں کی تیاری بڑے اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہی لیکن اطراف ہند میں ان کا رواج اور قبول عام اکبر سے بعد کی باتیں ہیں مخدوم علاء الدین صاحب کتاب چشتیہ بہشتیہ مخدوم بہاء الدین برناوی متوفی سنہ ۱۰۳۱ھ کے ذکر میں صاف تصریح کرتے ہیں کہ برناوہ ضلع مظفر نگر اور اس کی نواح میں مخدوم بہاء الدین پہلے شخص ہیں جو شکار میں بندوق کا استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کے شکار کا ایک قصہ بھی لکھا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ ان ایام میں عوام الناس بندوق کی آواز سے ناواقف تھے۔ اگر کبھی سن لیتے نہایت خائف ہوتے۔ لکھتے ہیں شیخ ایک دن شکار کو گئے کچھ کسان جنگل میں گھاس کاٹ رہے تھے۔ مخدوم نے بندوق چلائی۔ گولی قریب سے جو نکلی وہ دہل گئے اور سمجھے کہ کوئی شی ان کے جسم سے پار

نکل گئی ہی۔ فوراً زمین پر دراز ہو گئے اور سمجھ لیا کہ مر گئے۔ مخدوم ان کے پاس گئے اور ان کی تسلی کی۔ مصنف کی اصل عبارت یہ ہی:-

" و آں بزرگوار در استعمال ایں نوع شکار (تیر سے شکار کی طرف اشارہ ہی) مدتے مدید اشتغال داشت۔ بعد ازاں بہ طرز دیگر عزم برگماشت کہ آں نہنگ بہ شکار تفنگ آہنگ بیدرنگ نمود و در اندک فرصت در یں شیوہ چناں بلاغت حاصل فرمود کہ بدیں حد کمتر کسی را ابواب رسیدگی کشود۔ گویند کہ در آں زمان غیر ایں دودمان دریں دیار از یں قسم شکار ہیچ کس مطلع نبود بلکہ نام تفنگ ہم نہ دانستندی و اگر اتفاقاً آواز تفنگ در گوش اہل آں نواحی افتادی ترسیدی و لرزیدی و افتاں و خیزاں راہ فرار پیش گرفتے۔

منقول است کہ روزے چند روستائی بے اشتباہ گیاہ می تراشیدند ناگاہ آواز غربیدن بندوق در صندوق مسامع آں بیابانیان رسید۔ بمجرد شنیدن صوت آثار موت وحشتے و ہیبتے در دلہائے خونے و رعبے در جانہائے آنہا چناں غالب و مستولی شد کہ بر فور روی بزمیں جا بجا افتادند۔ بہر جانبے غلطیدن گرفتند و لرزہ در اندام ہر یکے پدید آمد و ساعتے بے خود و بیہوش ماندند۔ بعد از رفاقت با زنالہ و زاری آغاز نہادند پس آں صیاد ایں تمامی تماشائے حوال آں ہا از بعید دیدہ قریب رسیدند و پرسیدہ کہ اے یاران ایں چہ حالت ست و کدام درد و بیماری سخت پیش آمدہ است کہ چنیں بے قراری روی دادہ است۔ آں دہاقین از روئے یقین جواب دادند کہ چہ می پرسید از حیات نومید شدیم و در زمرۂ مردگان داخل شدہ افتادہ ایم۔ باز استفسار کردند کہ باری حقیقت

ایں مرض ظاہر کنید و روشن بگوئید تا علاجے و تدبیرے کردہ شود۔ ہر یہ گفتند که ناگاہ بلائے عظیم و ابتلائے فخیم بر سر ما نازل شد۔ نمی دانیم که از رعد بہ شکست یا صاعقہ و آتش پارہ از فلک افتادہ و در شکم ما آمدہ گزارا شد و از جانبے دیگر بدر رفت۔ مجروح افتادیم۔ پس آں (حضرت) خندیدہ گفتند که جراحت در بدن شما کجاست نیابید نامرہمے و داروئی سخت نمودہ آید چوں در اعضائے آں خائفان نیکو تفحص کردند۔ ہیچ نیافتند۔ ایں حکایت از آں ہنگام مثل ماند۔"

مصنف مذکور اپنے عہد (۵۲-۱۱۵۵ھ) کے دیہاتیوں کی باخبری کا اکبر کے عہد سے مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"آں زماں گنواران چنیں نادانان و ترسناکان بودند۔ امروز اہل بوادی در ہر وادی حکم انداز و برق انداز جانباز و نغمہ پرداز با سرود و سور در دہقان و قریات پیدا آمدند و اسپ ہوا راندہ اند۔" (ص۳۱۷)

۴ - راسا پر تبصرہ

جیمز ٹاڈ

راسا کو علمی دُنیا میں روشناس کرنے کا سہرا جیمز ٹاڈ[1] کے سر ہے جو گزشتہ صدی کے پہلے ربع میں مغربی راجپوتانے کی ریاستوں کا پولیٹکل ایجنٹ تھا۔ یہ ٹاڈ ہی تھا جس نے ان ریاستوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان عہدنامے مرتب کیے۔ راجپوتانے کے قیام کے زمانے میں اس نے راجپوت حکمراں خاندانوں اور ان کی قدیم تاریخ میں گہری دلچسپی لی۔ اور ہر قسم کا تاریخی سرمایہ اسناد و فرامین، کتب بھاٹوں برہمنوں اور جینیوں کے منظوم و غیر منظوم رسائل۔ تانبے پتر اور سنگی کتبوں وغیرہ کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کرکے اس کی بنیاد پر ۱۸۲۹ء میں تاریخ[2] و تحقیقات راجستان، دو ضخیم جلدوں میں شائع کی۔ یہ کتاب اب تک معیاری پایہ کی تالیف سمجھی جاتی ہے اور انگلستان و ہندوستان میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ ٹاڈ کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کے ساتھ علانیہ دشمنی کا اظہار کیا ہے وہاں خوشامد کی حد تک راجپوتوں کی طرفداری کی ہے۔ بلکہ راجپوت رؤسا کی یہ بیجا حمایت ہی تھی جس کی بنا پر گورنمنٹ

---

[1] James Tod.

[2] Annals & Antiquities of Rajasthan.

اس کو بے اعتمادی کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ چنانچہ اس کے اختیارات میں
کمی کر دی گئی اور دوسرے افسروں کو اس کا شریک بنا دیا گیا۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ اس نے تنگ آکر اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ ٹاڈ نے
اپنی تاریخ میں راجپوتوں کی مداحی کے جوش میں مغربی اصول تحقیقات
کو بالائے طاق رکھ کر ہر قسم کے معتبر و غیر معتبر ذرایع سے کام لیا ہے خصوصاً
ہندی ادب کی اس شاخ سے جو بھاٹوں کے دماغ و قلم کی یادگار
اور تاریخی نقطۂ نظر سے ناکارۂ محض ہے۔ مگر وہ اس ماخذ کو ملکی تاریخ
کے سلسلے میں نہایت بیش قیمت اور قابل قدر خیال کرتا ہے۔ چونکہ ان
تالیفات میں سوائے جنگوں اور قتل و غارت کے قصوں کے اور کچھ نہیں
ہوتا۔ اس لیے اس قسم کے اعتراض کے جواب میں یہ صفائی پیش کرتا ہے
کہ " یہ چیزیں ایک جنگ جو قوم کے لیے لکھی جاتی تھیں، اسی لیے ان کے
مصنف ملکی معاملات اور زمانۂ امن کے مشغلوں اور دھندوں کی طرف
التفات نہیں کرتے۔ صرف عشق اور جنگ ان کا دل پسند موضوع ہے۔
البتہ چند جو ہندوستان کے چوٹی کے بھاٹوں میں سب سے مقدم ہے
اپنے دیباچے میں کہتا ہے کہ میں نظام سلطنت کے قوانین۔ صرف و نحو اور
انشا پردازی کے قواعد اور ملکی سیاسیات کی خارجی و داخلی
حکمت عملی کی تعلیم دوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنی تصنیف کی مختلف داستانوں
میں موقع بہ موقع ان عنوانوں پر دفتر پند و موعظت کھولا ہے۔" آگے چل کر
ہمارا مصنف اضافہ کرتا ہے کہ " اگرچہ ان بھاٹوں کے کارناموں میں بعض
خامیاں ہیں۔ تاہم ان سے ہمیں واقعات و کوائف۔ مذہبی آرا اور رسم و
رواج کی خصوصیات کے متعلق بڑی قیمتی اطلاع دستیاب ہوتی ہے اور

چونکہ یہ امور بلا ارادہ زبان قلم سے ترشح پائے ہیں۔ اس لیے ان کو ایسی تاریخی شہادت تسلیم کیا جا سکتا ہے جو ہر قسم کے شبہ سے بری ہے۔ پرتھی راج کی رزمیہ تاریخ میں چند نے اپنے آقا کی معرکہ آرائیوں کے بیانات میں اکثر جغرافیائی اور تاریخی تفصیلات دی ہیں جن کا وہ عینی شاہد ہے کیونکہ وہ اس کا دائمی رفیق تھا۔ اس کی شہرت کا نقیب تھا۔ اس کا سفیر تھا۔ بلکہ بے عزتی کی موت سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس کی موت کی سازش میں شریک ہونے کا ناشاد فرض بھی اس کو ادا کرنا پڑا۔"

بھاٹوں کے منظوم کارناموں کے متعلق اس ارادتمندانہ رائے کے ساتھ ٹاڈ اپنی تاریخ شروع کرتا ہے اور فاتحہ سے لے کر خاتمے تک ان سے استفادہ کا کوئی موقع فروگزاشت نہیں کرتا۔ اس غلط روی نے اس کی تالیف کو تاریخ کے بجائے افسانہ بنا دیا۔ لیکن مصنف کو اس امر کا احساس تک نہیں ہوا۔ مذکورہ بالا اقتباس میں نے اس کے دیباچے سے دیے ہیں۔ راسا کے متعلق اس کی تفصیلی رائے ذیل میں عرض ہے۔ اسے بھی دیکھ لیجیے:

"چند کی تالیف اس عہد کی عمومی تاریخ ہے جس میں مصنف ہو گزرا ہے۔ ان ایک کم ستر کتابوں سے جو ایک لاکھ چھندوں پر شامل ہیں اور پرتھی راج کے کارناموں کی افسانہ خواں ہیں۔ راجپوتانے کا ہر عالی مرتبہ خاندان کچھ نہ کچھ اپنے اسلاف کی تاریخ معلوم کر سکتا ہے۔ اسی لیے ہر ایسا قبیلہ جو راجپوت کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس تصنیف کو اپنی قابل قدر خاندانی یادگاروں میں شمار کرتا ہے۔ اس کے ذریعے سے اسے اپنے قدیم نبرد آزما بزرگوں کا سراغ ملتا ہے۔ جنھوں نے

کرنال کی گھاٹیوں میں دریائے خون میں شناوری کی۔ جب جنگ کے بادل
کوہ ہماچل سے اُٹھ کر ہندوستان کے وسیع میدانوں پر چھا گئے تھے
پرتھی راج کے معرکوں۔ اس کی شادیوں اور اس کے بے شمار طاقتور
باج گزاروں۔ ان کی راج دھانیوں اور نسب ناموں کا ذکر چند کی تالیف
کو بحیثیت تاریخی و جغرافیائی دستاویز نہایت قیمتی اور بیش بہا بنا دیتا ہے
اس کے علاوہ اساطیری روایات اور ملکی رسم و رواج کا قابل قدر سرمایہ
بھی اس میں شامل ہے۔ اس شاعر کا گہرا مطالعہ عزت و حرمت کی منازل
کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے۔ راسا کے معاملے میں پراتم بھاٹ بھی
میرے گرو کی فضیلت علمی کے قایل تھے۔ جیسے جیسے وہ میرے سامنے
پڑھتا جاتا میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جاتا۔ اس طرح تیس ہزار چھندوں کا ترجمہ
تیار ہو گیا۔ جس زبان میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس سے واقفیت کی بنا
پر بعض اوقات میں نے ایسا خیال کیا ہے کہ میں نے شاعر کی اصلی روح
کو پالیا ہے لیکن میری جسارت ہوگی اگر یہ کہوں کہ میں اس کی روانی اور
آبداری کے اخذ کرنے یا اس کی تلمیحات کو پورے طور پر فہم کرنے میں
کامیاب ہوا ہوں۔ البتہ میں اس امر سے واقف تھا کہ شاعر کن لوگوں کے
واسطے لکھ رہا ہے۔ اس کے مشہور عالم تصورات اور جذبات روزانہ ان
لوگوں کے منہ سے میرے سامعہ نواز ہوتے تھے جو ان ہی بہادروں
کے خلف تھے جن کے کارناموں کا اس نے اپنی تالیف میں نقشہ کھینچا
ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں فنون شعر کا ایک ماہر شاعر کے
مطالب سمجھنے میں قاصر رہتا۔ وہاں میں اپنے نثری ترجمے میں کامیاب
ثابت ہوا ہوں" (جلد اول صفحہ ۲۹ مرتبہ ولیم کروک۔ آکسفورڈ یونیورسٹی

پریس سنہ ۱۹۲۰ء)

حیرت ہی کہ مغربی دبستان کا یہ تربیت یافتہ فاضل اصل کو نقل سے اور راست کو باطل سے تمیز نہیں کرسکا۔ ورنہ بھاٹوں کی روایات کی بے حقیقی اور مجعولیت کو بے نقاب کرنا کوئی ایسا دشوار مسئلہ نہیں تھا جس کے لیے بڑی دماغ سوزی کی ضرورت محسوس ہو۔ ان شطحیات میں کافی سے زیادہ قرائن موجود ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کا تتبع ان کی لغویت کی حقیقت وا انکشاف کرسکتا ہی۔ مگر جیمز ٹاڈ دانستہ ان سے اغماض کرتا ہی۔ میں بعض ایسے امور یہاں درج کرتا ہوں:۔

کھومان رائیسا کے حوالے سے ٹاڈ لکھتا ہی کہ کلبھوج کے بعد کھومان سنہ ۸۱۲ء وسنہ ۸۳۶ء میواڑ کی گدی پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں چتوڑ پر مسلمان حملہ آور ہوئے۔ کھومان نے کامیابی کے ساتھ اپنے ملک کی حفاظت کی۔ ان وحشیوں کو شکست دی۔ ان کا تعاقب کیا اور ان کے سردار محمود کو گرفتار کرلیا۔ (صفحہ ۲۸۶ وصفحہ ۲۹۴)

چونکہ یہ محمود مشہور فاتح محمود غزنوی سے دو صدی اقدم ہی اور اسلامی تاریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ ٹاڈ نے اس گورکھ دھندے کا اس طرح حل کیا کہ کھومان مذکور خلیفہ المامون سنہ ۸۱۳ء وسنہ ۸۳۳ء کا معاصر ہی۔ مامون کے باپ مشہور ہارون الرشید نے اپنے دونوں فرزندوں امین اور مامون میں سلطنت تقسیم کردی تھی۔ مشرقی حصہ یعنی خراسان۔ زابلستان۔ کابلستان۔ سندھ اور ہندوستان مامون کے حصے میں آیا تھا۔ مذکورۂ بالا رائیسا چتوڑ کے حملہ آور کا آنا زابلستان سے بیان کرتا ہی جس کو "محمود خراسان پت" کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہی۔

لہذا اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ کاتب نے اس موقع پر غلطی سے مامون کے نام کی جگہ محمود کا نام لکھ دیا۔ (ص ۲۸۶)

گویا ٹاڈ صاحب کی تحقیقات عالیہ کی رو سے خلیفہ مامون ہندوستان آکر چتوڑ پر حملہ کرتا ہے اور قید کر لیا جاتا ہے مگر وہ یہ نہیں بتاتا کہ آخر کو ان کے اس قیدی کا انجام کیا ہوا؟

یہ قصہ اگرچہ اختراع محض ہے اور اس سے زیادہ اس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں مگر ہم اپنے قارئین کی رہنمائی کے لیے اتنا اشارہ کر دیتے ہیں کہ وہ صدائے بازگشت ہے ان واقعات کی جو رانا سانگا اور سلطان محمود خلجی سنہ ۹۱۶ھ و سنہ ۹۳۷ھ والی مالوا کے درمیان رونما ہوتے ہیں۔ قصہ یوں ہے کہ سلطان محمود جو سلاطین مالوا کا آخری تاجدار ہے اپنے وزیر میدنی رائے کے روز افزوں اقتدار سے تنگ آکر ایک روز اپنے دارالسلطنت منڈو سے جہاں وہ قیدیوں کی طرح زیر حراست رہتا تھا فرار کر کے سلطان مظفر شاہ گجراتی سنہ ۹۱۷ھ و سنہ ۹۳۲ھ کے پاس پناہ لیتا ہے اور اپنی داستان غم اسے سناتا ہے۔ مظفر اس پر ترس کھا کر سنہ ۹۲۴ھ میں مالوے آتا ہے۔ دھار اور منڈو فتح کر کے دوبارہ محمود کو تخت پر بٹھاتا ہے اور اس کی امداد کے لیے آصف خاں گجراتی کو چند ہزار سوار کے ساتھ چھوڑ کر واپس گجرات جاتا ہے۔ مالوے میں اس وقت میدنی رائے اور سلہدی نہایت طاقت ور تھے۔ محمود قلعہ گاگروں کی استرداد کی غرض سے جس پر میدنی رائے قابض تھا بڑھتا ہے۔ میدنی رائے اپنی حمایت پر رانا سانگا کو بلاتا ہے محمود عجلت بازی کر کے غنیم کی فوج کے ساتھ بے موقع بھڑ جاتا ہے۔ مسلمانوں کو سخت شکست ہوتی ہے۔ ان کے ۳۲ بڑے بڑے

سردار مارے جاتے ہیں۔ آصف خاں پانسو گجراتیوں کے ساتھ کھیت رہتا ہے۔ مگر محمود جس میں عقل کم اور جرأت زیادہ تھی۔ اب بھی منہ نہیں موڑتا اور دس سوار کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتا ہے اور جب تک زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نہیں گر جاتا۔ راجپوتوں کے ہاتھ نہیں آتا۔ رانا سانگا اس کے علاج کا حکم دیتا ہے اور صحتیاب ہونے کے بعد عزت کے ساتھ منڈو بھیج دیتا ہے (تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۶۹، نول کشور)

واقعات کی اس داغ بیل پر کھومان رایسا کی تعمیر کھڑی کی جاتی ہے جس میں واضع نے اگرچہ محمود غزنوی کو تاکا تھا۔ مگر ٹاڈ صاحب نے اس کی کمان کا رُخ بدل کر مامون کی طرف پھیر دیا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سولھویں صدی کی واردات آخر اٹ کر نویں صدی کے اشخاص پر کس طرح چسپاں کر دی گئی۔ اس کا جواب ہمارے نزدیک ہندی ادبیات کی ابتری کا وہ مدوجزر ہے جس کے گرداب میں تقدیم و تاخیر کا امتیازی رنگ روغن بآسانی دھل جاتا ہے اور امسال و پارکا فرق اس کے سیلاب میں بہہ جاتا ہے۔ جب واقعات کا سلسلہ سال و ماہ کی قید سے ایک مرتبہ آزاد ہو گیا پھر اس کے اجزائے پریشان کو جس شخص کے سر چاہو منڈھ دو چنانچہ یہی زیر بحث واقعہ ایک مرتبہ اور اسی محمود کے پردادا سلطان علاء الدین محمود خلجی سنہ ۸۳۹ھ ۱۴۳۵ء تا ۸۸۱ھ ۱۴۷۵ء والی مالوہ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ میں یہاں ٹاڈ کی روایت نقل کرتا ہوں۔

"رانا کومبھا سنہ ۱۴۱۹ء تا ۱۴۶۹ء شاہان گجرات و مالوہ کے متحدہ لشکروں کو سنہ ۱۴۴۰ء میں شکست فاحش دیتا ہے اور محمود خلجی کو گرفتار

کر کے چتوڑ لے جاتا ہے اور چھ ماہ تک قید میں رکھتا ہے۔ اس فتح عظیم کی یادگار
میں کومبھا نے چتوڑ میں منارۂ فتح تعمیر کیا ہے جس پر یہ تمام قصہ لکھا ہے۔
(صفحہ ۳۳۵ ٹاڈ)

منار بے شک موجود ہے اور اس کے ایک طبقے میں رانا کی فتح کا قصہ
بھی پتھر کے چوکوں میں کندہ ہے۔ مگر کیا یہ امر عجیب نہیں کہ چتوڑ کے رانا
مختلف اوقات میں تین محمودوں کو ہزیمت دے کر قید کر لیتے ہیں؟ اس
مرتبہ ٹاڈ صاحب نے جس محمود کا ذکر کیا ہے وہ ایک اولوالعزم اور جلیل القدر
بادشاہ ہے جس کا اکثر زمانہ جنگلوں اور میدانداریوں میں گزرا ہے۔ بقول فرشتہ
۴۳ سال اور بہ روایت لین پول چالیس سال اس نے سلطنت کی۔ اس تمام
عرصے میں اس کے دامن پر صرف ایک شکست کا داغ ہے جو گجرات
میں اسے ملتی ہے۔ اس کے سوا فتح و نصرت ہمیشہ اس کے پرچم پر
لہراتی رہی۔ گجراتیوں سے اس کی ٹکر ہوئی دکن میں بیدر تک دھاوے
کیے۔ شرقیوں سے اس کے معرکے رہے۔ اجمیر راجپوتوں سے اس
نے چھینا۔ ہاڑوتی اور کوٹہ والے اس کے باج گزار رہے اور میواڑ
پر تو اس نے کئی حملے کیے۔ سنہ ۸۴۶ھ میں رانا کومبھا زخمی ہو کر بھاگا
ہے۔ سنہ ۸۵۰ھ میں کومبھا پیش کش دے کر اپنا پیچھا چھڑاتا ہے۔ سنہ ۸۵۸ھ
رانا کو پھر پیش کش دینی پڑتی ہے۔ سنہ ۸۶۳ھ میں محمود میواڑ کا مشہور قلعہ
منڈل گڑھ فتح کرتا ہے۔ سنہ ۸۶۳ھ میں قلعہ کوندی پر قابض ہوتا ہے۔ سنہ ۸۶۶ھ
میں قلعہ کونبلمیر تک آیا اور چلا گیا۔ یہ تفصیل جو میں نے فرشتہ (صفحہ ۲۴۲
صفحہ ۲۵۴ جلد دوم) سے لے کر یہاں قلم بند کی ہے اس میں کوئی ایسا واقعہ
نظر نہیں آتا جس میں رانا نے محمود کو گرفتار کیا ہو۔

راسا کے صفحات میں کئی موقعوں پر فرنگیوں کا ذکر آتا ہے جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ شہاب الدین کی فوجوں میں شامل تھے۔ ایک نقاد پرتھی راج کے عہد میں فرنگیوں کے ذکر سے معاً چونک اٹھا کیونکہ ہندوستان میں فرنگیوں کی آمد سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوتی ہے اور کیا ٹاڈ سے یہ امر مخفی تھا کہ اس کے ہم مذہب پرتگالی سب سے پہلے فرنگی ہیں جو ہندوستان میں اپنا قدم جماتے ہیں اور بعد میں دوسرے فرنگی آئے۔ فرنگیوں کا ذکر ٹاڈ کی معتبر تاریخ راسا کی قدامت کا پردہ فاش کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس کی پردہ داری کی کوشش میں ذیل کی انوکھی توجیہ پیش کرتا ہے۔

"یہ اچنبھے کی بات ہے کہ چند فرنگیوں کو شہاب الدین کی فوج میں جب وہ پرتھی راج پر فتح پانے چلا ہے شریک بیان کرتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ صلیبی مجاہدین کا کوئی بے قاعدہ یا فراری دستہ ہوگا" (ٹاڈ ۹)

یہ تاویل ناقابل قبول ہے اور عذر لنگ سے زیادہ وقعت کی مستوجب نہیں۔ کیونکہ صلیبی مجاہدین نے ان اطراف میں نہ کبھی قدم رکھا نہ تاریخ ہند میں ان کا تذکرہ آتا۔ ان کی واقعہ طلبی شام و بیت المقدس تک ہی محدود رہی۔

راسا میں اسی طرح آتشیں اسلحہ توپ، بندوق، زنبورک، ہتنال وغیرہ کا ذکر بھی بار بار ملتا ہے جو شہاب الدین اور پرتھی راج کے عہد سے بہت عرصے بعد ایجاد ہوئے ہیں۔ یہ امر بجائے خود بدگمانی پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن ٹاڈ اس سے اغماض کرتا ہے۔

ٹاڈ نے راسا کے حوالے سے لکھا ہے کہ سمر سنگھ والی میواڑ نے

شہاب الدین سے جنگ کی غرض سے چتوڑ چھوڑتے وقت اپنے چھوٹے فرزند کرن کو اپنا جانشین بنا دیا۔ اس فعل سے اس کا بڑا فرزند جوگدی کا وارث تھا سخت ناخوش ہوا اور طیش میں آکر دکن کے شہر بیدر کی طرف چل دیا۔ جہاں کے 'حبشی بادشاہ' نے جو وہاں کی حکومت پر قابض ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی آؤ بھگت کی، (ص ۳۰۱)

قلعہ بیدر اگرچہ قدیم الایام سے ہے لیکن شہر بیدر جس کا پورا نام احمد آباد بیدر ہے سلطان احمد شاہ بہمنی ۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۵ء کا آباد ساختہ ہے۔ بیدر کا اس عہد سے پہلے بحیثیت شہر وجود نہیں تھا۔ راسا کے خلاف یہ ایک وزنی اعتراض ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اس بادشاہ کا ذکر ہے جس کو راسا اپنے الفاظ میں 'حبشی بادشاہ' بیان کرتا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ دکن میں مسلمانوں کی آمد علاء الدین خلجی ۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۵ء کی فتوحات کے بعد ہوتی ہے۔ اور حبشیوں کو ملک عنبر و دیگر حبشی امرا کی وجہ سے سترھویں صدی میں عروج حاصل ہوتا ہے۔ اگر ٹاڈ صاحب راجپوتوں کی قصیدہ خوانی سے ہٹ کر واقعات کو ان کی صحیح روشنی میں دیکھتے تو یہ بعض امور جن کو ہم نے اوپر درج کیا ہے راسا کی مجعولیت طشت از بام کر دیتے

اے ۔ کے ۔ فوربز

ٹاڈ کی غیر تنقیدانہ رائے کے مقابلے میں اے ۔ کے ۔ فوربز کے خیالات بھی راسا کے متعلق یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ جو میں سمجھتا ہوں صداقت کے بہت قریب ہیں۔

فوربز کو سرزمین گجرات کے ساتھ وہی تعلق ہے جو ٹاڈ کو راجپوتانے کے ساتھ ہے۔ اس کی مساعی اس خطے کے راجپوت خاندانوں کی تاریخ کے واسطے دیر تک مبذول رہیں۔ اور کتاب راس مالا اس کی ان کوششوں کا نتیجہ ہے جو ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوئی۔ بعض تاریخی امور کے سلسلے میں فوربز نے راسا سے بھی کام لیا ہے۔ وہ اگرچہ اس کتاب کو جعلی تو نہیں کہتا مگر اس کے بیانات کو صحیح بھی نہیں مانتا اور مجبوراً اسے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں الحاق ضرور ہوا ہے۔ میں یہاں اس کی رائے کا ترجمہ دے دیتا ہوں:-

"یہ ضرور ہے کہ ہم چند کی نظم کے متعلق اس کی رنگینی اور دلاویزی کے باوجود بڑی احتیاط کے ساتھ گفتگو کریں۔ بھاٹ تاریخ نگاروں میں اس کو اول درجے کی شہرت حاصل ہے اور اس کی نظم ان تمام خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ مشخص کی جا سکتی ہے جو اس جماعت کا خاص شیوہ ہے۔ اس کو ایک سنجیدہ راوی کی حیثیت سے ہرگز ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ چوہانوں کا بھاٹ کہا جا سکتا ہے۔ اگر بادۂ ارغوانی یا کم از کم خاندانی رقابت اور معرکہ آرائیوں کی شراب سے بدمست نہ ہو گیا ہو

اس کا متن اس قدر مسخ ہو چکا ہے کہ بعض وقت بالکل مہمل اور بے معنی بن گیا ہے۔ مگر جہاں مطلب صاف ہے وہاں اصل عبارت کو جو رنگ آمیزی کی تہ میں لپیٹ دی گئی ہے شناخت کرنا نہایت دشوار ہے۔ یہ ملمع اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ بعض اوقات تمام کتاب کی اصلیت کے متعلق شک پیدا ہونے لگتا ہے۔ چند کی روایت کے مطابق بھیم دیو ثانی پرتھی راج چوہان کے ہاتھ سے مارا گیا ہے۔ حالانکہ درست یہ ہے کہ وہ پرتھی راج سے بہت برسوں بعد تک زندہ رہا اور موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ راسا میں گجرات کے خاندانوں کے نام بعض ایسے وقائع کے تعلق میں لیے گئے ہیں جو دیگر روایات کی رو سے ان خاندانوں کے بانیوں کے زمانے سے سینکڑوں سال قبل واقع ہوئے ہیں۔

کتاب کے خلاف بدظنی پھیلائے بغیر پہلے غیر تاریخی بیان کی تاویل یہ فرض کرنے سے ہو سکتی ہے کہ چند کو اپنے آقا اور ہیرو کی ستائش گری کے لیے بڑا تردد اور اہتمام تھا۔ علیٰ ہذا دوسرے بیان کے جواب میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا خاندان اگرچہ شاعر کے بیان کردہ زمانے میں موجود نہیں تھے مگر چند کے زمانے میں تو تھے لیکن اس امر کا کیا جواب ہو سکتا ہے اگر مثلاً کہا جائے کہ چند نے پیر میدھ کے گوہلوں کے جن معرکہ آرا کارناموں کو شہرت دی ہے۔ ان کے متعلق یہ ثابت ہو گیا ہے کہ شاعر کے عہد سے تقریباً ایک صدی بعد تک پیرمیدھ پر کسی گوہل کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ یہی اندیشہ ہے کہ اس تالیف کے متعلق جو چند کے نام سے مشہور ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ بحیثیت مجموعی وہ چند کی تالیف نہیں اور اس امر کی دریافت کے بعد بھی اصلی حصے کو نقلی سے جدا کرنا یا اس نقلی کو کسی خاص عہد کی طرف

منسوب کرنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ (راس مالا صفحہ ۲۲۹-۲۳۰ جلد اول مرتبہ رالنس ۱۹۲۴ء)

جون بیمز

لسانیات کے عالی جاہ ماہر جون بیمز[1] کا نام راسا کے سچے خادم کی حیثیت سے ایک عرصے تک یادگار رہے گا۔ ان کی مشہور کتاب ہندوستانی آریائی زبانوں کی تقابلی صرف و نحو ایک بلند پایہ تصنیف مانی جاتی ہے راسا کے سلسلے میں ان کا نام سرعنوان لکھنے کے قابل ہے۔ بیمز صاحب ان چند علما میں سے ہیں جن کی تحریک پر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس تالیف کی طباعت کو اپنے ذمے لیا۔ اور اس کی ترتیب کا قرعہ بھی ان کے نام پر نکلا۔ اس کے علاوہ راسا کی داستانوں کے منظوم و منثور تراجم بھی جو مختلف علمی رسالوں میں شایع ہوتے رہے۔ ان کے قلم کے منت پذیر ہیں۔ بدقسمتی سے ہم ان کی تمام مساعی سے جو اس عنوان کے ذیل میں عمل میں آئی ناواقف ہیں۔ تاہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ چودہ سال تک اس دشت کی سیاحی کرتے رہے ہیں۔ ذیل میں بعض ایسے مضامین کی فہرست درج کی جاتی ہے جن تک ہماری دسترس ہوئی ہے:-

(۱) پرتھی راج راسو کی پہلی داستان کا ترجمہ صفحہ ۲۶۹-۲۸۲۔ انڈین انٹیکوری ماہ ستمبر ۱۸۷۳ء۔

(۲) چند بردائی کے رزمیہ کی پہلی داستان۔ منتخب حصوں کا ترجمہ

---

[1] John Beams

ص ۲۶-۴۲ ج ۱ - س - ب سنہ ۱۸۷۲ء

(۳) چند بردائی کی صرف و نحو کا مطالعہ ص ۹۱-۱۲۵ ج ۱ - س - ب سنہ ۱۸۷۳ء

(۴) راسا کے پہلے تیرہ چھندوں کا منظوم ترجمہ ص ۱۹-۳۱۶ - انڈین اینٹیکوری ۴ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ء (ماخوذ از ج - ۱ - س - ب)

(۵) چند کی نظم پرتھی راج راسا کی داستانوں کی فہرست ص ۲۰۴ ج ۱ س - ب سنہ ۱۸۷۲ء -

راسا کی درست قرارت اور صحیح مفہوم حاصل کرنے کے لیے جن جن دشوار مراحل کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ہم اس کی کہانی بیمز صاحب کی زبانی یہاں سناتے ہیں :-

"پرتھی راج راسا کی اُنیسویں داستان کے میرے ترجمے پر مسٹر گروز کی سخت نکتہ چینی اور بعد میں اس سے دست برداری کے کے واقعے کے بعد میں اس امر کا اظہار کرنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک ایسی ساخت کی نظم کے ترجمے میں جیسی کہ راسا ہے کامل صحت کی پابندی اختیار کرنا نہایت دشوار ہے۔ اس نظم کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے ابیات عام طور پر اسمار کی ناتمام شکل کی لڑی پر شامل ہیں جن میں تصریفی لاحقے یا حالت صرفی کی کوئی علامت موجود نہیں۔ ایسی زبانوں میں جو اصول کی پابندی سے آزاد ہیں جملے میں الفاظ کی ترتیب ہی مطلوبہ معانی کا سراغ مہیا کرتی ہے۔ چند کے ہاں یہ حالت نہیں۔ اس کے الفاظ جس ترتیب سے نظم میں بندھے ہیں۔ اگر اسی ترتیب میں رہنے دیے جائیں تو ان سے مدعا برآری معلوم۔ بلکہ بعض حالات میں تو ان الفاظ کی ترتیب خواہ کتنی ہی کیوں نہ بدلی جائے۔ لیکن بقول شاعر ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہی اپنے عالم تقریر کا

مطالب و معانی کی طرف سے نامرادی سے سابقہ پڑتا ہی۔ البتہ جب افعال کا استعمال ہوتا ہی۔ ان سے صیغے کی حالت کا علم ہو جاتا ہی۔ مثلاً ماضی مطلق میں واحد مذکر کی علامت 'یو' ہی۔ واحد مؤنث کی 'ئی' جمع مذکر کی 'ئے'، اور جمع مؤنث کی 'ئیں' ہی۔ مگر اکثر اوقات تینوں ضمائر اور صیغے ایک ایسے فعل کے ساتھ جو 'ی' پر ختم ہوتا ہی۔ مثلاً کری۔ دیکھی وغیرہ بڑی بدسلیقگی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمیں دو اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہی۔ ایک تو ایسے مندرس الفاظ کا استعمال جو نہ سنسکرت کے مادوں سے علاقہ رکھتے ہیں اور نہ جدید السنہ میں ان کا سراغ چلتا ہی۔ ساتھ ہی وزن کی خاطر سے مزید علیہ حروف کا داخلہ مثلاً ت۔ سو۔ ھ جو معنے کے لباس سے قطعاً معرا ہیں۔

دوسری ایک بڑی دشواری جو راسا کے مترجم کو قدم قدم پر محسوس ہوتی ہی یہ ہی کہ اس کے الفاظ انگریزی کی طرح علیحدہ علیحدہ مرقوم نہیں ہوتے الفاظ کی قطاریں ایک دوسرے کے ساتھ دوش بدوش کھڑی ہیں۔ جن کے درمیان کوئی بیاض نہیں چھوڑا گیا۔ اب ان الفاظ کی مناسب تقسیم میں کہ ایک لفظ کہاں ختم ہوا اور دوسرا کہاں سے شروع ہوا سخت سے سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہی۔ ان حقائق پر نظر کرتے ہوئے میں خیال کرتا ہوں کہ میں زیادہ غلطی کا مجرم نہیں مانا جاؤں۔ اگر اپنے نقادوں سے یہ التماس کروں کہ مجھے نرمی کے ساتھ یہ اطلاع دے دیں کہ میں کہاں کہاں غلطی کا مرتکب ہوا ہوں۔ بجائے اس کے کہ مجھ پر اس زبان سے جہالت کا

الزام عاید کیا جائے جس کا میں نے چودہ سال کی عمر آزمائش تک برابر مطالعہ کیا ہے۔ اور جس کی اشکال پر مجھ کو بھی اسی قدر دسترس حاصل ہے جتنی کسی اور کو۔

حال ہی میں مجھے اجمیر کے ایک عیسائی مبلغ کی زبانی معلوم ہوا کہ راجپوتانے کے پیشہ ور بھاٹ بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ چند کی نظم کا عام مفہوم سمجھنے کے سوا اس کے گہرے مطالعے سے قطعاً قاصر ہیں۔

اس ڈھیلی ڈھالی اور لاپروایانہ قدیم انداز ترکیب کا راز صرف اسی وقت کھل سکتا ہے جب ہماری تحقیقات اس وسیع اور قدیم زبان کے متعلق جس کا صرف ایک پہلو راسا وا انکشاف کر رہا ہے۔ مضبوط اساس پر قایم ہو جائے گی اور اسی مقصد پر نظر رکھتے ہوئے ہم میں سے بعض اپنی فرصت کا وقت اس پر صرف کر رہے ہیں۔

میرا ذیل کا منظوم ترجمہ بحالت موجودہ شاید قبل از وقت ہے تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اس کٹھن ہم میں کچھ نہ کچھ امداد کا ثمر ضرور دے گا اور شاید ان اصحاب کے حق میں رہبر ثابت ہو جو زمانہ مستقبل میں تنقید کے اسلحہ سے جو آج ہمیں نصیب نہیں مسلح ہو کر اس مضمون پر ہاتھ ڈالیں گے۔ پندرھویں صدی کے علما ہمارے عہد کے مقابلے میں لاطینی اور یونانی السنہ سے بہت کم واقف تھے تاہم دنیا اراسمس اور ریشلن کی ایک حد تک ضرور ممنون ہے۔ مجھے اور میرے معاصرین کو علم و فضیلت کی میزان میں خواہ کتنا ہی بے وزن کیوں نہ تولا جائے مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم ایسی بنیاد کی داغ بیل ڈال رہے ہیں جس پر آیندہ کا فاضل جس کو

بہتر ذرائع نصیب ہوں گے اپنی تعمیر کھڑی کرنے سے اعراض نہیں کرے گا۔"
(جرنل ا۔ س۔ ب۔ صلا ۴۲ سنہ ۱۸۷۱ء)

حقیقی علم پرستی کے والہانہ شغف کے ساتھ جب بیمز جیسے فاضل کو راسا کی بھول بھلیوں کے دلدل میں پاگل دیکھا جاتا ہے تو ہمارا دل اس بدبخت بھاٹ کو کوسنے کو چاہتا ہے جس نے یہ گورکھ دھندا کھڑا کر کے ایسے علمی جہاتا کے ساتھ علمی مذاق کی بنیاد ڈالی جس کی لغویتوں کے پیچھے اس کی قیمتی زندگی کے چودہ سال قربان ہوئے۔ وُلرؔ کے اشاروں کنایوں کے باوجود بیمز صاحب کا رسّی کو سانپ سمجھ لینا اور لکیر پیٹنا بجائے خود ایک معمّا ہے۔ مگر اس زمانے میں مستشرقین مغرب میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جو راسا کی پاکدامنی پر ایمان کامل رکھتی ہے۔

اے۔ ایف۔ آر۔ ہرنلے

بیمز کے ساتھ ڈاکٹر رُڈولف ہرنلے[1] قابل ذکر ہیں جو جو نرائن کالج بنارس میں سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گوناگوں فضیلتوں کی بنا پر اپنے عہد کے مستند علما میں شمار ہوتے ہیں۔ ہندی زبانوں کے علاوہ مسلمانی زبانوں سے بھی واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مستند لسانیات اور ماہر مسکوکات ہیں۔ لسانیات ہند ان کا خاص میدان ہے۔ اور یہی ذوق انھیں چند کے آستانے پر کشاں کشاں لاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیمز کے بعد راسا کا ایک حصہ سوسائٹی کے لیے ترتیب بھی دیا ہے

[1] Dr. A. F. R. Hoernle

اور حواشی وغیرہ بھی کثرت سے لکھے ہیں لیکن بدقسمتی سے میں اس میدان میں ان کی کارگزاری سے ناواقف ہوں ۔ انڈین انٹیکویری میں ان کے دو مضمون میری نظر سے گزرے ۔ پہلا راسا کی ستائیسویں داستان ریوا تٹ پرستاو کا ترجمہ جو جنوری ۱۸۷۲ء میں شایع ہوا ۔ دوسرا چند کی بعض عروضی خصوصیات جو اپریل سنہ مذکور کی اشاعت میں نکلا ۔

راسا کی نویں داستان "حسین کتھا" پر ڈاکٹر صاحب کا ایک نوٹ ہے جو راسا کے بنارس ایڈیشن میں اس کتھا کے اختتام پر نقل ہوا ہے ۔ اس سے چند کی ثقاہت کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی رائے کا اندازہ اور اسلامی "تاریخ" کے ساتھ ان کی غیر عالمانہ روش کا پتہ لگ جاتا ہے وہ نوٹ درج ذیل ہے :۔

" ۱۹۵ ۔ حسین خاں میر حسین خاں کا فرزند معلوم ہوتا ہے جو شہاب الدین کا حملۂ ہند کا جیسا کہ آٹھویں داستان میں بیان ہوا ہے ۔ ابتدائی باعث ہے ۔ میر حسین یا (جیسا کہ باختلاف شاہ حسین یا حسین خاں کہا گیا ہے شہاب الدین کا عم زاد (بندھوا) بیان ہوا ہے ۔ یہ ایک ممتاز جنگ جو ہے جو غزنین کے دربار سے تعلق رکھتا ہے ۔ بادشاہ کے پاس چترریکھا نامی ایک پری زاد محبوبہ تھی اس کا قصہ دسویں داستان میں مذکور ہے ۔ یہ حسینہ جس کی عمر پندرہ سال کی تھی فن موسیقی میں نہایت باکمال تھی اور سلطان کو اس سے بے حد محبت تھی ۔ بالآخر حسین اس پر اور وہ حسین پر عاشق ہوگئی ۔ ایک دن بادشاہ نے حسین کو بلا کر اس کی بے وفائی اور نمک حرامی پر ملامت کی مگر اس کے باوجود چترریکھا کے ساتھ حسین کے تعلقات جاری رہے نتیجہ یہ ہوا کہ اسے غزنین کو خیرباد کہنا پڑا ۔ حسین اپنے عیال و اطفال مال

دولت نیز چترریکھا کو لے نکلا اور بھاگ کر پرتھی راج کے پاس ناگور آگیا۔ کسی قدر تردد کے بعد پرتھی راج اس کے ساتھ بڑی خاطر سے پیش آیا اور اپنی زیر حمایت لے لیا۔ یہ خبر سن کر شہاب الدین غضب ناک ہوا۔ اس نے فوراً حسین کے پاس ایک قاصد چترریکھا کی طلبی کے واسطے بھیجا اور اس کو ہدایت کی کہ اگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے تو پرتھی راج سے حسین کے اخراج کی درخواست کرے۔ حسین نے چترریکھا کی سپردگی سے صاف انکار کردیا۔ ادھر پرتھی راج نے جواب دیا کہ ایسا شخص جو میری پناہ میں آگیا ہو کسی طرح حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ اس جواب کے وصول ہونے پر شہاب الدین نے ہندوستان پر حملے کی تیاریاں کردیں۔ ادھر پرتھی راج بھی جنگ کے لیے آمادہ ہوگیا۔ آنے والی جنگ میں حسین نے کارہائے نمایاں کیے اور مردانہ وار جان دی۔ چامنڈ رائے نے شاہ کو گرفتار کرلیا۔ اور لڑائی پرتھی راج کی فتح پر ختم ہوگئی۔ پانچ روز کے بعد شاہ کو رہا کردیا گیا۔ وہ جاتے وقت حسین کے فرزند غازی کو بھی اپنے ساتھ غزنین لے گیا۔ اور زبان دے گیا کہ ہندوؤں کے خلاف کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ یہ کہنا فضول ہے کہ شاہ نے اپنے قول کا پاس نہیں کیا اور اس شدید عداوت کی آگ جو ان واقعات سے اس کے دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ پرتھی راج کے قتل اور اس کی سلطنت کی کامل بربادی کے وقت تک ہرگز ہرگز ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ بادشاہ کی گرفتاری جو یہاں مذکور ہے ان سات گرفتاریوں میں سے ایک ہے جن میں وقتاً فوقتاً پرتھی راج نے شاہ کو گرفتار کیا ہے۔ اس کی قید کا پہلا موقع حاشیہ ۱۹۷ میں مذکور ہے۔ دوسری گرفتاری کا یہاں مذکور ہے۔ چترریکھا حسین کی نعش کے ساتھ زندہ دفن ہوگئی۔

یہ حسین خاں (غازی ؟) جس کا یہاں ذکر آیا ہے اور جسے شہاب الدین اپنے ساتھ واپس غزنین لے جاتا ہے۔ اگر حسین کبیر کا فرزند ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں وہ پرتھی راج کے پاس بھاگ آیا ہے۔ ان میں حسین کبیر بلا شبہ وہی شخص ہے جسے طبقات ناصری میں بار بار ناصر الدین حسین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (ترجمہ راورٹی صفحہ ۳۴۳ صفحہ ۳۶۷ صفحہ ۳۶۵) وہ ملک شہاب الدین محمد کا خلف اکبر ہے اور یہ شہاب الدین محمد سلطان شہاب الدین کے باپ سلطان بہاء الدین سام کا چھوٹا بھائی ہے۔ اس لیے حسین کبیر جیسا کہ چند نے درست کہا ہے شہاب الدین کا عم زاد تھا۔ طبقات میں بے شک اس ناصر الدین حسین کے تعلق میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے چچا علاء الدین حسین جہاں سوز کے تخت پر جب وہ سلطان سنجر سلجوقی کی قید میں تھا غاصبانہ قبضہ کر لیا اور علاء الدین کے حامیوں نے اس کی رہائی اور واپسی پر اسے قتل کر ڈالا (صفحہ ۳۶۶) لیکن اس قصے کی تردید فعلاً تمام مسلمان مورخین کے اس بیان سے ہو جاتی ہے جب وہ علاء الدین کے فوراً بعد اس کے فرزند کا ذکر کر دیتے ہیں۔ (راورٹی کا ذیلی حاشیہ صفحہ ۳۶۴) دوسرے اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ غاصبانہ قبضہ کرنے والا ناصر الدین حسین کا باپ (شہاب الدین) محمد ہو سکتا ہے جو علاء الدین کا چھوٹا بھائی ہے نہ خود حسین۔ اس کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ ان چاروں بھائیوں میں سے سیف الدین سوری۔ بہاء الدین سام اور علاء الدین حسین یکے بعد دیگرے غور کے تخت پر حکمراں ہوئے۔ اس لیے علاء الدین کے حبس و قید کے زمانے میں قدرتاً چوتھا بھائی شہاب الدین محمد غور کے تخت کا حق دار ہو سکتا ہے اور وہی تخت نشینی کے لیے جد و جہد کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف طبقات کو اس موقع پر باپ بیٹے میں التباس ہو گیا جیسا کہ اور موقعوں پر بھی اس کو

تشابہ ہوا ہے۔ (یعنی ضیاء الدین محمد کے سلسلے ہیں) تیسرے ناصر الدین حسین کے چال چلن کا یہ بیان کہ " وہ عورتوں اور کنواریوں کا بڑا شوقین تھا اور سلطان کی حرم میں سے کئی کنیزوں اور باندیوں کو اپنے تصرف میں لے آیا تھا (طبقات ص ۲۶۲) چند کے اس قصے سے جس میں چتر ریکھا کے ساتھ اس کے معاشقہ کا ذکر ہے۔ بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چند نے حسین کے انقلابات زندگی کی رام کہانی صحیح صحیح بیان کر دی ہے۔ ہم یہ بھی اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ صاحب طبقات نیز دیگر مسلمان مورخین اسی حسین (نیز غوری شاہی خانوادہ) کے ایک مورث اعلیٰ کا قصہ سناتے ہیں جس کا نام بھی حسین یا حسن ہے وہ ہندوستان بھاگ آتا ہے اور کچھ عرصے تک دہلی میں رہتا ہے ص ۳۲۱ ص ۳۲۲ ص ۳۲۲) یہ قصہ غالباً بھولی بھٹکی یاد ہے۔ پرتھی راج کے ہاں حسین کے گریز کی جس کا راوی چند بردائی ہے۔" (ص ۴۲۳ پرتھی راج راسا مرتبہ موہن لال وشنو لال پنڈیہ بنارس ۱۹۱۳ء)

ڈاکٹر صاحب کے اس نوٹ پر چند کے فریب خوردہ مرتبین راسا کا تبصرہ بھی قابل غور ہے۔ وہ حسین کتھا کے خاتمے میں لکھتے ہیں:-

" یہ داستان ہندوستان کی تاریخ میں ہندوؤں کی حکومت کے زوال اور اسلامی سلطنت کے قیام کے اصلی اور حقیقی اسباب سے بحث کرتی ہے مگر تمام مسلمانی تاریخوں میں اس صداقت کو چھپایا گیا ہے اسی لیے اس داستان کے بیان کردہ واقعات کا تذکرہ اسلامی تاریخ میں ملنا دشوار ہے۔ چند بردائی اگر یہ داستان نہ لکھ گیا ہوتا تو ہمیں صرف وہی باتیں معلوم ہوتیں جو اسلامی تواریخ میں درج ہیں۔ چند کو اگرچہ پرتھی

راج اور ہندوؤں کا طرف دار کہا جا سکتا ہے لیکن اس نے مسلمانوں کی طرح مخالف قصوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کے مقابلے میں اس نے تفصیلی بیانات دیے ہیں۔ جن سے مواد غیر متعلقہ کو حذف کرکے تاریخی حصّہ بآسانی جُدا کیا جا سکتا ہے۔ حسین کی سرگزشت حیات اس داستان کا موضوع ہے وہ کون تھا مسلمانی مورخ اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتے لیکن اس بارۂ خاص میں مغربی علما نے بہت تلاش و جستجو کی ہے۔ یاد رہے کہ جب خود اس داستان کے ہیرو حسین کا سراغ اسلامی تاریخ میں نہیں ملتا تو دیگر جنگ آزماؤں کے اسمار و حالات جو اس قصّہ میں مذکور ہیں کیوں کر مل سکتے ہیں۔ اس باب میں زیادہ خامہ فرسائی کرنے کے بجائے ہم ڈاکٹر ہرنلے کا تبصرہ درج کرتے ہیں جس سے اس حسین کا پتہ اور چند کے اس کو سلطان کا رشتہ دار بیان کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔" (صـ۴۲۳ــ راسا)

راسا کے مرتبین کے مدعیانہ مگر بے بنیاد تبصرہ پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ البتہ ڈاکٹر ہرنلے کی تحقیقات پر ہم سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اسلامی تاریخ و روایت سے بہت کم تعلق رہا ہے۔ اسی لیے چند کی اس خیالی مخلوق حسین خاں کی جستجو میں ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں مثلاً :۔

(۱) چند حسین خاں کو میر حسین کا فرزند بتاتا ہے۔ اول تو باپ بیٹوں کے نام عام طور پر مختلف ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے ایک میر کا فرزند ایک خان کس طرح ہو سکتا ہے؟ غور دو غزنین میں ان ایام میں میر اور خاں کے الفاظ اسمار کے ساتھ لائے جانے کا دستور نہیں تھا۔ خان ترکی

لفظ ہے جس کے معنے بادشاہ کے ہیں اور سلاطین ترکستان کا لقب بھی ہے
یہ ایلک خانی یا لوگ افراسیابی ہیں جن کے نام کے ساتھ پہلے پہل
یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے مثلاً ایلک خاں۔ قدر خاں۔ طمغاج خاں وغیرہ
خاقانی ؎

خراساں گر حرم بودے بہیں کعبہ ملک شاہش
سمرقند ار فلک بودے بہیں اختر قدر خانش

غوریوں میں بہرحال اس لفظ کو یہ حیثیت نہیں ملی۔

(۲) حسین کی تلاش میں ڈاکٹر کو طبقات میں شہاب الدین کا ایک عم زاد
ملک ناصر الدین حسین خلف شہاب الدین محمد مادیتی مل گیا اور یہ شخص ان
کی فال میں چند کا مبینہ حسین خاں بن میر حسین برآمد ہوا۔ لیکن دونوں
کی ولدیت کے اختلاف کی طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ نہ انھوں
نے اس امر کی پروا کی کہ شہاب الدین اور ناصر الدین حسین کی عمروں
میں اگرچہ وہ آپس میں عم زاد ہیں۔ بڑا فرق ہے یعنی ناصر الدین سلطان
شہاب الدین غوری کی تخت نشینی سے جو ۵۶۹ھ ۱۱۷۳ء میں ہوتی ہے۔ کم
از کم بیس سال قبل قتل کر دیا جاتا ہے۔ حسین کا زمانہ معلوم کرنے کے لیے
ہمیں اس کے چچا علاء الدین جہاں سوز ۵۴۷ھ و ۵۵۶ھ کے بعض حالات
زندگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

(۳) علاء الدین غوری جہاں سوز بہرام شاہ بن مسعود غزنوی کو
ہزیمت دے کر غزنین پر قابض ہوتا ہے اور اس فتح سے اس قدر مغرور
ہو جاتا ہے کہ ملوک غور جو اجناس سالانہ خراج میں سلطان سنجر سلجوقی
کو ہمیشہ سے دیتے آئے تھے یک قلم بند کر دیتا ہے۔ یہ خودسری دیکھ کر

سلطان سنجر بہ قصد گوشمال غور کی طرف بڑھتا ہے اور اودبہ پر مقابلہ ہوتا ہے عین جنگ کے وقت ۶۰۰۰ سوار جن میں ترک، غز اور خلج شامل تھے علاء الدین سے بے وفائی کر کے سنجر کے شریک ہو جاتے ہیں جس سے غوریوں میں بد دلی پھیل جاتی ہے۔ تاہم وہ لڑتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں۔ علاء الدین پکڑا جاتا ہے اور قید میں رکھا جاتا ہے۔ بقول نظامی عروضی یہ جنگ جس میں خود عروضی بھی شریک تھا سنہ ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء میں واقع ہوتی ہے سلطان سنجر سنہ ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء میں غزوں کے ہاتھوں اسیر ہوتا ہے۔ اس لیے علاء الدین غوری کی قید کا زمانہ سنہ ۵۴۶ھ و سنہ ۵۴۸ھ کے مابین محصور ہو سکتا ہے۔ یہ زمانہ ہے جب امرائے غور آئے دن کے فسادات سے تنگ آکر ملک ناصر الدین حسین کو مادین سے بلا کر فیروز کوہ کے تخت پر بٹھاتے ہیں۔ (راورٹی صفحہ ۳۶۳) لیکن جیسے ہی علاء الدین کی واپسی کی خبر پہنچتی ہے علاء الدین کی کنیزیں جن پر ناصر الدین بجبر متصرف ہوا تھا اس کا کام تمام کر دیتی ہیں۔ سنہ ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء علاء الدین کی واپسی اور ناصر الدین حسین کے قتل کا سال ہے۔ اس واقعہ سے بیس سال بعد شہاب الدین غوری سنہ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں غزنین کے تخت پر آتا ہے۔ اس لیے ناصر الدین حسین کا غزنین میں آنا اور جیتر رکھا سے معانقہ کرنا بالکل ناممکن ہے۔

(۴) ڈاکٹر صاحب مصنف طبقات سے بدگمان ہیں اور تاریخی امور میں قیاس کو دخل دے کر فرماتے ہیں کہ چونکہ علاء الدین کے بعد دیگر مورخین اس کے فرزند سیف الدین کا ذکر کرتے ہیں اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب طبقات اس موقع پر غلط مبحث کر گیا ہے۔ حالانکہ خود ڈاکٹر کا ماخذ یعنی راورٹی اپنے ذیلی حاشیے میں صاف کہہ رہا ہے کہ:-

"ناصر الدین کا ذکر اگرچہ دیگر مصنفین نے نہیں کیا جو علاءالدین کے فوراً بعد اس کے فرزند کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ناصر الدین نے یقیناً تخت پر قبضہ کر لیا تھا اور علاءالدین کے قید کے زمانے میں حکومت کرتا رہا (صلا ترجمہ طبقات)

(۵) یہاں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے۔ ناصر الدین حسین کا ایک چھوٹا بھائی سیف الدین سوری ہے جو اپنے باپ شہاب الدین محمد کی وفات پر حکومت مادین پر سرافراز ہوتا ہے۔ اس سیف الدین کی دختر شہاب الدین غوری کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔ (ص۲۲۲) یہ واقعہ بھی ہمارے اسی عقیدے کی تائید کرتا ہے کہ ناصر الدین اور اس کا چھوٹا بھائی سیف الدین بلحاظ عمر شہاب الدین غوری سے بہت بڑے ہیں۔

جس طرح کسی شخص کی چیز گم جاتی ہے اور وہ ہر کس و ناکس پر شبہ کی نظر ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس تحقیقات کے دوران میں اسی قسم کی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ موصوف نے ہر حسن و حسین پر جو غوریوں میں انھیں مل سکا اپنی مشتبہ نظریں جما دی ہیں حتیٰ کہ غوریوں کا جد امجد بھی ان کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکا۔ انھوں نے کسی کے سال و سنین کی پروا کی بلکہ تمام مسلمان مورخین کو بھی سہو و نسیان کا متہم بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ دادِ تحقیق اسی معیار کی ثقاہت پیش کر رہی ہے جو چند اور اس کی تاریخ میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔

ایف - ایس - گروز

مسٹر ایف - ایس - گروز[1] ایم - اے ، بی - سی - ایس ایک اعلیٰ پائے کے نقاد اور چند کے ماہر ہیں - مختلف علمی رسالوں میں ان کے مضامین اور تنقیدیں چھپتی رہی ہیں - ان کا ایک مضمون پرتھی راج راسا کے ابتدائی چھندوں کا منظوم ترجمہ مع نقادانہ شرح ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالہ (ص ۳۲۹ تا ص ۳۴۲، ۱۸۷۳ء) میں چھپا ہے - مسٹر بیمز کے بعض ترجموں پر جیساکہ اوپر دیکھا جاچکا ہے انھوں نے تنقید کی ہے - ادھر ڈاکٹر ہرنلے کے ترجمے پر بھی انڈین اینٹیکویری (ص ۳۳۹، دسمبر ۱۸۷۳ء) میں نقد و تبصرہ کیا ہے -

معلوم ہوتا ہے کہ چند کی نظم کی چیستانی اور معمائی کیفیت جو صرفی پابندیوں سے مطلق آزاد ہے - اس کی پہیلی بوجھنے کا شوق ان کے دل کو گدگداتی رہی ہے - چنانچہ مسٹر بیمز کے ہمنوا ہو کر یہ بھی کچھ اسی قسم کا راگ الاپ رہے ہیں - کہتے ہیں :-

" چند کی تاریخ اس حد تک مغلق اور پیچیدہ ہے اور اس کے جملوں کی ساخت صرفیانہ قواعد سے اس قدر بے نیاز ہے کہ کوئی قاری کبھی بھی یہ یقین نہیں کرسکتا کہ وہ اس کے معانی کو پاگیا ہے - بعض وقت ایک خوش بختانہ روشن ضمیری عبارت کے صحیح مفہوم تک ہماری رہنمائی کرسکتی ہے - بجائے کہ ایک بہتر عالم دنوں تک اس کے حل کے لیے غلطاں و پیچاں رہتا ہے - (انڈین اینٹیکویری ص ۳۳۹ دسمبر ۱۸۷۳ء)

---

[1] F. S. Growse

سر جارج گریرسن[۱]

ان کو لسانیات ہند کا دیوتا کہنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تالیف جائزۂ لسانیات ہندوستان اور اس کی ضخیم مجلدات ان کے علم و فضل کی شاہد عادل ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے مستشرقین کی کانگریس میں بمقام ویانا ہندوستان کے وسطی زمانے کے دیسی ادبیات پر ایک فاضلانہ مقالہ پڑھا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے ۱۸۸۸ء میں اس کا ایک خاص نمبر نکالا اور ۱۸۸۹ء میں اسی کو کتابی شکل میں "جدید دیسی ادبیات ہندوستان" کے نام سے چھاپ دیا۔ چند کی نسبت فاضل موصوف کی رائے ہے:-

"اس شاعر کے کلام کے مطالعے نے مجھے اس کی محاسن شاعری کے مداحانہ جذبات سے معمور کر دیا ہے لیکن مجھ کو شک ہے کہ ایسا شخص جو راجپوتانہ کی زبانوں سے تمام و کمال واقفیت نہ رکھتا ہو، اس کو خوشی کے ساتھ پڑھ سکے گا۔ بہر حال لسانیات کے طالب کے لیے ایک نہایت بیش قیمت دستاویز ہے کیونکہ مغربی محققین کے لیے فی زمانہ آخری پراکرت اور قدیم گوڑی مصنفین کے درمیان کی صرف یہی ایک درمیانی کڑی ہے جو اس وقت موجود اور معلوم ہے۔ اگرچہ موجودہ تالیف کے واسطے یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خالصۃً چند کا کلام ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ اس کلیات میں گوڑی ادبیات کے سب سے اقدم وہ نمونے محفوظ ہیں جن میں ناقص اپبھرنش و سورسینی بھاکاؤں کی ترکیبیں ہیات

؎۱

کے ساتھ موجود ہیں۔ (ودیدیہ تیسی) ادبیات ہندوستان طبع کلکتہ [illegible]

کوی راج شیامل داس جی

راسا کے یہ مغربی نقاد جن کی ثنا خوانی بالآخر سخن ناشناسی ثابت ہوئی اس امر سے بالکل غافل تھے کہ اسی شہر کا ایک عالم جس میں بیٹھ کر ٹاڈ صاحب نے چند کے تیس ہزار اشعار کا ترجمہ کیا تھا ایک ایسا مضمون تیار کر رہا تھا جو راسا کی شہرت کو ہمیشہ کے واسطے گہنا دینے والا ثابت ہوگا۔ اس سے ہماری مراد کوی شیامل داس جی اور ان کا مضمون ہے جو [illegible] کے رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ اس قدر پرزور اور محققانہ تھا کہ راسا کے معتقدین میں اس سے ہل چل مچ گئی۔ فاضل مضمون نگار نے جو فارسی بالخصوص ہندی مآخذ میں وسیع معلومات کے مالک معلوم ہوتے ہیں مختلف پہلوؤں سے اس کتاب کی بے حقیقتی اور مجعولیت کا راز افشا کر دیا۔ انھوں نے اس پر تاریخی اور لسانی اعتراض کیے اور اپنی دلائل کو قدیم تاریخوں، کتبوں اور تانبے پتروں کی امداد سے استحکام دیا۔ یہ مقالہ اگرچہ ایک عرصے تک صدا بصحرا ثابت ہوا تاہم اس سے ایک یہ فائدہ مرتب ہوا کہ راسا کی طرف سے بدگمانی کے علاوہ رفتہ رفتہ ایک ایسی جماعت بھی پیدا ہو گئی جو اس کا مطالعہ کوی جی کے نقطۂ نظر سے کرنے لگی۔

ذیل میں کوی شیامل داس جی کی بعض دلائل کا خلاصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

"یہ مشہور ہندی رزمیہ جس کو علمی حلقوں میں پرتھی راج چوہان کے درباری شاعر چند بردائی کی تالیف مانا جاتا ہے اور جس میں راجہ موصوف کی ولادت سے لے کر موت تک کے حالات درج ہیں۔ میری ناچیز رائے میں کوئی اصلی تالیف نہیں ہے بلکہ چند مذکور کے زمانے سے کئی صدی بعد راجپوتانے کے کسی نامعلوم بھاٹ نے اپنی ذات اور چوہانوں کا اعتبار و وقار قائم کرنے کے لیے جو اس سرزمین کے اصلی متوطن نہیں تھے اور نہ راجپوتانے کے رئیسوں میں کسی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ تیار کیا ہے۔ یہ نظم کوٹھاریا یا بیدلا چوہانوں کے کسی تعلیم یافتہ بھاٹ کے زور طبع کا نتیجہ ہے۔ راجگان میواڑ کی ثنا خوانی میں مبالغے کی حد تک اہتمام ہے اس کی علت غائی صرف یہ ہے کہ لوگ کتاب کے بیانات سے چشم پوشی کریں اور اس کے بینہ واقعات کی صحت تسلیم کرلیں تاکہ راجستان کے باقی راجہ بھی اس کے خلاف معترضانہ لب کشائی نہ کر سکیں۔

(۱) اس خیال میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رزمیہ راجپوتانے میں تالیف ہوا ہے کیونکہ اس میں ایسے الفاظ اور بندشیں کثرت سے ملتی ہیں جو پنگل (برج بھاشا وغیرہ زبانیں) کے برخلاف ڈنگل (مارواڑی زبان) کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مصنف نے ماگدھی یا بھالا بھاشا کی تقلید کی کوشش کی ہے جو اب سے تین صدی قبل تک شاعری کی زبان تھی۔ اسی لیے کثرت کے ساتھ غنہ کا استعمال کیا ہے۔ لیکن ماگدھی اور سنسکرت سے عدم واقفیت کی بنا پر یہ استعمال غلط کیا ہے۔

(۲) اس میں جس قدر تاریخیں دی گئی ہیں بالکل غلط ہیں۔ مثلاً

پرتھی راج کی پیدائش کی تاریخ سمت ۱۱۱۵ بکرمی۔ اس کی تبنیت کی رسم سمت ۱۱۳۰ بکرمی۔ کیماس کی فتح سمت ۱۱۴۰ بکرمی۔ پرتھی راج کا قنوج جانا سمت ۱۱۵۱ بکرمی اور شہاب الدین سے آخری جنگ سمت ۱۱۵۸ بکرمی۔

یہاں ہمیں ان تاریخوں کے تعلق میں کسی قدر بحث ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس نظم میں جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں پرتھی راج اور شہاب الدین کی آخری جنگ کا سال سمت ۱۱۵۸ بکرمی دیا گیا ہے۔ لیکن طبقات ناصری کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ ۵۸۸ھ میں واقع ہوئی ہے جو فی الحقیقت سمت ۱۲۴۸ بکرمی کے مطابق ہے اس طرح راسا کی بیان کردہ تاریخ سمت ۱۱۵۸ ب اور طبقات کی تاریخ سمت ۱۲۴۸ ب میں پورے نوے سال کا تفاوت ہے۔

اب ہم کتابی شہادت سے روگرداں ہو کر ان سنگی کتبوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو علاقۂ میواڑ میں برآمد ہوئے اور ان تانبے پتروں کا بھی ذکر کریں گے جو سوسائٹی کے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

پہلا کتبہ موضع بجھولی علاقۂ میواڑ میں اودے پور سے ایک سو میل کے فاصلے پر پارس ناتھ کے کنڈ سے جانب شمال ہے اور پرتھی راج کے باپ سمیسور دیو سے تعلق رکھتا ہے جس میں راجۂ مذکور موضع ریونا پارس ناتھ کے واسطے وقف کرتا ہے۔ یہ کتبہ کسی مہاجن نے سمت ۱۲۲۶ بکرمی میں تراشا ہے جو ۱۱۶۹ء کے مطابق ہے۔ اس میں چوہانوں کا نسب نامہ بھی درج ہے جو سمیسور دیو پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ پھاگن بدی سمت ۱۲۲۶ ب تک جب یہ کتبہ لگایا گیا تھا پرتھی راج گدی پر نہیں آیا تھا۔

دوسرا کتبہ مینال گڑھ علاقہ میواڑ کے ایک محل کے شمالی دروازے پر کسی بھاؤ برہم کی دھرم سالہ کی تعمیر کی یادگار ہے اور پرتھی راج کے عہد اور اسی سال یعنی سمت ۱۲۲۶ ب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پرتھی راج پھاگن بدی اور چیت بدی سمت ۱۲۲۶ بکرمی کے درمیان گدی پر بیٹھا۔

علاوہ بریں قنوج کے راجہ جے چند کے بعض تانبے پتر ہیں جن پر سمت ۱۲۲۴ ب و سمت ۱۲۲۵ ب ہے (ملاحظہ ہو رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۳۱ بابتہ ۱۸۶۲ء)

جے چند سمت ۱۲۴۹ ب مطابق ۱۱۹۳ء موافق ۵۸۹ھ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے چونکہ شہاب الدین پرتھی راج اور جے چند معاصر تھا اس لیے بوجہ معاصرت ان کے سنین میں مطابقت یقینی ہے۔

(۳) یہاں ان بعض تاریخی مغالطوں کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے جو پرتھی راج راسا کے اعتبار پر راجپوتانے کے تاریخ نگاروں کو ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں تاریخ نویسی کا ایک باقاعدہ ضابطہ تھا۔ لیکن ہندوؤں کے ہاں کوئی ایسا دستور نہیں تھا۔ ان میں اگر کوئی رواج تھا تو بس اسی قدر کہ نسب نامے بنائے جاتے تھے۔ تاریخی وقائع کے ذکر اذکار بھاٹوں کی کتابوں یا مبالغہ آمیز نظموں میں بہت کم ملتے ہیں۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسی کتابوں میں ذکر شدہ نسب نامے سمت ۱۶۰۰ ب سے بعد کے تو کسی قدر قابل اعتماد ہیں سمت ۱۲۰۰ ب اور سمت ۱۴۰۰ ب کے مابین کے اکثر موقعوں پر غلط ہیں لیکن سمت ۱۴۰۰ بکرمی سے قبل کے تو یقیناً

غلط اور خیالی ہیں۔

جب پرتھی راج راسا چند کی تصنیف کی حیثیت سے منظر عام پر نمودار ہوا تو بھاٹوں اور باد فروشوں نے اس کے بیانات کی بنا پر بارھویں صدی بکرمی میں پرتھی راج کا زمانہ قرار دیا۔ مثلاً ہم کہتے ہیں
(۲) راسا کے اس بیان کی بنا پر کہ پرتھی راج کی بہن پرتھا کی شادی راول سمرسی جی والی میواڑ سے ہوئی تھی۔ انھوں نے سمت ۱۱۰۶ بکرمی راول موصوف کی گدی نشینی کا زمانہ فرض کر لیا اور سمت ۱۱۵۸ ب اس کی وفات کا۔ اب سمت ۱۱۵۸ ب کے ساتھ تطابق دینے کے لیے جو پرتھی راج کی معیت میں سمرسی جی کے مارے جانے کا مفروضہ زمانہ ہے۔ ان بھاٹوں نے اپنی کتابوں میں قیاسی طور پر ان تمام راجگان کے سنین وضع کر کے درج کر لیے جو راول سمر سنگھ اور مہکل جی کے درمیان میواڑ کی گدی پر حکمران ہوئے ہیں جن کی کل پشتیں بیس ہوتی ہیں۔ یہی غلطی دوسری ریاستوں کے لیے بھی متعدی ثابت ہوئی چنانچہ اور جگہ بھی اس کا اعادہ ہوا۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ پرتھی راج کی بہن پرتھا کا بیاہ سمر سنگھ جی سے رچایا جانا قدرتی طور پر ناممکن ہے کیونکہ راول سمر سنگھ پرتھی راج کے عہد سے تقریباً ایک صدی بعد گزرا ہے۔ اس کی ہمارے پاس یہ دلیل ہے کہ گمبھیری ندی پر جو چتوڑ کے مشہور قلعہ کے پاس سے گزرتی ہے ایک پل ہے جو اری سنگھ خلف مہارانا لکشمن سنگھ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور مسلمان اسے خضر خاں فرزند سلطان علاء الدین (۶۹۵ھ – ۷۱۵ھ) کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ

انھوں نے سمت ۱۱۲۷ و سمت ۱۱۵۱ بکرمی پرجن جی کچھواہا کی گدی نشینی اور وفات کی تاریخیں فرض کر لیں کیونکہ راسا میں اس راجہ کو بھی پرتھی راج کے معاونوں میں شمار کیا ہے۔ یہ تاریخیں ہرگز صحیح نہیں کہی جا سکتیں۔ اگر یہ صحیح ہو کہ پرجن پرتھی راج کے سامنتوں میں تھا تو اس کا زمانہ سمت ۱۲۴۸ بکرمی کے قریب ہونا چاہیے۔

(د) یہی حالت بوندی سروہی اور جیسل میر کے تاریخ نگاروں کی ہے جنھوں نے راسا کو اپنا خضرِ راہ بنا کر اپنی تاریخوں میں غلط سنین درج کیے ہیں۔

(۴) راسا میں پرتھی راج کی ولادت کا جو زائچہ دیا ہے ہندو تنجیم کے اصول و قواعد کی رو سے سراسر غلط ہے۔ کوی راج جی نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کی اغلاط بیان کی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ بیان نجوم کی اصطلاحات سے پر ہے۔ اس لیے راقم نے اس کا ترک کر دینا ہی مناسب خیال کیا ہے۔

(۵) راسا کی تصنیف کا زمانہ :۔ اس عنوان کے تحت میں کوی راج موصوف فرماتے ہیں کہ اکبر کے عہد سے قبل کی ہندی تصنیفات میں جو راجپوتانے میں وجود میں آئیں اور اب بھی موجود ہیں۔ فارسی و عربی الفاظ کا استعمال نظر نہیں آتا بلکہ وہ سنسکرت برج بھاشا ماگدھی اور راجپوتانے کی بھاکاؤں سے پر ہیں۔ راجپوتانے کے حکمران اکبری عہد میں شاہی دربار میں پہنچے۔ چنانچہ اس کے آخری عہد میں میواڑی اور مارواڑی بھاشا بھی شاہی دربار میں آنے لگے۔ اس عہد سے راجپوتانے کی شاعری میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ شروع ہونے لگا۔ پرتھی راج

راسا پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ آٹھ دس فی صدی ملتے ہیں اور میرا یہ خیال ہے کہ راسا سمت ۱۶۴۰ اور سمت ۱۶۷۰ بکرمی کے درمیان کسی وقت لکھا گیا ہے۔ اس کی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ ہمیر کادیہ جو سمت ۱۵۴۰-۴۲ بکرمی کی تالیف ہے۔ ہمیر چوہان اور اس کے بزرگوں کی معرکہ آرائیوں کے قصے بیان کرتا ہے۔ اس تالیف میں پرتھی راج اور شہاب الدین غوری کے مابین جنگ کی جو تفصیل دی گئی ہے وہ راسا کے بیانات سے مطابق نہیں۔ نہ ان دونوں نظموں کے بیان کردہ نسب نامے ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ یہ امر قرین عقل ہے کہ ایک معیاری پایہ کی کتاب جیسی کہ پرتھی راج راسا ہے اگر ہمیر کادیہ سے مقدم ہوتی تو یقینی ہے کہ موخر الذکر تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں اس سے خوشہ چینی کرتی۔

اب میں اس امر کی صراحت کرتا ہوں کہ یہ کتاب سمت ۱۶۴۰ بکرمی کے بعد لکھی گئی ہے۔ راول سمر سنگھ کے نام پر مصنف نے راجگان میواڑ کی حد سے بڑھ کر تعریف و توصیف کے سلسلے میں بعض تاریخی واقعات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ جن میں سے دو توصیفی جملے قابل ذکر ہیں:-

(۱) سلطان گرہنر موکھن (سلطان کو قید کر کے آزاد کرنے والا)

(۲) سلطان مان ملن (سلطان کا غرور ڈھانے والا)

(۱) اس تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہے جس میں مہارانا سنگرام سنگھ (رانا سانگا) نے مالوے کے آخری پادشاہ سلطان محمود کو سنہ ۹۲۴ھ / ۱۵۱۰ء میں اسیر کر کے بعد میں رہا کر دیا تھا۔

(۲) کنایہ ہے سلاطین گجرات کی طرف جن کو رانا نے شکست دی تھی اور ان کے علاقے کو تاراج کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ راسا کی تالیف

سمت ۱۵۷۵ب کے بعد کسی وقت عمل میں آئی ہے اور اس میں کثرت سے عربی فارسی الفاظ کا استعمال یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ ایسے وقت میں وجود میں آئی جب راجپوتانے کے بعض شاہی دربار سے تعلق میں آکر اپنی زبان میں ان غیر زبانوں کے الفاظ داخل کرنے لگے ہیں۔ اب میں یہ واضح کرتا ہوں کہ اس کی تصنیف سمت ۱۶۷۰ب سے قبل کسی وقت ہوئی ہے۔

دلی کتھا پرستاو میں شاعر ایک پیشین گوئی کرتا ہے (III ۳۱) جس کا مقصد ہے کہ سمت ۱۶۷۰ بکرمی میں ہندو دلی کا مالک دلی کو فتح کرے گا۔ اس پیشین گوئی سے ظاہر ہے کہ یہ رزمیہ اس تاریخ سے قبل لکھا گیا ہوگا اور غالباً سمت ۱۶۷۱ (۱۶۱۴ء) سے بھی قبل کیونکہ اسی سال مہاراجہ امر سنگھ اور شہنشاہ جہانگیر کے درمیان شہزادہ خرم کی معرفت ایک عہد نامہ مرتب ہوا ہے۔ اس سمت کے بعد مذکورہ صدر پیشین گوئی کی نہیں جا سکتی کیونکہ اس وقت تک رانایان میواڑ دہلی کی فتح کا خواب اپنے سر سے نکال چکے تھے بلکہ رانا پرتاب سنگھ سمت ۱۶۵۸ب (۱۶۰۱ء) کے عہد ہی سے انھوں نے سر منڈانا، دھات کے برتنوں میں کھانا، تلوار باندھنا، جلوس کے پیچھے نقارہ رکھنا وغیرہ رسوم اس قسم کے ساتھ ترک کر دی تھیں کہ دہلی پر فتحیابی کے بعد پھر ان کو تازہ کیا جائے گا۔

رانایان میواڑ کے شاندار کارنامے جو ان سے سمت ۱۶۲۴ تا سمت ۱۶۷۰ کے درمیانی زمانے میں ظہور پذیر ہوئے نیز مہارانا سنگ رام اور اس کے اجداد کی ہیبت رفتہ رفتہ عوام الناس کے دلوں میں اس قوی امید کے موسس ہوئے کہ ایک دن میواڑ کا کوئی نہ کوئی رانا دلی ضرور

فتح کرے گا۔ چنانچہ چند کا یہ شعر اسی عقیدے کی صدائے بازگشت ہے۔
(جرنل ا۔س۔ب سنہ ۱۸۸۶ء)

اس کا جواب پنڈت موہن لال وشنو لال پنڈیا کی طرف سے سنہ ۱۸۸۷ء میں دیا گیا۔ میں یہاں ان کی بعض دلائل حوالہ قلم کرتا ہوں۔

پنڈت موہن لال وشنو لال پنڈیا

پچھلے دو تین سال سے ایک تنقید میں ڈاکٹر والا نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ راسا میں دس فی صدی عربی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں اور چونکہ ہندی کے ساتھ ان زبانوں کے الفاظ کی آمیزش عہد اکبری سے شروع ہوتی ہے لہذا یہ رزمیہ بدیہ الاصل ہے اور سمت ۱۶۴۰ و سمت ۱۷۲۰ بکرمی کے مابین کسی وقت لکھا گیا ہوگا۔ ہمارے خیال میں یہ ایک مغالطہ انگیز ادعا ہے جو قطعاً بے بنیاد ہے۔ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہ اس رزمیہ سے واقف ہیں نہ تاریخی واقعات سے آشنا ہیں۔ ہمارے خیال میں فارسی عربی الفاظ کا ہندی میں التیام ساتویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ چند کے ہاں ان الفاظ کی موجودگی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ:۔

(۱) یہ کہنا کہ اس میں عربی الفاظ دس بارہ فی صدی ہیں مبالغے سے خالی نہیں۔

(۲) خود شاعر نے انتالیسویں روپک میں صاف کہا ہے کہ میں قرآن (شریف) کی زبان کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(۳) مصنف لاہور کا باشندہ تھا جہاں اس کی ولادت سے بھی ایک صدی قبل سے آل محمود کی حکومت قایم تھی۔ کیا اس مدت میں لاہوری زبان میں مسلمانی الفاظ کا آمیزہ نہیں ہوا ہوگا اور نہ مصنف سنسکرت والوں کے اس مقولے پر عامل تھا کہ "یونی (مسلمانی) زبان مت سیکھو خواہ اس میں تمھاری جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔"

(۴) پرتھی راج اور مسلمانی سلطنتوں کی حدود ایک دوسرے کے ساتھ مل رہی تھیں۔ ضرورت کے وقت ان میں خط و کتابت ہوتی تھی سفیر آتے جاتے رہتے تھے آخر یہ نامہ و پیام اور سفیروں کی بات چیت سنسکرت میں تو ہونے سے رہی۔

(۵) کیا پرتھی راج کی فوج میں مسلمان سپاہی ملازم نہیں تھے یا اس کے علاقے میں مسلمان تاجر اور سیاح نہیں آتے تھے؟ اس لیے یہ توقع رکھنا کہ اس عہد کی ہندی بالکل خالص ہندی ہوگی اور مسلمانی الفاظ کی چھوت سے محفوظ محض خام خیالی ہے۔

(۶) تاریخ کے اوراق الٹیے۔ تھانے پر ابو العاص کے حملے کو لیجیے جو ۳۶ھ میں ہوا۔ حجاج ظالم کے وقت ۹۱ھ میں سندھ فتح ہوا۔ داہر مارا گیا۔ اس کا فرزند جے سنگھ سندھ کے رئیسوں کی ایک جماعت کے ساتھ مسلمان ہو گیا جب سے اب تک سندھ مسلمانی صوبہ بنا ہوا ہے۔ محمود کے ۱۶، ۱۷ حملوں پر غور کرو۔ سومنات پر اس کی چڑھائی کو لو۔ جس کی یاد میں لفظ "بت شکن" گجراتیوں کے کانوں میں ابھی تک گونج رہا ہے۔ گجرات کے ناگر برہمن آج بھی اپنے آپ کو "سپاہی ناگر" کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ مسلمان سلاطین کے

ملازم بن گئے تھے۔ پارسیوں پر لحاظ کرو۔ وہ نہایت قدیم زمانے سے اس صوبہ میں آبسے ہیں۔ کیا ان تمام موثرات نے غیر زبان کا ایک لفظ بھی ہندی میں رائج نہیں کیا؟

(۷) برج لال شاستری کی تاریخ زبان گجرات سے معلوم ہوتا ہی کہ اس زبان میں مسلمانی الفاظ سمت ۱۲۵۷ بکرمی سے داخل ہونے لگے ہیں اور اگر ہم اپنی تلاش جاری رکھیں تو مجھے یقین واثق ہی کہ ہم کو یہ پتہ مل جائے گا کہ مسلمانی الفاظ جیسا کہ میں اس سے قبل اشارہ کر چکا ہوں ساتویں صدی سے ہندی میں ملنے لگے ہیں۔

اب ہم چند کی سراسیمہ کر دینے والی تاریخوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اس کے لیے ہمیں روپک ۳۵۵ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جس کی ابتدا ہی:-

اکادس سے پنچ دہ وکرم ساک انند
(گیارہ سو پندرہ) (انند بکرمی سمت)

اور پورے دوہے کا مطلب ہی کہ انند بکرمی سن گیارہ سو پندرہ میں پرتھی راج اپنے دشمنوں پر فتح پانے اور ان کے تاراج کرنے کے لیے پیدا ہوا۔ اس شعر میں لفظ انند سب کے لیے بالغز ثابت ہوا ہی۔ یہ ایک مرکب لفظ ہی جس میں 'ا' نافیہ ہی اور نند یعنی نو (۹) ہی۔ اگر ہم سو میں سے نو تفریق کریں تو باقی اکانوے رہتے ہیں۔ اس سے مقصد وہ سن ہی جو بکرمی سمت سے اکانوے، نوے سال بعد شروع ہوتا ہی۔ جو ہمیں نجومیوں اور بزرگوں کی اس روایت کی یاد دلاتا ہی کہ بکرماجیت کے دو سن تھے۔ ایک جاری ہی۔ دوسرا ناپید ہو گیا۔

گوشہ کے چندری دان جی شاعر کا بیان ہے کہ قدیم زمانے میں دو سن تھے۔ پہلا
سنند جو آج بھی قایم ہے دوسرا انند جو پرتھی راج کے رزمیہ میں استعمال
ہوا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ نوے یا اکانوے سال کا یہ فرق جو ان
دو سنوں میں معلوم ہوا ہے ہماری مشکلات کو حل کرسکتا ہے یا نہیں۔
لہذا ذیل میں اس کے امتحان کے لیے راسا کے سنوں کا ایک نقشہ
دیا جاتا ہے:-

پرتھی راج	انند سمت	سنند و انند کا فرق	سنند	پرتھی راج کی باقی عمر	آخری جنگ کا امتحانی حاصل شدہ سال
ولادت	۱۱۱۵	۹۰ - ۹۱	۱۲۰۵ - ۶	۰	۱۲۴۸ - ۹
دلی میں آمد	۱۱۲۲	″	۱۲۱۲ - ۳	۳۶	″
کیماس کی جنگ	۱۱۴۰	″	۱۲۳۰ - ۱	۱۸	″
قنوج کا سفر	۱۱۵۱	″	۱۲۴۱ - ۲	۷	″
آخری جنگ	۱۱۵۸	″	۱۲۴۸ - ۹	۰	″

شعر بالا میں انند کو آنند یا الف ممدودہ پڑھنا ایک فاحش غلطی ہے۔ عوام
اس کو آنند پڑھ کر سعد اور مبارک کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ چنانچہ مہامہو
پادھیا کویراج شیامل داس جی بھی اسی غلطی کے شکار ہوئے ہیں۔ سنسکرت
کے لغات کی رو سے انند کے معنے درد و تکلیف ہیں۔ یہاں یہ لفظ اسم
ہے نہ صفت۔ صرف و نحو کی رو سے بھی انند اور آنند میں بڑا فرق ہے اور
عروض بھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ شاعر اس موقع پر انند کا لفظ لاکر
دونوں سنوں کے دقیق فرق کی طرف ایک لطیف اشارہ کر رہا ہے اور سعد
ونحس کے دلدل میں نہیں پھنستا۔

اننّد میں نَنّی کا اور نند نو ہے جو نندا کی طرف تلمیح ہے۔ اس
سے شمار کا مقصد یہ ہے کہ ودیا سمت یعنی نندوں کا زمانہ شامل ہے تا
وہ اپنے زمانے میں خالص بکرمی سمت جس سے نندوں کا زمانہ تفریق
کردیا گیا ہو دے رہا ہے۔ تمیز کے لیے ہم ان دونوں سنوں کو سنند اور
اننّد کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تشریح سے پیشتر ہم ایک اور امر
کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ مغربی علما کی تحقیقات سے
ثابت ہوتا ہے کہ بکرمی سمت سے ۱۳۵ کی تفریق سے سال باہن سمت
برآمد ہوتا ہے اور عیسوی سن بکرمی سمت سے بقدر ۵۶ یا ۵۷ سال کم ہے
بالفاظ دیگر حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے ۵۷ سال قبل بکرماجیت حکمراں تھا
جس کے نام سے بکرمی سمت مشہور ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صریحاً
بے انصافی ہے کہ بکرمی سمت کو بغیر کسی بحث و تمحیص کے خاموشی کے ساتھ
قبول کرلیا جائے۔ لیکن جب راسا کے بیان کردہ سنوں کا موقع آئے تو
ان پر نکتہ چینی کی جائے اور ثبوت طلب کیا جائے۔ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ
بکرماجیت سمت ۱۳۵ بکرمی تک حکومت کرتا رہا اور کسی کو یہ سوال کرنے کی
جرأت نہ ہوئی کہ آخر بکرمی سمت کب سے شروع ہوتا ہے۔ آیا بکرماجیت
کی ولادت سے۔ تاج پوشی کے زمانے سے یا اس کے کسی خاص نامی
کارنامے سے؟ اس باب میں عام عقیدہ جس کی تردید کی ہمارے پاس
کوئی شہادت نہیں یہ ہے کہ جب اس نے بچپن میں شاکاؤں کی خونریزی
کی تھی تب سے یہ سمت جاری ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ شجاعانہ فعل بکرماجیت
سے اس کی طفلی کے ایام میں سرزد نہیں ہو سکتا۔ بدرجۂ اَولیٰ اس قتل عام

کے وقت اس کو پچیس سال کا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے بکرماجیت کی عمر
(۲۵ + ۱۳۵ = ۱۶۰) ایک سو ساٹھ سال ہوتی ہے جو پرتھی راج اور سمر سنگھ
کے نوے سال تک زندہ رہ سکنے کے قیاس سے بدرجہا زیادہ مستبعد
ہے۔ مختصر یہ کہ چند نے جو انند تاریخیں اپنے رزمیہ میں دی ہیں بناوٹی نہیں
ہیں۔ اس نے بکرماجیت کی ایک سو ساٹھ سال عمر کو غیر ممکن احتمال تصور
کیا اور یہ سمت جس کا نام ہم نے سنندر رکھا ہے اسی میں نندوں کی حکومت
کا زمانہ یقیناً شامل ہے جب موجودہ سمت اپنی صحت کا کوئی ثبوت نہیں
دے سکتا تو ہم اس اعتقاد میں کوئی ہرج نہیں دیکھتے اگر یہ فرض کر لیا
جائے کہ پرتھی راج کے عہد میں نوے اکانوے سال کی تفریق کے ساتھ
ایک اور سمت جاری تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے [illegible] عہد کے علما نے روپک
۲۵۵ و ۲۵۶ کے تسلسل پر غور نہیں کیا۔ اگر وہ دونوں روپکوں کو ساتھ
ملا کر پڑھتے تو ہمیں یقین ہے کہ راسا کے سنوں کے متعلق کسی قسم کا شک و [illegible]
ان کے دل میں نہ پیدا ہوتا۔ اس لیے کہ یہ اشعار بہ بانگ دہل اعلان
کر رہے ہیں کہ ہمارا یہی مفہوم ہے اور نہیں۔

نندوں کے زمانے کو چند کے شامل نہ کرنے کی ایک اور دلیل یہ
ہے کہ مہانند کے نو فرزند تھے جن میں آٹھ بیاہتا بیویوں سے تھے اور نواں
چندر گپت اس کی داشتہ نائن موریا کے بطن سے تھا۔ اسی بنا پر
یہ خاندان موریہ کہلاتا ہے۔ بیوی اور باندی کی اولاد کا فرق دنیا میں ہمیشہ
سے ہوتی آئی ہے۔ اسی لیے آریا مورخین کا [illegible] نجیب [illegible]
کے تذکرے میں کم اصلوں کا ذکر شامل نہیں کرتے بلکہ ان سے اغماض کرتے
ہیں یا کنایۃً کہہ جاتے ہیں کہ فلاں فلاں زمانے میں [illegible] کی

حکومت تھی۔ راجپوتوں کی تاریخ سے ایسی بے شمار مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں چنانچہ اسی بنا پر میواڑ کی تاریخ میں بنبیر کو کوئی جگہ نہیں دی گئی نہ اس کا نام نسب ناموں میں شامل کیا گیا۔ اسی قسم کے کسی لحاظ کی بنا پر چند نے مقدس چھتریوں کا سمت ناپاک موریا خاندان کے نوے اکانوے سال ایام سلطنت تفریق کرنے کے بعد اختیار کیا ہے اور اسی لیے اس کو انند سمت کہنا پسند کیا ہے۔

انند سمت کے استعمال میں چند تنہا نہیں ہے بلکہ پرتھی راج، راول سمر سنگھ اور مہارانی پرتھا بائی نے بھی یہی سن ان چند پروانوں اور سندوں میں اختیار کیا ہے جو ہم تک پہنچے ہیں۔ ان دستاویزوں میں اسی قسم کی تاریخیں مرقوم ہیں جو راسا میں ملتی ہیں اس پر سمت ۱۱۲۲ جو غالباً اس کے جلوس کا پہلا سال ہے کندہ ہے۔ ہم نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ملاحظہ کے واسطے ان پروانوں کے فوٹو مشہور ماہر عتیقیات ڈاکٹر رائے بہادر راجا راجندر لال ایل ایل۔ ڈی، سی۔ آئی۔ ای کی خدمت میں ارسال کیے ہیں اور ان کی بجعولیت کے متعلق کافی دیر تک خط کتابت کی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اتفاقیہ بیمار نہ ہو جاتے تو اب تک کبھی کی یہ دستاویزیں ان کی رائے کے ساتھ ماہران مخطوطات قدیمہ کی خدمت میں پیش ہو جاتیں۔ ہمارے پاس ان اشیا کی صداقت کے ثبوت موجود ہیں اور اسی وقت شائع کیے جائیں گے جب اس قسم کا کوئی سوال اٹھایا جائے گا۔

---

[1] مذکورۂ بالا کاغذات کے فوٹو ہماری نظر سے گزرے ہیں اور قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سب کے سب جعلی دستاویزیں ہیں۔

کوی راج شیامل داس کا راسا کی تالیف کے زمانے کو سمت ۱۶۴۰ بکرمی کے درمیان منحصر کرنا بھی نہایت عجیب ہے۔ اس لیے کہ اول تو ہمیں راسا کے مخطوطات اس زمانے سے پہلے کے ملتے ہیں۔ ایک نسخہ سمت ۱۶۴۲ کا اور دوسرا سمت ۱۶۴۵ بکرمی کا نوشتہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب ہے جس کا نام چند چھند درمن ہے، تالیف سمت ۱۶۲۶ بکرمی اور بہاری لال کی ہے۔ ترجمہ ہے کہ سمت ۱۶۱۱ بکرمی میں جلال الدین اکبر بادشاہ نے پرتھی راج راسو اپنے دربار کے شاعر گنگ جی سے سنی ہے۔ ایک اور کتاب رانا راسا مصنفہ راول دیال ہے۔ ہم نے اس کے ایک نسخے نوشتہ سمت ۱۷۶۵ سے اپنے کتب خانے کے لیے ایک نقل بھی حاصل کی ہے۔ اس تالیف کے آخر میں مصنف نے لکھا ہے کہ مہارانا امر سنگھ والی میواڑ کے حکم سے ایک شخص، لکا نامی نے راسا کی نقل کی ہے۔ مہارانا امر سنگھ کا زمانہ سمت ۱۶۵۳ و سمت ۱۶۷۶ بکرمی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان دو تاریخوں کے درمیان راسا کی متفرق داستانوں کے اجزا کو مدون کیا گیا تھا۔ ان صورت حالات میں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ راسا اپنے قریب ترین زمانے میں جیسے کہ سمت ۱۶۴۰ بکرمی ہے عالم وجود میں آ گئے۔

پنڈیا جی کے طویل جواب سے جس کا اکثر حصہ امور غیر متعلقہ سے تعلق رکھتا ہے، میں نے صرف چند باتیں انتخاب کر لی ہیں۔ ان کے خاص خاص دلائل میں اگرچہ جوش و سرگرمی کا مواد بڑی حد تک موجود ہے مگر یقین اور وثوق کا فقدان ہے۔ البتہ ایک بات ان کے حق میں ہے کہ اگر وفاداری بشرط استواری اصل ایمان مانی جا سکتی ہے تو چند کی حمایت میں ان کا جوش و خروش عین ایمان ہے اور لہذا واجب التعظیم۔

موصوف کی قابل ستائش خامہ فرسائی کا ایک فایدہ یہ ہُوا کہ راسا کے معتقدین میں جو لوگ متزلزل ہو رہے تھے ان کے ایمان سلامت رہ گئے اور چند سے بے دینی کی ہوا ایک حد تک تھم گئی۔ موصوف کا اننّد سنند سمتوں کا بے معنی مگر شاطرانہ نظریہ مغربی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ حتٰی کہ اسمتہ جیسا نقاد مورخ بھی اس موج سراب کو حقیقت سمجھتا رہا۔ اسی طرح پرتھی راج۔ سمر سنگھ اور پرتھا بائی کے پروانوں اور سندوں کے ذریعے سے جن کو نہایت ذلیل قسم کی جبیس کہنا چاہیے ہندو حلقوں میں پنڈیا جی نے غیر متوقع کامیابی حاصل کی۔ ان کا اصل جواب سب سے پہلے ۱۸۸۶ء میں بزبان ہندی میڈیکل ہال پریس بنارس سے نکلا۔ پھر اسی کو انگریزی لباس میں شایع کیا گیا۔ بدقسمتی سے میری ان دونوں نسخوں تک رسائی نہیں ہوئی۔ پھر اسی کا خلاصہ موصوف نے پرتھی راج راسو کے پہلے حصے میں جو بنارس سے ۱۸۸۷ء میں چھپا تھا موقع بموقع شامل کر لیا۔ یہ پنڈیا جی کی زبردست حمایت اور مساعی کا نتیجہ ہے کہ راسا جس کو آج سے ایک عرصے پیشتر تقویم پارینہ بن جانا چاہیے تھا ہم میں اب بھی زندہ و سلامت موجود ہے اور پرتھی راج کے عہد کے ادبی کارنامے کی حیثیت سے اس کو عزت دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر بیولر

۱۸۷۵ء میں ڈاکٹر بیولر کشمیر بغرض سیر و تفریح تشریف لے گئے وہاں انھیں بھوج پتر پر ایک قدیم سنسکرت تصنیف "پرتھی راج وجے" نامی مل گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے مطالب معلوم کرنے کے لیے اپنے ایک شاگرد کے حوالے کر دی جب کتاب کی اہمیت منکشف ہوئی اُنھوں نے اکیڈمی کے واسطے ایک مضمون اس پر لکھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ذیل کا خط ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سکرٹری کے نام لکھا:-

"میں پرتھی راج راسا کے مسئلہ پر اکیڈمی کے واسطے ایک یادداشت تیار کر رہا ہوں۔ جس میں ان لوگوں کے ساتھ اتفاق کروں گا جو اسے جعلی تالیف مانتے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں مجھے کشمیر میں ایک سنسکرت تصنیف "پرتھی راج وجے" ملی تھی جس پر جون راج کی شرح بھی جو سنہ ۱۱۷۸-۱۲۰۰ء کے درمیان لکھی گئی تھی موجود ہے پرتھی راج وجے (ظفر نامہ پرتھی راج) کا مصنف یقیناً پرتھی راج کا معاصر اور اس کے دربار کا شاعر تھا۔ وہ نسل کا کشمیری اور اعلیٰ پایہ کا شاعر و عالم تھا۔ چوہانوں کے متعلق اس کے بیانات ہر موقعے پر راسا کی تردید کرتے ہیں اور سنگی کتبات مورخہ سمت ۱۲۲۵ بکرمی کے بیانات سے متفق ہیں۔ پرتھی راج کا نسب نامہ بھی وہی ہے جو ان کتبوں میں ملتا ہے اور اُس تالیف کے بعض عصری واقعات وہی ہیں جو اور ماخذ سے دستیاب ہوتے ہیں

سمیشور پرتھی راج کے باپ کے متعلق اب یہ دریافت ہوا ہے کہ وہ ارنو راج کا فرزند تھا اور اس کی چالکیہ ماں کنچن دیوی گجرات کے

راجہ جے سنگھ کی بیٹی تھی۔ ار نو راج کی ایک بیوی مارواڑ کی شہزادی تھی۔ جس سے اس کے دو فرزند ہوئے۔ پہلے فرزند کا نام کتاب میں قلم انداز کر دیا گیا ہے۔ دوسرے کا نام وگراج بیسل دیو تھا۔ اس نامعلوم الاسم فرزند نے باپ کے خون سے ہاتھ رنگین کیے۔ اس لیے گدی وگراج کو ملی۔ اس کا جانشین اس کا فرزند ہوا۔ پھر پدرکش کے فرزند کو موقع دیا گیا۔ آخر میں امرا نے سومیشور کو گدی پر بٹھایا۔ اس وقت تک سمیشور باہر ہی رہا اور اپنے نانا جے سنگھ کے ہاں تعلیم و تربیت پائی۔ بعد میں وہ چیدی چلا گیا اور وہاں کے راجہ کی بیٹی کپور دیوی سے شادی کی پرتھی راج اور ہری راج اس رانی کے پیٹ سے پیدا ہوئے سمیشور گدی نشینی سے کچھ عرصے بعد فوت ہو گیا اور کپور دیوی پرتھی راج کی نابالغی کے زمانے میں کدمباداما پردھان کی مدد سے حکومت کرتی رہی۔

اس کتاب میں کوئی ایسا بیان نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ پرتھی راج انگ پال والی دہلی کی دختر کے بطن سے تھا۔ یا انگ پال نے اس کو متبنّیٰ کیا تھا۔ نہ قدیم مسلمان مورخ دلی پر اس کی حکومت کا قصہ بیان کرتے۔ ان کے نزدیک وہ اجمیر کا راجہ ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیں اس عہد کی تاریخ کے سلسلے میں ترمیم کرنا ہی پڑے گی اور بہتر ہے کہ اب چند کے راسا کی طباعت بند کر دی جائے۔ وہ یقیناً جعلی تالیف ہے جیسا کہ عرصہ ہوا جودھپور کا مراری دان اور اودے پور کا شیامل داس اعلان کر چکے ہیں۔ پرتھی راج وجے کے بیان کے مطابق پرتھی راج کے درباری ملک الشعرا کا نام پرتھوی بھٹ تھا نہ چند بردائی (روئداد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ اپریل ۱۸۹۳ء)

اس خط کا ایک فوری اثر یہ ہوا کہ سوسائٹی نے راسا کی طباعت بند کر دی۔

مسٹر شیام سندر داس آنریری سیکرٹری ناگری پرچارنی سبھا بنارس

"تلاش ہندی مخطوطات" کی سالانہ رپورٹ میں بابو شیام سندر داس نے پنڈیا جی کی ہمنوائی کا حق ادا کیا ہے۔ راسا کی مدافعت میں ان کے دلائل زیادہ تر پنڈیا جی کے اثرات کے حامل ہیں۔ بابو صاحب فرماتے ہیں :-

"چند ایک بڑا شاعر تھا اور اس نے یہ رزمیہ پرتھی راج راسو لکھ کر اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ ایک عالی جاہ بادشاہ کی تاریخ لکھتے وقت شاعر کا مرغ تخیل کہاں تک بلند پروازی دکھا سکتا ہے۔ اس کے دس فرزند تھے۔ ان میں جلہ سب سے بڑا تھا اور رانا سمر سنگھ کو جہیز میں ملا تھا۔ چند نے اس فرزند کو اپنا کلیات عنایت کیا تھا۔ یہ تالیف ہمیشہ سے علما و فضلا کی تحسین و ستائش کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ مختلف موقعوں پر اس کی طباعت کے واسطے کوشش کی گئی۔ مگر بعض اس کی قدیم زبان اور دقیق ترکیبوں سے گھبرا کر عہدہ برآ نہ ہو سکے اور تھک کر بیٹھ رہے اور بعض خاطر خواہ سرپرستی کے نہ ہونے کی بنا پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس تالیف کی اصلیت کے متعلق علما میں بہت کچھ اختلاف رائے ہے۔ بعض انتہا پسندوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ تاریخ نویسی کے

مقصد کے لیے بالکل بے کار ہے۔ حالانکہ اس کے مطالب پر ہم کو کما حقہٗ ابھی
اطلاع بھی حاصل نہیں۔ کوی راج شیاملداس جی اس معاملے میں سب سے
پیش پیش ہیں اور یہ سنگین الزام عاید کرتے ہیں کہ یہ کتاب پرتھی راج کے زمانہ
کی یادگار نہیں بلکہ اس کے عہد سے نہایت متاخر ہے کیونکہ اس کے بیان
کردہ واقعات اور تاریخیں غلط ہیں۔ یہاں ہمارے لیے یہ دریافت کرنا
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تالیف کے بیان کردہ سال و سنین دوسری
تاریخوں سے کہاں تک مختلف ہیں۔ راساؤں نے اپنے عہد کی تاریخ
عمومی ہے مگر پرتھی راج کی سوانح حیات اس کا خصوصی پہلو ہے جو [illegible]
پرتھی راج اور شہاب الدین [illegible] ہم کو معلوم ہے اور جانتے ہیں کہ وہ
[illegible] کتب تاریخ سے علاوہ [illegible] ان کی معاصرت کی شہادت
دیتے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تالیف کی تاریخیں دوسرے تذکروں کے
سنین سے کہاں تک [illegible] میں راسا کی رو سے پرتھی راج کی پیدائش
سمت ۱۱۱۵ میں۔ اس کی گود نشینی ۱۱۲۲ میں۔ قنوج کا جانا سمت ۱۱۵۱ میں اور
شہاب الدین سے آخری جنگ سمت ۱۱۵۸ میں ہوئی ہے۔ طبقات ناصری میں آخری
جنگ کی تاریخ ۵۸۸ھ درج ہے جو سمت ۱۲۴۸ بکرمی کے مطابق ہے۔ اس
حساب سے [illegible] کی تاریخ ۱۱۵۸ اور طبقات ناصری کی تاریخ ۱۲۴۸
بکرمی میں صریح نوے سال کا فرق رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر مذکورہ بالا
سنین سمت ۱۱۱۵، سمت ۱۱۲۲، سمت ۱۱۵۱ اور سمت ۱۱۵۸ بروے تاریخ صحیح سمت ۱۲۰۵،
سمت ۱۲۱۲، سمت ۱۲۴۱ اور سمت ۱۲۴۸ ہونے چاہیے تھے۔ اس سے واضح ہوتا
ہے کہ چند نے ان سنین کے بیان کرنے میں نوے سال کی غلطی کی ہے چونکہ
ہر تاریخ میں نوے سال کا برابر فرق پایا جاتا غلطی میں شمار نہیں کیا

جاسکتا اس کا بجز نہ کچھ حل نظر ہوگا ہے۔

ہم اپنی اس رپورٹ کے خاتمے پر دس فوٹو جو قدیم پروانوں اور سندوں کی نقل میں ہیں اور پرتھی راج اور اس کے معاصرین سے تعلق رکھتے ہیں۔ درج کرتے ہیں۔ اب ان خطوں اور پروانوں میں بھی اسی قسم کی تاریخیں ہیں اور سمت ۱۱۴۵ سے لے کر سمت ۱۱۵۷ تک پر محیط ہیں۔ اس کے علاوہ یہ دستاویزیں بعض دیگر امور پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

(۱) ریکیں وید ی سے متعلق ہے جو دہلی اور میواڑ کے شاہی خاندانوں کا معاہدہ ہے۔ یہ وید ی رانا سمر سنگھ کو پرتھا بائی ہمشیرہ پرتھی راج سے شادی کے وقت جہیز میں دیا گیا تھا۔ اس پروانے کی رو سے یہ واقعہ سمت ۱۱۴۵ کا ہے۔ وید جی کا جہیز میں دیئے جانے کا قصہ خود پرتھا بائی کے آخری خط سے جو انھوں نے اپنے فرزند حکمران میواڑ کو لکھا ہے ثابت ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پرتھا بائی کی شادی کے موقع پر دہلی سے چار خاندان جہیز میں دیئے گئے تھے۔ چنانچہ اس خط کے بیان کی تصدیق راسا کی داستان پرتھی راج سمیوسے بھی ہوتی ہے جہاں ان چاروں خاندانوں کا ذکر نام بہ نام آیا ہے۔ ان میں پہلا سری پت ساہ ہے جو دسہ پورہ مہاجنوں کے خاندان کا مورث اعلیٰ ہے۔ دوسرا گرو رام پروہت، سناوڑہ برہمنوں کے خاندان کا بزرگ تیسرا ریکیں اچارج (دوایا) برہمنوں کے خاندان کا جد امجد چوتھا چاند چند مخالف اکبر خاندان راجورہ راسے کا بانی یہ چاروں خاندان پرتھا بائی کی معیت میں آئے تھے اور دربار میواڑ ان کی بے حد تعظیم کرتے ہیں۔

(۲) پرتھا بائی کا اپنے بیٹے کے نام رقعہ ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ آخری جنگ جس میں پرتھی راج مارا جاتا ہے۔ ماگھ سدی سمت ۱۱۵۸ کو ہوئی۔ چند نے یہ تاریخ سمت ۱۱۵۸ دی ہے۔

(۳) ان لوگوں کے علی الرغم جو پرتھا بائی اور سمرسنگھ کی شادی کے خلاف چہ میگوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ مکمل دستاویزی شہادت موجود ہے جو مخالف قیاسات کے بطلان کے لیے کافی ہے۔

کوی راج شیامل داس جی نے اپنے نظریے کی تائید میں جو کتبے نقل کیے ہیں۔ پنڈت موہن لال وشنو لال پنڈیا نے اپنے رسالہ 'راسا کی حمایت' میں ان کی ثقاہت کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ اور ہم ان کتبوں کی صحت تسلیم کرنے کے لیے اس وقت تک آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک ان کے اصلی عکس مہیا نہ کیے جائیں اور کوئی قابل عالم ان کی تدوین نہ کرے۔ کیونکہ یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ کسی مفسد نے ان کتبوں میں تحریف کرکے دو کے ہندسے کی جگہ تین کا ہندسہ بنا دیا ہے۔

(۴) ایک پروانے کی مہر میں جو خود پرتھی راج کی ہے۔ سمت ۱۱۲۲ درج ہے جو پرتھی راج کے گدی پر آنے کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ بھی راسا کی تاریخ سے مطابق ہے جو داستان دلی دان سمیو میں درج ہے۔

ہم بس اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان خطوں اور پروانوں کی اصلیت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ سب ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتے ہیں البتہ ان دستاویزوں میں فارسی الفاظ کی موجودگی کی بنا پر ہمیں کسی قدر تردد ہوتا ہے لیکن یہ تردد اس خیال سے رفع ہو جاتا ہے کہ پرتھا بائی دلی سے آئی

تھی جہاں مسلمان سپاہیوں کا ایک دستہ راج میں ملازم تھا اور جہاں لاہور
سے جو مسلمانوں کے زیر نگیں تھا برابر مسلمان سفیر آتے جاتے رہتے تھے
کیونکہ دونوں سلطنتوں کی حدود آپس میں ملحق تھیں۔

بیان بالا سے یہ امر صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ راسا میں مختلف
وقائع کے بیان شدہ سنین غلط نہیں ہیں بلکہ اسی سن کے مطابق ہیں جو
دربار کی دستاویزات وکاغذات میں عام طور پر ان ایام میں
رائج تھا اور جو بقدر ۹۰ - ۹۱ سال بکرمی سمت سے کم ہے۔ اب یہ سن
اس یکساں تفاوت کی جو راسا اور اس عہد کی دستاویزوں کے مبتقمہ
سنوں میں اور مختلف کتبوں کے سنوں میں نظر آتا ہے پوری پوری تشریح
کر دیتا ہے۔ پنڈت موہن لال وشنو لال پنڈیا کی رائے ہے کہ یہ
انند سمت ہے جو بکرمی سن سے ۹۰ - ۹۱ سال پیچھا ہے۔ موریا
خاندان جس کا بانی مشہور چندر گپت پسر مہا نند ہے اسی بنا پر نند بنسی
کہلاتا تھا چونکہ یہ خاندان نیچی ذات کے ہندوؤں سے تعلق رکھتا تھا
اور نوے اکانوے سال حکمراں رہا۔ اس لیے اونچی ذات کے
راجپوتوں بالخصوص میواڑ والوں نے اس خاندان کے ایام سلطنت
کو بکرمی سمت سے نفی کر کے انند سمت کا اجرا کیا۔ جس میں کم ذات موریا
نند بنسی تسلیم نہیں کیا گیا۔ ان وجوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ راسا کی تاریخیں
فرضی نہیں ہیں اور جو وقائع اس رزمیے میں بیان ہوئے حقائق راسخہ
پر مبنی ہیں۔ لہذا یہ امر پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتا ہے کہ پرتھی راج راسا
مصنفہ چند بردائی وزیر و ملک الشعرائے دربار پرتھی راج اتنا ہی
اصلی اور حقیقی ہے جیسے کوئی اور تالیف جو قرون وسطی میں تحریر ہوئی

اور ایسی جدوجہد جو اس کے جعلی اور مصنوعی ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہے بے حد فضول اور بے موقع بلکہ فتنہ پردازانہ ہے" (سالانہ رپورٹ بابتہ تلاش مخطوطات ہندی براے سال ۱۹۰۰ء از شیام سندر داس بی۔اے آنریری سکریٹری ناگری پرچارنی سبھا بنارس۔ الہ آباد ۱۹۰۳ء)

انند سمت کی آڑ میں پنڈیا جی اور ان کے مقلد شیام سندر داس جی نے ناحق ہنگامہ آرائی کی ہے لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر موریا خاندان کا اس انند سمت سے کیا تعلق ہے کیونکہ موریا خاندان بکرماجیت سے کم از کم پوری ایک صدی قبل گزرا ہے۔ قدیم تاریخ ہند کے امام مسٹر ونسنٹ اسمتھ کے بیانات کے مطابق جن کو تمام مورخین ہند تسلیم کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ موریا خاندان ۳۲۲ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۱۸۵ قبل المسیح تک حکومت کرتا رہا۔ اس حساب سے کل مدت سلطنت ایک سو اکتالیس سال بنتی ہے۔ نہ نوے اکانوے سال جیسا کہ ان بزرگوں کا خیال ہے۔ دوسرے موریا خاندان بکرماجیت کے عہد سے جس کے نام پر بکرمی سمت چل رہا ہے۔ پورے ایک سو اٹھائیس سال قبل ختم ہو چکا ہے۔ اب ان بزرگوں کا موریا خاندان کے زمانے کو بکرماجیت سے کم از کم نوے اکانوے سال بعد تصور کرنا اور یہ مفروضہ مدت بکرمی سمت سے خارج کر کے انند سمت کے نظریے کو پیش کرنا ہمارے نزدیک ایک علمی شعبدہ بازی ہے، جو بالکل گمراہ کن ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ خود ونسنٹ اسمتھ نے انند سمت کے نظریے کو تسلیم کر کے اپنی خوش اعتقادی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔

ونسنٹ اے۔ اسمتھ

اسمتھ[۱] صاحب قدیم تاریخ ہند کے مایۂ ناز اور مقبول مورخ ہیں۔ ان کی تاریخ جو اولاً ۱۹۰۴ء میں شایع ہوئی تھی ہند قدیم کے لیے ایک مستند ماخذ مانی جاتی ہے اور ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں کے تعلیمی نصاب میں داخل ہے۔ راسا کے ساتھ ان کا رویہ متزلزل سا رہا ہے۔ ابتدا میں مخالف ہیں۔ بعد میں متشکک اور آخر میں موافق ہیں۔ چنانچہ :-

(۱) "چند کے اس قصے کی کہ پرمال (پرمار یا پرمار دی) پرتھی راج کے ہاتھ سے شکست کھانے کے بعد گیا میں جا کر عزلت نشین ہوگیا اور وہیں فوت ہوا۔ مسلمان مورخین کے سنجیدہ اور مستند بیان سے تردید ہوتی ہے۔

یہ منجملہ ان بہت سے شواہد کے ایک ہے جو یہ دکھانے کے لیے نقل کیا جاسکتا ہے کہ چند کا راسا جس حالت میں کہ وہ ہمارے پاس ہے مورخ کے نقطۂ نظر سے محض ناکارہ اور گمراہ کن ہے" (جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال حصہ ۲ ۱۸۸۱ء)۔

اڈیٹر رسالہ نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے :-

"یہ قیاسہ پاک کر دینے والا بیان ابھی جب کہ چند کے اس عظیم رزمیہ کے مطالب ہی کافی طور پر معلوم نہیں ناواجب ہے"۔

(۲) "پرتھی راج کے حالات سے بحث کرنے والی بہترین

[۱] Vincent A. Smith

کتاب ہندی رزمیہ چند راسا یا پرتھی راج راسا ہے جو صوبجات متحدہ
میں نہایت مقبول ہے۔ اس کی تصنیف چند بردائی کی طرف منسوب ہے
جو پرتھی راج کے دربار کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کی موجودہ شکل و
ترتیب پر لحاظ کرتے ہوئے اس کی اصلیت کے متعلق اختلاف آرا
ہے۔ راسا کے سنوں میں مفروضہ غلطیوں کی تشریح اس دریافت سے
ہو جاتی ہے کہ مصنف نے پرتھی راج کا انند بکرمی سمت استعمال کیا ہے
جو سنہ ۳۳ء کے برابر ہے اور اصل سانند بکرمی سمت سنہ ۵۸ قبل مسیح
سے بقدر نوے و اکانوے سال چھوٹا ہے۔ ڈاکٹر بوہلر پرتھوی راج وجے
نامی ایک سنسکرت تالیف کو جو کشمیر میں ملی تھی اور جس کا مصنف یقیناً
پرتھی راج کا معاصر اور درباری شاعر ہے زیادہ مستند خیال کرتے
ہیں۔ اس کا دیا ہوا نسب نامہ کتبوں میں نوشتہ نسب نامے کے ساتھ
مطابق ہے۔ چند کا یہ بیان کہ راے تھورا اننگ پال راجۂ دہلی کی دختر
کا فرزند تھا غیر صحیح معلوم ہوتا ہے (" قدیم تاریخ ہند صفحہ ۳۵۵، سنہ ۱۹۰۸ء
اشاعت دوم ")

(۲) " ان رزمیوں میں سب سے مشہور چند راسا ہے جو پرتھی
راج کے درباری شاعر چند بردائی کی تصنیف ہے۔ اس نظم میں جو
پاستانی ہندی میں لکھی گئی ہے۔ ہومر سے منسوب نظموں کی طرح راسا
خوانوں کے ہاتھ سے یقیناً بار بار اضافے ہوتے رہے ہیں۔ اشعار کی
تعداد سوا لاکھ بتائی جاتی ہے لیکن اصل تصنیف جس میں صرف پانچ ہزار
اشعار تھے اب بھی موجود ہے اور شاعر کی اولاد کے قبضے میں ہے یہ لوگ
جودھ پور میں رہتے ہیں۔ اور اس زمین پر جو ان کے نامی گرامی جد

کو عطا ہوئی تھی منصرف ہیں۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ یہ قیمتی نسخہ اصل سے نقل ہو کر چھپوا دیا جائے۔ چند بردائی کی تاریخوں میں کوئی مفروضہ غلطی موجود نہیں ہے۔ اس نے ایک نامناسب بکرمی سمت کا استعمال کیا جو معمولی رواجی سمت سے نوے اکانوے سال چھوٹا ہے (پاستانی اور ہندوانی ہندوستان ۱۹۶۰ء از ونسنٹ اے اسمتھ آکسفورڈ)

اسمتھ کا یہ قول کہ راسا میں دراصل پانچ ہزار اشعار تھے۔ بیرونی الحاق نے اس کو سوا لاکھ ابیات کی ایک ضخیم جلد بنا دیا۔ پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کا جواب پنڈت گوری شنکر کی تنقید میں ملے گا۔ انند سمت کے متعلق مسٹر ہلدر کا بیان ذیل ملاحظہ ہو۔

مسٹر آر۔ آر ہلدر نائب کیوریٹر راجپوتانہ میوزیم اجمیر

پرتھی راج راسا کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ بارھویں صدی عیسوی میں تالیف ہوا اور اس کی تاریخیں انند سمت میں جو بکرمی سمت سے نوے اکانوے سال کم ہے دی گئی ہیں۔ سطور ذیل کا یہ مقصد ہے کہ حتی الامکان اختصار کے ساتھ یہ ثابت کر دیا جائے کہ تقریباً اس تالیف کی تمام تاریخیں جو پرتھی راج کی سوانح حیات سے تعلق رکھتی ہیں بالکل غلط ہیں اور نہ اس کے بیان کردہ واقعات صحیح ہیں۔

ان تاریخوں کے جانچنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پرتھی راج کے حالات جو دیگر ذرائع سے ملتے ہیں معلوم کر لیے جائیں۔ اس غرض سے ہم اس کے دادا ارنو راج سے شروع کرتے ہیں جو سمت ۱۱۹۶ سے سمت ۱۲۰۰ بکرمی (۱۱۳۹ء سے ۱۱۵۰ء)

تک حکومت کرتا رہا:-

ارنوراج کا جانشین جگدیو تھا جس کو اپنے باپ کے قتل کے الزام میں اس کے چھوٹے بھائی وسیل دیو نے بہت جلد بعد معزول کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کا زمانہ سمت ۱۲۱۹-۲۰ بکرمی (۱۱۶۲-۶۳ء) ہے۔ وسیل دیو کے بعد قدرۃً اس کا فرزند امر گانگیا اور اس کے بعد جگ دیو کا فرزند پرتھی راج ثانی حکومت پر سرفراز ہوئے۔ موخرالذکر سمت ۱۲۲۴-۲۶ بکرمی (۱۱۶۷-۶۹ء) تک حکمرانی کرتا رہا۔ اب سومیشور کی باری آتی ہے جو سمت ۱۲۲۴-۳۳ ب (۱۱۶۷-۷۶ء) کے درمیان وارث ملک ہوا۔ سومیشور نے کوکن کے راجہ کے قتل کے بعد ترپوری کے راجہ ککلری کی دختر سے شادی کی۔ پرتھی راج اس رانی کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت سمت ۱۲۲۴ ب (۱۱۶۷ء) سے کسی قدر قبل ہونی چاہئے یا یوں سمجھنا چاہیے کہ سمت ۱۲۱۷ و ۲۴ بکرمی (۱۱۶۰ و ۶۷ء) کے درمیان کسی وقت پیدا ہوا اور سمت ۱۲۳۶ تا ۴۹ بکرمی (۱۱۷۹ تا ۹۲ء) سلطنت کرتا رہا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا باپ سومیشور سمت ۱۲۳۶ و ۳۳ ب (۱۱۷۶-۷۹ء) کے درمیان کسی وقت فوت ہوتا ہے۔ راسا میں مختلف واقعات کی جو تاریخیں درج ہیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) ولادت پرتھی راج سمت ۱۱۱۵

(۲) بھولا بھیم والی گجرات کا سلکھ راجہ آبو پر حملہ سمت ۱۱۳۶

(۳) پرتھی راج کے ہاتھ سے شہاب الدین کی گرفتاری سمت ۱۱۳۶

(۴) اچھنی سے شادی سمت ۱۱۳۶

(۵) پرتھی راج کی دہلی میں گودنشینی سمت ۱۱۳۸
(۶) پرتھی راج اور شہاب الدین کی افواج کا مقابلہ سمت ۱۱۴۰
(۷) سنجوگتا دختر جے چند والی قنوج کی پیدائش سمت ۱۱۳۳
(۸) پرتھی راج کا قنوج پر حملہ سمت ۱۱۵۱
(۹) پرتھی راج اور شہاب الدین کی آخری جنگ سمت ۱۱۵۸

ہم ان مدوں پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کرتے ہیں:-

(۱) پرتھی راج کی تاریخ ولادت سمت ۱۱۱۵ صحیح نہیں کیونکہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ وہ سمت ۱۲۱۷ و ۱۲۲۴ بکرمی (سنہ ۱۱۶۰-۶۷ء) کے درمیان کسی وقت پیدا ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ پرتھی راج راسا کی تاریخیں انند بکرمی سمت میں ہیں جو مروجہ بکرمی سمت سے نوے اکانوے سال چھوٹا ہے اور راسا کی تاریخوں میں یہ مدت یعنی نوے اکانوے سال اضافہ کرنے سے صحیح بکرمی سمت برآمد ہوتا ہے۔ اس نظریے کو بھی تسلیم کرکے ہم دیکھتے ہیں کہ اس مدت کے اضافہ کرنے سے راسا کی تاریخیں درست نہیں آتیں۔

(۲) جہاں تک ہمیں معلوم ہے آبو کے راجہ سلکھ کا نام کسی کتبے اور معتبر دستاویز میں نہیں ملتا۔ سمت ۱۱۲۳-۱۲۰۱ بکرمی میں دھروبھٹ اور رام دیو آبو پر حکمراں تھے۔ اور دھارا ورش سمت ۱۲۲۰ سے سمت ۱۲۷۶ بکرمی (سنہ ۱۱۶۳-۱۲۱۹ء) تک گدی پر تھا۔ ادھر بھولا بھیم والی گجرات سمت ۱۲۳۶ بکرمی (سنہ ۱۱۷۹ء) میں تخت نشین ہوا۔ اس لیے بھولا بھیم کا حملہ سمت ۱۱۳۶ انند یا سمت ۱۲۲۶ سنند میں ان تاریخوں پر نظر رکھتے ہوئے ناممکن ہے۔

(۳) ہندوستان پر شہاب الدین کا سب سے پہلا حملہ سنہ ۵۷۱ھ مطابق سمت ۱۲۳۲ بکرمی (سنہ ۱۱۷۵ء) میں ہوتا ہے۔ پرتھی راج سمت ۱۲۳۴ بکرمی کے بعد گدی نشین ہوتا ہے جو سنہ ۱۱۷۸ء و سنہ ۵۷۳ھ کے مطابق ہے۔ اس لیے پرتھی راج شہاب الدین کو سمت ۱۱۳۶ انند یا سمت ۱۲۲۶ سنند (سنہ ۵۶۹ھ یا سنہ ۱۱۶۹ء) میں اسیر نہیں کرسکتا۔

(۴) کے لیے ملاحظہ ہو انڈین انٹیکوری صفحہ جلد ۵۲

(۵) راسا کی روایت ہے کہ اننگ پال دہلی کے راجہ نے اپنی دختر کملا کی شادی سومیشور سے کی اور پرتھی راج اس شادی کا ثمرہ ہے۔ جس کو اننگ پال نے متبنّیٰ کرلیا اور اپنی زندگی میں راج دے کے خود تیرتھ کو چلا گیا۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ سومیشور کے زمانے میں اننگ پال نام کا کوئی راجہ نہیں تھا کیونکہ بیسل دیو کے زمانے سے دلی اجمیر کا ماتحت صوبہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ سومیشور نے ترپوری کے راجہ کی لڑکی کپور دیوی سے شادی کی تھی جس کے بطن سے پرتھی راج پیدا ہوا۔

(۶) اس کے لیے ہمارے دلائل مندرجۂ ۳ کافی ہیں اور مزید تردید کی ضرورت نہیں۔

(۷) راسا کا بیان ہے کہ بجے پال راجۂ قنوج نے کٹک کے سورج بنسی راجہ مکند دیو پر حملہ کیا۔ جس پر مکند دیو نے اپنی لڑکی بجیا اپنے فرزند جے چند کو بیاہ دی۔ ان کے پیٹ سے سنجوگتا سمت ۱۱۳۳ انند میں پیدا ہوئی، اول تو جے چند کے باپ کا صحیح نام بجے چند تھا۔ نہ بجے پال اس کا عہد حکومت سمت ۱۲۲۴-۲۲ بکرمی مطابق سنہ ۱۱۶۷-۶۹ء ہے۔ اس

زمانے میں کٹک پر گنگا بنسیوں کا راج تھا نہ سورج بنسیوں کا۔ اور مکند دیو نام کے راجا کا سراغ نہ گنگا بنسیوں میں ملتا ہے نہ سورج بنسیوں میں۔ جن کی حکومت کٹک پر ہو۔ اس لیے سمت ۱۱۳۳ انند یا سمت ۱۲۲۲ سنند میں جے چند کی مکند دیو کی دختر کے ساتھ شادی کا قصہ اختراع محض معلوم ہوتا ہے۔

(۴) راسا میں مذکور ہے کہ جے چند نے راجسو جگ اور اپنی دختر سنجوگتا کا سوئمبر رچایا جس میں اس نے پرتھی راج والی اجمیر اور سمر سنگھ والی میواڑ اور دیگر راجگان کو بلایا۔ اس رسم میں شامل ہونے سے ان ہر دو والیوں کے انکار پر جے چند کی فوجوں نے ان پر چڑھائی کی۔ مگر بد قسمتی سے شکست کھائی۔ اس پر جے چند نے پرتھی راج کی توہین کی غرض سے اس کا ایک طلائی مجسمہ تیار کروا کر دربان کی جگہ پر رکھوا دیا۔ پرتھی راج اس ذلت کی تاب نہ لا کر سمت ۱۱۵۱ انند یا سمت ۱۲۴۱ سنند میں قنوج پر یورش کرتا ہے اور جے چند کو ہزیمت دے کر سنجوگتا سمیت واپس لوٹتا ہے۔

یہ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ مکند دیو کی بیٹی کے ساتھ جے چند کی شادی کا افسانہ ناقابل یقین ہے۔ علاوہ بریں جے چند کے راجسو جگ منانے اور سنجوگتا کی رسم سوئمبر ادا کرنے کا قصہ نہ کسی کتاب یا کتبے میں ملتا ہے بلکہ رمبھا منجری ناٹک تالیف نے چندر سوری میں جس کا موضوع خاص جے چند ہے۔ کوئی ایسا قصہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے ہمارے پاس کوئی ایسے وجوہ نہیں جن کی بنا پر پرتھی راج کے حملے کو تسلیم کریں۔

(۵) سمت ۱۱۵۱ انند یا سمت ۱۲۴۹ سنند صرف یہی ایک ایسی تاریخ

بھانا کی دختر سے پرتھی راج کی اور پرتھی راج کی بہن پرتھا بائی سے
راول سمر سنگھ والی میواڑ کی شادی ہوئی۔ اس سلسلے میں ہم گذارش
کرتے ہیں کہ بھل لما دیوگیری کے خاندان کے بانی کا زمانہ سمت ۱۲۴۴ بکرمی
(۱۱۸۷ء) ہے یعنی پرتھی راج کے قتل سے صرف پانچ سال قبل یہ
خاندان وجود میں آتا ہے اور پرتھی راج کے عہد میں بھانا نام کا کوئی
راجہ جادو بنسیوں میں نہیں گزرا اور سمر سنگھ کے ساتھ پرتھا بائی کی شادی
کے قصے کی لغویت تو صرف اس بیان سے ظاہر ہے کہ پرتھی راج اور راول
سمر سنگھ کے زمانوں میں کم از کم ایک سو سال کا فرق ہے۔

(۵) راسا میں ایک اور بے حقیقت افسانہ ملتا ہے جو پرتھی راج
چند بردائی اور شہاب الدین کی بیک وقت وفات سے تعلق رکھتا ہے
اور جس میں کہا گیا ہے کہ پرتھی راج کو قید کرکے غزنی بھیج دیا گیا تھا۔ چند
اس کی تلاش میں غزنین پہنچا اور قید خانے میں پرتھی راج تک رسائی
حاصل کرلی۔ ادھر اس نے شہاب الدین کے سامنے پرتھی راج کی تیر
اندازی کے قصے سنا سنا کر سلطان کو اس امر پر آمادہ کرلیا کہ وہ راجا
کی تیراندازی کا کمال ملاحظہ کرے۔ چنانچہ راجا دربار میں بلایا گیا جب
تیر کمان راجا کے قبضے میں آگئے۔ اس نے چند کے اشارے پر پہلا تیر
سلطان کے سینے سے پار نکال دیا جس سے فوری ہلاکت واقع ہوئی
ساتھ ہی چند اور راجا نے خودکشی کرلی۔ یہ بیان بھی صداقت پر مبنی نہیں
کیونکہ ۱۱۹۲ء میں پرتھی راج تھانیسر کے قریب شکست کھاکر بھاگتا ہوا
مارا گیا اور شہاب الدین ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں لاہور سے غزنین
کی طرف واپسی کے وقت کسی فدائی یا کھوکھروں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

(۶) ایک اور بے بنیاد قصہ راسا میں درج ہے۔ وہ یہ ہے کہ پرتھی راج کے بعد اس کا فرزند رینسی دلی میں تخت نشین ہوا۔ لیکن تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فرزند گوبند راج عرف گولا اجمیر کی گدی پر بٹھایا گیا۔ اس لیے رینسی کی جانشینی کا افسانہ ناقابل قبول ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ جب ہم راسا کے بیانات اور اس کے سنین کا تحقیق کی کسوٹی پر امتحان کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی صحیح بنیاد پر قایم نہیں۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ راسا ایک جعلی تصنیف ہے جو پرتھی راج کے عہد کی یادگار نہیں اور نہ وہ اس عہد سے وہ عہد کی بعد تک وجود میں آئی۔ اگر پرتھی راج کے عہد کی تصنیف ہوتی تو اس میں ایسے پوچ اور مہمل بیانات موجود نہ ہوتے جو اس تالیف میں نظر آتے ہیں۔

موجودہ تنقید کی روشنی میں انند سمت کے نظریے کو فروغ دینے والوں کی کوشش ناکام اور بے سود ثابت ہوئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ پرتھی راج۔ پرتھا بائی اور سمر سنگھ کے پٹے اور پروانے جو انند سمت کی تقویت میں شایع کیے گئے ہیں۔ کسی سنجیدہ التفات کے سزاوار نہیں اس لیے کہ عہد معلومہ سے ان کو دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ (جرنل شاخ بمبئی رایل ایشیاٹک سوسائٹی جلد سوم ص ۲۰۳ ۱۹۲۷ء)

رائے بہادر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا مہوپادھیا

ہندی نورتن میں مشر بھائیوں نے چند کی ولادت ۱۱۸۳ء بکرمی اور سال وفات ۱۲۴۹ء بکرمی بیان کیا ہے (ص۵۵ طبع سوم) اور لکھا ہے کہ راسو جعلی نہیں ہے بلکہ پرتھی راج کے زمانے میں چند نے اسے تالیف کیا تھا اور اس کے اصلی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص سولھویں صدی کی ابتدا میں اسے بناتا تو وہ خود اپنا نام نہ لکھ کر ڈھائی سو صفحات کی ضخیم کتاب کو آخر چند کے نام پر کیوں مشہور کر دیتا۔ (ص۵۹)

اگر پرتھی راج وجے اور پرتھی راج راسو دونوں پرتھی راج کے عہد میں تالیف ہوتے تو پرتھی راج کا نسب نامہ اور اس کے خاندان کے افراد کے نام اور جنگوں کے واقعات جو ایک تالیف میں درج ہیں وہی دوسری میں بھی درج ہوتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ راسا کے بیانات وجے کے بیانات سے ہر معاملے میں مختلف ہیں۔ ادھر وجے کے بیانات کی سنگی کتبات سے تصدیق ہوتی ہے اور راسو کے بیانات کی نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں دونوں کتابوں کی تصنیف کا وقت پرتھی راج کے عہد میں تسلیم کرنا موزوں نہیں ہے۔

اب ہم راسا کی تصنیف کے عہد کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے دیے ہوئے خاص خاص واقعات کا امتحان کرتے ہیں۔

(۱) راسا میں لکھا ہے کہ آبو پہاڑ پر ایک مرتبہ رشی لوگ ہون کرنے لگے تو راکشش اس میں خلل انداز ہوئے۔ اس مداخلت سے

تنگ آکر رشیوں نے وششٹھ کے پاس جاکر فریاد کی۔ اس پر وششٹھ نے اگنی کنڈ کے پاس آکر اس میں سے پریہار۔ چالکیہ اور پرمار چھتری پیدا کر دیئے اور انھیں راکششوں کے ہلاک کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن جب یہ تدبیر کامیاب نہ ہوئی تو وششٹھ نے ایک نیا اگنی کنڈ بنا دیا اور چار منہ والے برھما کا دھیان اور جپ کرتے ہوئے یگیہ کرنے لگے۔ اس سے فوراً ہی چار بازوؤں والا لمبا چوڑا قوی ہیکل انسان پیدا ہوا۔ وششٹھ نے اس کا نام چوہان رکھا۔ (پرتھی راج راسو سار۔ پہلا سمے صفحہ ۵)

فی زماننا ان چاروں چھتریوں کے خاندان اپنے آپ کو اگنی بنسی مانتے ہیں لیکن پرماروں کے سنگی کتبے سے (جو ریاست بانسواڑہ کے موضع ارتھونا میں شیوجی کے مندر میں اسی خاندان کے راجہ منڈلن دیو کے زمانے اور ۱۱۳۶ بکرمی کا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ وشوامتر آبو پہاڑ پر رہنے والے وششٹھ کی گائے نندنی نام اڑا کر لے گئے۔ اس پر وششٹھ جی خفا ہوئے اور اگنی کنڈ میں یگیہ کرنے لگے۔ تب کنڈ میں سے ایک طاقت ور انسان پیدا ہوا جو دشمن سے اڑ کر نندنی گائے چھین لایا۔ اس کی بہادری سے خوش ہو کر رشی نے اس کا نام پرمار (دشمن زن) رکھ دیا۔ پرتھی راج راسو میں پرمار کے آغاز کا بیان مندرجۂ بالا سنگی کتبے نیز دیگر کتب سے نہیں ملتا۔

پریہار۔ چالکیہ (سولنکی) اور چوہان کے سولھویں صدی سے قبل کے کتبوں و کتب میں کہیں بھی اگنی بنسی یا وششٹھ کے بارے میں کوئی بات نہیں ملتی بلکہ ان کے خاندانوں کی ابتدا کے متعلق مندرجۂ ذیل اطلاع

ملتی ہے۔

(۱) گوالیر سے سمت ۹ کے قریب کا پرہار راجہ بھوج کی مدح میں ایک قصیدہ ملتا ہے۔ اس میں پرہاروں کو صاف سورج بنسی بتلایا ہے۔ (رپورٹ سالانہ جائزہ اثریات بابت ۰۴-۱۹۰۳ء صفحہ ۲۸۰)

(ب) راج شیکھر نامی ڈراما نگار نے جو دسویں صدی بکرمی سے تعلق رکھتا ہے بھوج دیو کے فرزند مہندر پال کو جو راج شیکھر کا شاگرد بھی ہے۔ رگھو بنسیوں کا قشقہ (مایۂ ناز) اور مہندر پال کے فرزند مہی پال کو رگھو بنسیوں کا واسطۃ العقد بیان کیا ہے۔ (بال بھارت، باب اول۔ شعر یازدہم)

(ج) بسنتا وائی کے مشہور ہرش ناتھ کے مندر میں چوہان راجہ وگرہ راج کے عہد کا ایک مدحیہ کتبہ نوشتہ سمت ۱۰۳۰ بکرمی ہے جس میں قنوج کے پرہاروں کو رگھو بنسی کہا گیا ہے۔

ان شواہد سے ثابت ہے کہ پرہار اولاً اپنے آپ کو رگھو بنسی (سورج بنسی) مانتے تھے نہ اگنی بنسی۔

چالکیہ (سولنکی) راجا وِملا دت کے آٹھویں سال جلوس یعنی سمت ۱۰۷۵ بکرمی کے خیرات نامے (دان پتر) میں سولنکیوں کو چندر بنسی لکھا ہے (اپی گرافیا انڈیکا۔ جلد ششم صفحہ ۵۹-۳۵۱)

سولنکی راجہ کُلوتنگ چوڑ دیو ثانی کے وزیر بدھ راج کے دان پتر کندہ سمت ۱۰۹۵ میں راجہ مذکور کے مشہور سلف گنج بشنو کو چندر بنسیوں کا قشقہ بیان کیا ہے۔ (اپی گرافیا انڈیکا۔ جلد ششم صفحہ ۲۶۵)

جینیوں کے مشہور مصنف ہیم چند نے اپنی تصنیف دو آشرے

میں راجہ بھیم دیو کے ایلچی کا جو چیدی کے راجہ کرن کے پاس بھیجا گیا ہے۔ ایک بیان دیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ پرتھی راج کے عہد تک سولنکی راجہ اپنے آپ کو اگنی بنسی نہیں بلکہ چندر بنسی اور پانڈوؤں کی اولاد کہتے تھے (باب نہم۔ ابیات ۴۰ تا ۵۹ دو آشرے)

پرتھی راج کے باپ سومیشور کے بڑے بھائی بیسل دیو چہارم وگرہ راج) نے اجمیر میں ایک مدرسہ قایم کیا تھا۔ اس درس گاہ میں اس نے ایک خود نوشت ناٹک ہرکیلی اور اس کے درباری شاعر شومیشور کی تصنیف "للت وگرہ راج" ناٹک اور چوہانوں کی تاریخ پر ایک تصنیف پتھروں پر کندہ کروائی تھیں۔ اب یہ مدرسہ ڈھائی دن کا جھونپڑا کہلاتا ہے۔ ان تالیفات میں جو ڈھائی دن کے جھونپڑے کے صحن سے برآمد ہوئی ہیں۔ چوہانوں کو سورج بنسی بتلایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ "پرتھی راج وجے" میں بھی چوہانوں کو جگہ جگہ سورج بنسی ہی کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ایک مرتبہ بھی بھول کر انھیں اگنی بنسی نہیں کہا گیا۔

گوالیر کے تنور بنسی راجہ ویرم کے دربار کے جین شاعر نے چندر سوری نے بکرمی سمت ۱۴۶۰ کے قریب ہمیر مہاکاویہ تالیف کی۔ اس میں سورج بنسی خاندان چوہان کی پیدائش کا قصہ اس طرح مذکور ہے کہ ایک مرتبہ برہما جی کے ہاتھ سے کنول کا پھول گر گیا، جہاں یہ پھول گرا تھا اس مقام کا نام پشکر رکھ دیا گیا۔ اسی مقام پر برہما نے راکششوں کے خوف سے سورج کا دھیان کیا۔ اس پر سورج سے ایک فرشتہ نما انسان اتر آیا۔ اس کا نام "چوہان" یا "چوہان" رکھا گیا۔ یہ فرشتہ نما

انسان حکومت کرنے لگا۔

بہرحال سمت ۱۲۴۷ بکرمی سے قریب تک کے تو ہمارے پاس کافی ثبوت موجود ہیں کہ چوہان قوم اپنے آپ کو سورج بنسی کہتی تھی۔ اگر پرتھی راج راسو خود پرتھی راج کے عہد میں لکھا جاتا تو ہمیں یقین ہے کہ اس کا مصنف چوہانوں کو اگنی بنسی نہ بتاتا۔

راسا میں جو پرتھی راج کا شجرۂ نسب دیا گیا ہے وہ بالعموم بناوٹی اور بے اصل ہے۔

راسا میں مذکور ہے اور یہ قصہ عام طور پر مشہور بھی ہے کہ پرتھی راج کی ماں اننگ پال کی بیٹی تھی جس کا نام کملا تھا۔ اس کے بطن سے پرتھی راج پیدا ہوا جسے انںگ پال نے گود لے لیا۔ یہ کہانی جس قدر مشہور ہے اسی قدر غلط بھی ہے کیونکہ ان ایام میں انںگ پال نام کا کوئی راجہ دلی کی گدی پر نہیں تھا اور نہ کوئی اس کی لڑکی کملا سومیشور سے بیاہی گئی۔ صحیح یہ ہے کہ بیسل دیو کے عہد سے دلی اجمیر کے ساتھ ملحق ہو چکی تھی۔ پرتھی راج کی ماں کا نام کملا نہیں تھا بلکہ کپور دیوی تھا اور وہ چیدی (قریب جبل پور) کے راجہ اچل راج کی دختر تھی۔ چنانچہ ہمیر کاویہ میں بھی اس رانی کا نام کپور دیوی ہی مرقوم ہے۔ سُرجن چرت کا مصنف بھی اس کو کپور دیوی لکھ رہا ہے۔ اگرچہ وہ اس کو کنتل کے راجہ کی دختر بیان کرتا ہے۔

راسا کا بیان ہے کہ پرتھی راج کی بہن پرتھا بائی تھی جو میواڑ کے راول سمر سنگھ سے بیاہی گئی تھی اور سمر سنگھ پرتھی راج کی حمایت میں شہاب الدین سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ یہ قصہ بھی سراسر غلط ہے کیونکہ راول سمر سنگھ پرتھی راج کے عہد

پوری ایک صدی بعد گزرا ہے۔

راسا میں آتا ہے کہ پرتھی راج کا باپ سومیشور گجرات کے راجہ بھیم دیو کے ہاتھ سے مارا گیا اور پرتھی راج نے بھیم دیو کو قتل کرکے اپنے باپ کا انتقام لیا۔ سمت ۱۲۳۶ بکرمی کے آغاز میں راجہ سومیشور کی وفات اور پرتھی راج کی گدی نشینی کا زمانہ مانا جا سکتا ہے دریں بند ہر گوش کے ثبات پر چوہانوں کا خاندانی شجرہ (۱۲۳۵) بھیم دیو سمت ۱۲۳۵ بکرمی میں گدی نشین ہوا۔ اس زمانے میں وہ بالکل بچہ تھا اور تریسٹھ سال کی عمر یعنی سمت ۱۲۹۸ بکرمی تک زندہ رہا۔ بھیم دیو ایسے ابتدائی زمانے میں جبکہ وہ ناسمجھ بچہ تھا سومیشور کو اول تو قتل ہی نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے بھیم دیو کا پرتھی راج کے ہاتھ سے مارا جانا کجا وہ تو پرتھی راج کے مارے جانے سے بعد سمت ۱۲۴۹ بکرمی کا واقعہ ہے پورے پچاس سال بعد تک زندہ رہا۔ اس لیے راسا کا یہ قصہ بھی غیر تاریخی ثابت ہوتا ہے۔

راسا میں پرتھی راج کی بیویوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ گیارہ سال کی عمر میں اس کی پہلی شادی ہوئی۔ یہ بیوی منڈور کے راجا ناہر رائے پریہار کی بیٹی تھی۔ لیکن ناہر رائے پرتھی راج سے کئی سو سال پہلے گزرا ہے۔

دوسری بیوی اِچھنی آبو کے راجہ سلکھ کی لڑکی تھی۔ اس وقت پرتھی راج بارہ سال کا تھا۔ اس زمانے میں آبو کا راجہ دھرا ورش تھا نہ سلکھ یا جیت۔

تیسری بیوی سے تیرہ سال کی عمر میں شادی ہوتی ہے۔ یہ عورت داہیا چامنڈ رائے کی بہن تھی۔ اس کے پیٹ سے رینسی پیدا ہوتا ہے جو راسا کے بیان کے مطابق پرتھی راج کے بعد گدی پر آتا ہے۔ مگر جو فرزند پرتھی راج کا جانشین ہوتا ہے اس کا نام گووندراج تھا جسے فارسی خواں گولہ کہتے ہیں۔

چوتھی بیوی ششی ورتا، دیوگیری کے راجہ بھان جادو بنسی کی بیٹی

بتائی گئی ہے۔ مگر ان ایام میں اس نام کا کوئی راجہ دیوگیری میں نہیں گزرا۔

پانچویں ہنساوتی رن تھنب کے جادو تیسی راجہ بھان رائے کی دختر نیک اختر بیان کی گئی ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت رن تھنب یا رنتھنبور میں تو خود چوہانوں کا راج تھا۔

ہم صرف انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ راسانے تو پرتھی راج کی گیارھویں سال کی عمر سے لے کر اس کے چھتیسویں سال کی عمر تک ہر سال ایک بیوی کے حساب سے پچیں بیویاں درج کی ہیں۔ حالانکہ وہ تیس سال کی عمر میں مارا جاتا ہے۔

تقریبًا سارا راسا فرضی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہم نمونۃً بعض اور امور درج کرتے ہیں :-

(۱) لکھا ہے کہ سومیشور نے میوات کے مغل بادشاہ پر جس کا نام مگدل رائے ہے خراج نہ دینے کی بنا پر چڑھائی کی۔ مگدل رائے نے جنگ کے لیے پرتھی راج کو بھی طلب کیا۔ چنانچہ پرتھی راج آیا اور اس نے مغل راجہ کو شکست دی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس زمانے میں میوات تو اجمیر کے زیر حکومت تھا۔ دوسرے پرتھی راج اپنے باپ کی وفات کے وقت بالکل بچہ تھا۔ پھر وہ جاکر مگدل رائے کو کیسے شکست دے سکتا ہے۔

(۲) سنجوگتی کے سومبر کی رسم۔ پرتھی راج اور جے چند کی لڑائی کا قصہ بھی بوجوہ آئندہ بے سروپا ہے۔ اول تو کہا گیا ہے کہ سومبر یگیہ کے موقع پر منایا گیا تھا اور اس میں بہت سے راجہ موجود تھے۔ جے چند نے کوئی راجسو جگ نہیں منایا۔ دوسرے جن راجاؤں کے نام دیے گئے ہیں وہ سب فرضی ہیں۔ راجسو جگ یا سومبر کا قصہ نہ ہمیر مہا کاویہ میں آتا

ہے اور نہ رمبھا منجری نامی ناٹک میں جو ناٹک کہ خود جے چند کی شہرت و اقتدار قایم کرنے کے لیے تصنیف ہوا۔

(۳) راول سمرسنگھ کے بڑے لڑکے کنبھ کا گدی نہ ملنے پر ناراض ہو کر بیدر چلا جانا۔ شہاب الدین سے پرتھی راج کی آخری جنگ تک کنبھ کیا اس کا باپ سمرسنگھ بھی پیدا نہیں ہوا تھا ورنہ دکن میں ان ایام میں مسلمان موجود تھے۔ نہ ان کی حکومت تھی۔ دکن کو علاءالدین خلجی سمت ۱۳۵۹ بکرمی میں فتح کرتا ہے اور بیدر کو بہمنی خاندان کا دسواں بادشاہ سلطان احمد شاہ سمت ۱۴۸۷ بکرمی میں آباد کرتا ہے۔ اس لیے کنبھ کا باپ سے ناراض ہو کر بیدر جانے کا قصہ ایک تراشیدہ داستان ہے۔

(۴) پرتھی راج کے ہاتھ سے شہاب الدین کے قتل کا واقعہ ایک اور بے بنیاد افسانہ ہے۔ قصہ یوں ہے کہ شہاب الدین پرتھی راج کو غزنین قید کرکے لے گیا اور اس کو اندھا کر دیا۔ چند کوی اپنے آقا کی تلاش میں غزنین پہنچا اور شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کرکے پرتھی راج کے پاس قید خانے میں آنے جانے لگا۔ راجہ سے اس نے شہاب الدین کے قتل کی بخت وبتہ کرلی۔ پھر شہاب الدین کے سامنے راجہ کے کمال تیراندازی کے قصے سنا سنا کر سلطان کو اس امر کی ترغیب دی کہ وہ اپنے قیدی کا کمال ملاحظہ کرے۔ چنانچہ راجہ ایک دن دربار میں بلایا گیا۔ اس کے ہاتھ میں تیر و کمان دیے گئے۔ چند کے اشارے پر اس نے پہلا تیر سلطان کے سینے کے پار کر دیا جس سے فوری موت واقع ہوگئی۔ راجہ اور چند کو سلطان کے ملازمین نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ مگر صحیح یوں ہے کہ پرتھی راج ترائن کی جنگ کے بہت جلد بعد مارا جاتا ہے جو سمت ۱۲۴۹ بکرمی کا واقعہ ہے اور

سلطان شہاب الدین اس واقعے سے ۱۴ سال بعد سمت ۱۲۶۳ بکرمی میں لاہور سے غزنیں جاتے وقت عین نماز میں گھوکھروں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

راسا ہمارے خیال میں سنہ ۱۶۰۰ بکرمی کے آس پاس لکھا گیا ہے۔ اس کے وجوہ ہمارے پاس حسب ذیل ہیں:

(۱) ہمیر مہاکاویہ سمت ۱۴۶۰ بکرمی کی تالیف ہے۔ راسا اس سے یقیناً ایک موخر تالیف ہے۔

(۲) چونکہ اس میں بیدر کا ذکر آتا ہے جو سمت ۱۴۸۶ بکرمی میں آباد ہوا تھا اس لیے اس سنہ سے بھی موخر ہے۔

(۳) ہندوستان میں مغل سلطنت سمت ۱۵۸۳ بکرمی سے شروع ہوتی ہے اور امیر تیمور کا حملہ ہند سمت ۱۴۵۵ بکرمی میں ہوتا ہے جس کے اس بیان سے کہ جوانا میں مغل راج تھا۔ راسا کی تالیف کو ان دونوں سمتوں کے بعد ظہور میں آنا چاہیے۔

(۴) سمت ۱۵۱۷ بکرمی میں مہارانا کنبھ کرن نے کنبھل گڑھ کے قلعے کی تعمیر کی اور وہاں ماماد یو کے مندر میں پتھر کے بڑے بڑے پانچ چوکوں پر اپنے اسلاف کی ایک تصنیف کندہ کروائی۔ اس میں سمر سنگھ کی پرتھی راج کی بہن پرتھا بائی سے شادی یا شہاب الدین کی جنگ میں سمر سنگھ کے مارے جانے کا کوئی مذکور نہیں۔ مگر سمت ۱۷۳۲ بکرمی میں مہارانا راج سنگھ نے اپنے تعمیر کردہ راج سمندر تالاب کے نوچوکی نام کے بند کے پچیس بڑے پتھروں پر ایک مہاکاویہ کندہ کروائی۔ اس کا ویہ کے تیسرے باب میں سمر سنگھ کی پرتھا سے شادی اور سمر سنگھ کا شہاب الدین کی جنگ میں مارے جانے کا قصہ بالکل اسی طرح درج ملتا ہے۔ یہ قصہ راسا میں مفصل درج ہے۔

(راج پرشستی مہاکاویہ باب سوم)

اب صاف واضح ہوتا ہے کہ راسا سمت ۱۵۱۷ و سمت ۱۶۴۲ بکرمی کے درمیان کسی وقت بنائی گئی ہے۔ راسا کا سب سے قدیم نسخہ سمت ۱۶۴۲ بکرمی کا نوشتہ ہے۔ اس لیے اس کا سال تالیف سمت ۱۵۱۷ و سمت ۱۶۴۲ یعنی سمت ۱۶۰۰ بکرمی کے قریب قیاس کرنا چاہیے۔

راسا کی زبان سمت ۱۲۰۰ بکرمی کی نہیں بلکہ سمت ۱۶۰۰ بکرمی کے قریب کی ہے۔ سمت ۱۵۹۲ بکرمی تک کی مختلف تصنیفات کی زبان اور راسا کی زبان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

پڑھے ہوئے بھاٹ اب بھی شاعری کرتے ہیں۔ رزمیہ نظمیں ڈنگل زبان میں اور دوسرے مضامین عام بولی میں لکھتے ہیں۔ ڈنگل میں قواعد صرف کی چنداں پابندی نہیں کی جاتی۔ اس کے الفاظ، ان کی ترتیب اور ان کے بھی نرالے ڈھنگ کے ہوتے ہیں۔ ایک ہی تصنیف میں کس طرح آج کی زبان دیکھنی ہو تو سمت ۱۸۷۲ بکرمی میں آڈھا کشن کے بنائے ہوئے بھیم ولاس اور بیسویں صدی بکرمی کی تالیف مشرن سورج مل کی تصنیف ونش بھاسکر کو دیکھیے۔

راجستانی زبان میں پہلے فارسی الفاظ کا استعمال نہ تھا۔ مگر بعد میں ہونے لگا۔ چنانچہ راسا میں دس فی صدی فارسی عربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ آج کل کے اہل قلم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زبان کی کسوٹی پر تو راسا بالکل ہی نہیں ٹھہرتا اور اس کی صرف تو بالکل بے ٹھکانا ہے۔ دوسرے اور چھپے ہوئے نسخے کسی قدر درست بھی ہیں، لیکن چھوٹے چھوٹے دوہوں میں غیر زبان کے الفاظ، وہ کثرت سے کہ توبہ ہی بھلی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سنسکرت اور پراکرت کی نقل کرکے رکھ دی ہے۔ بعض موقعوں پر اس کی زبان موجودہ سانچوں میں ڈھلی نظر آتی ہے۔ افعال جدید شکل میں بنتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی زبان

قدیمی ادبی رنگ میں پائی جاتی ہے۔ لاحقے و دیگر روابط کلام قدیم طرز کے ہیں۔ ان حالات میں بھاٹوں کی اس لفظی بھول بھلیاں میں اصلیت اور تصنیع کی سراغ رسی نہایت دشوار ہے اور اسی بنا پر یہ کتاب نہ مورخین اور نہ ماہرین ادب کے کام کی رہی ہے۔ (ناگری پرچارنی پترکا۔ جلد نہم صـ۳۲۳ و صـ۳۲۴ رام چند و شیام سندر داس)

بعض اصحاب جو راسا کی اصلیت کے معترف ہیں جب اس کے واقعات تاریخ کی رو سے غلط پاتے ہیں تو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اصلی راسا دراصل بہت مختصر تھا۔ بعد میں لوگوں نے اس میں الحاقی حصے بڑھا کر اس کو موجودہ ضخیم حالت میں پہنچا دیا۔ اگرچہ اس کا امکان تو ہے مگر یہ عذر بھی ناقابل سماعت ہے کیونکہ چند کی اولاد میں جادو ناتھ شاعر سمت ۱۸۰۰ بکرمی کے قریب کی تالیف 'ورتی بلاس' میں اپنے خاندان کے ذکر میں رقم طراز ہے کہ چند نے پرتھی راج کے حالات زندگی میں پرتھی راج راسا میں '۱۰۵۰۰۰' اشعار لکھے ہیں۔ اب یہ بیان ناگری پرچارنی سبھا کے مرتبہ پرتھی راج راسا اور اس کی ضخامت کے ساتھ بالکل منطبق ہے۔ جادو ناتھ کے پاس اپنے مورث اعلیٰ کا نسخہ ضرور موجود ہوگا۔ اسی بنا پر اس نے اس نسخے کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ اس صورت حالات میں راسا کے ابتداءً مختصر بنائے جانے کا قیاس بالکل بے بنیاد ہے" (ناگری پرچارنی پترکا جلد دہم صـ۲۴ سمت ۱۹۸۶ بکرمی)

مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام منیجر چھپی اور سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کی

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔
چندہ سالانہ ایک روپیہ فی پرچہ ایک آنہ

اُردو

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو روپے سکۂ عثمانیہ)

رسالہ سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔)

اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے دُنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ صرف پانچ روپے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ)
خط و کتابت کا پتا: معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی